یثرب کا اِبلیس

اسلم راہی
ایم۔اے

یثرب کا ابلیس ——— ۷
بدنور کی رانی ——— ۷۷
صحرا کا گیت ——— ۲۲۵
خانہ بدوش ——— ۳۲۳

نبوغسان کا بادشاہ ابوجبیلہ اپنے صحرائی محل میں بیٹھا تھا کہ اس کے سامنے ایک شخص کو پیش کیا گیا۔ آنے والا خوب دراز قد، گٹھیل جسم اور مضبوط اعضاء کا مالک تھا۔ اس کی آنکھیں گہری نیلی تھیں جن میں فطرت کی پُراسرار قوتیں سمٹی و سکڑی نظر آتی تھیں۔ وہ کھلی آستینوں والی قبا پہنے ہوئے تھا اور لباس سے عرب لگتا تھا۔ جبیلہ اُسے غور سے دیکھ رہا تھا۔ اس کے پیچھے شترمرغ کے پَروں کا چھتر لہرانے والے خدام اور دائیں بائیں کھڑے اس کے محافظ بھی اس اجنبی عرب کو غور سے دیکھنے لگے تھے۔ جب وہ اجنبی نزدیک آیا تو ابوجبیلہ نے نرم اور پُرسکون آواز میں اپنے سامنے ایک نشست کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "بیٹھو اجنبی!"

وہ عرب بیٹھ گیا۔ ابوجبیلہ نے پھر پوچھا۔ "کہو تم کون ہو؟ تمہارا نام کیا ہے؟ اور کس غرض سے ہمارے پاس آئے ہو۔ تمہارے سر پر رکھے خود اور کپڑوں پر جمی گرد اس امر کی غماز ہے کہ تم لگاتار سفر کرتے ہوئے کہیں دُور دراز سے آئے ہو"۔ چند لمحوں تک اس اجنبی کا سر جھکا رہا۔ پھر شاید اس نے کوئی فیصلہ کر لیا تھا۔ لہٰذا اس نے گردن سیدھی کرتے ہوئے کہا۔

"اے بادشاہ! میرا نام رویل ہے۔ میں یثرب سے ہوں اور تم سے وہاں کے ایک شیطان کے خلاف مدد طلب کرنے آیا ہوں"۔ ابوجبیلہ نے کسی قدر مسکرا

کر کہا۔ "وہ شیطان کون ہے اور اس سے تم لوگوں کو کیا اذیت پہنچتی ہے"۔

روبیل کی عقابی آنکھوں میں خشونت اُتر آئی تھی اور اس نے غصیلی آواز میں کہا۔ "یثرب کے اس ابلیس کا نام فطیون ہے۔ وہ وہاں یہودیوں کا رئیس ہے۔ اور عربوں کی کوئی بھی لڑکی جس کی شادی ہو وہ ایک رات اس ابلیس کے پاس گزارے بغیر اپنے شوہر کے پاس نہیں جا سکتی ہے۔ جس عرب لڑکی کی بھی شادی ہوتی ہے تو پہلی شب اسے اپنے شوہر کے ہاں بھیجنے کے بجائے فطیون کی خلوت گاہ میں پہنچایا جاتا ہے۔ ہم اکیلے اس کے خلاف کچھ نہیں کر سکتے۔ اس لیے کہ یہودی قوت و تعداد میں ہم پر غلبہ و فوقیت رکھتے ہیں۔ اگر تم ہماری مدد کرو تو ہم فطیون کی لعنت سے نجات حاصل کر سکتے ہیں"۔

ابو جبیلہ چند ثانیوں تک دائیں طرف بیٹھے اپنے اس سر منڈے راہب کی طرف دیکھتا رہا جس کے ہاتھ میں نارنجی رنگ کے چند پھول تھے جو ٹکٹکی باندھے روبیل کی طرف دیکھے جا رہا تھا۔ آخر اس نے کوئی فیصلہ کیا اور دوبارہ روبیل کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"یثرب میں یہودیوں کے کتنے قبیلے ہیں اور وہ کب سے اس شہر میں آباد ہیں"۔ روبیل نے کہا۔ "وہاں یہودیوں کے کئی قبائل ہیں لیکن ان کے بڑے بڑے اور طاقت ور قبیلے بنو شقمہ، بنو ثعلبہ، بنو زرعہ، بنو قینقاع، بنو یزید، بنو نضیر، بنو قریظہ، بنو بہدل، بنو عوف اور بنو عصص ہیں۔ آج سے سینکڑوں برس پہلے یثرب میں عمالقہ قوم آباد تھی۔ یہ سام کے فرزند لاوذ کی اولاد سے تھے۔ ان دنوں مصر پہ بھی ان ہی کی حکومت تھی۔ ابراہیم علیہ السلام کا فرعون سنان بن اشل اور یوسف علیہ السلام و موسےٰ علیہ السلام کا فرعون قابوس بن مصعب قوم عمالقہ ہی سے تھے۔ پھر جب موسےٰ علیہ السلام نے فرعون کے غرق ہونے کے بعد شام کو فتح کیا تو اپنا ایک لشکر انہوں نے عمالقہ کی سرکوبی کے لیے یثرب کی طرف بھی روانہ کیا۔ موسےٰ علیہ السلام کا حکم تھا کہ عورتوں اور بچوں کے علاوہ سب کو قتل کر دیا جائے۔ یوں اسرائیلی لشکر یثرب پر حملہ آور ہوا اور عمالقہ کے بادشاہ ارقم بن ارقم سمیت سب کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ مگر ارقم کی اولاد میں سے ایک نوجوان کہ حسن و جمال میں وہ لاثانی تھا بچ گیا۔ اسرائیلیوں نے توقف سے کام لیا اور یہ

فیصلہ کیا کہ اس کے متعلق موسےٰ علیہ السلام کا نیا حکم حاصل کیا جائے، لہذا واپس روانہ ہوئے"۔ ——— "اُدھر بنی اسرائیل کو جب خبر ہوئی کہ ان کے لشکر نے عمالقہ پر کامیابی حاصل کی ہے تو وہ فرط و انبساط میں اپنے لشکر کے استقبال کو نکلے۔ اس وقت تک موسیٰ علیہ السلام فوت ہو چکے تھے۔

بنی اسرائیل کو جب علم ہوا کہ ارقم بن ارقم کے بیٹے کو قتل نہیں کیا گیا۔ تو انہوں نے اپنے لشکریوں سے کہا۔ "تم نے اللہ کے نبی کے حکم کی مخالفت کی ہے لہذا تمہیں ہم اپنے درمیان ہرگز نہ رہنے دیں گے"۔ یہ کیفیت دیکھ کر لشکر کے لوگوں نے باہم فیصلہ کیا اور لشکر میں شامل سب یہودی واپس لوٹ کر یثرب میں آباد ہو گئے۔ تب سے ہی وہ یثرب میں غالب ہیں۔ وہ بہت سے قبیلے ہیں جب کہ ہم عربوں کے صرف دو قبیلے اوس و خزرج ہی یثرب میں ہیں جو ان کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ یہودی یثرب اور اس کے نواح میں تجارت، زرگری، لین دین، مہاجنی اور سود کا کاروبار کرتے ہیں۔ افرادی قوت کے علاوہ ان کے پاس دولت بھی وافر ہے لہذا وہ ہم عربوں پر غالب ہیں۔

ابو جبیلہ نے کچھ سوچا پھر کہا۔ "تم میرے پاس ہی امداد کی غرض سے کیوں چلے آئے تمہارے اطراف و اکناف میں اور بہت سی قوتیں بھی ہیں"۔ روبیل جو آئینے کی طرح پرسکون بیٹھا تھا حرکت میں آیا اور ایک ہیجان کے عالم میں اس نے کہا۔ "اس لیے کہ تو اور تیری قوم بھی عرب ہے۔ کیا تجھے خبر نہیں کہ بنو غسان اور بنو اوس و خزرج کا جدِ امجد ایک ہی ہے جس کا نام مزیقیا تھا۔ یمن میں جب سیلاب آیا تو اوس و خزرج وہاں سے نکل کر یثرب میں آباد ہوئے جب کہ غسان یہاں ارضِ شام میں آ کر بس گئے"۔

ابو جبیلہ چند ثانیوں تک اپنی خشخشی داڑھی میں انگلیاں پھیرتا رہا پھر اس نے پوچھا۔ "کیا تم اکیلے میرے پاس آئے ہو"؟

روبیل نے جھٹ کہا۔ "نہیں میرے ساتھ میرے دو ساتھی بھی ہیں۔

ان میں سے ایک میرا چھوٹا بھائی یہودا اور دوسرا میرا ایک قابل اعتماد دوست رباح ہے۔ اس کا تعلق قبیلہ اوس سے ہے جب کہ ہم بنو خزرج کے ایک ذیلی قبیلے بنو نجار سے ہیں۔"

جبیلہ نے اس بار تفتیش کی نگاہ سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔ "تمہارا مذہب کیا ہے؟"

روبیل نے چھاتی تانتے ہوئے کہا۔ "گو میں جانتا ہوں بنو غسان عیسائی ہیں۔ اس کے باوجود میں جھوٹ نہ بولوں گا۔ سنو بادشاہ! میں موسےٰؑ کو مانتا ہوں مگر یہودی نہیں ہوں۔ میں عیسیٰؑ کو بھی مانتا ہوں اور عیسائی بھی نہیں ہوں۔ میں ایک ایسی ہستی پر ایمان رکھتا ہوں جس کا ابھی ظہور ہوگا اور وہ سارے نبیوں اور رسولوں کا سردار اور خاتم ہوگا۔ اس کا نام احمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ہوگا۔

یہودی عالم اکثر اپنی کتابوں کے حوالے سے اس کی آمد سے متعلق پیش گوئیاں کرتے رہتے ہیں اور ساتھ ہی وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ جب ہمارا وہ نبیؐ آئے گا تو ہم پوری دنیا کو زیر کر لیں گے۔ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ ہمارا قبیلہ بنی نجار اس کا ننھیال ہوگا۔ وہ مکہ سے ظاہر ہوگا اور یثرب اس کا دارالہجرت ہوگا۔ یثرب میں اس کے لیے ایک خوب صورت محل بھی تعمیر ہے جس میں وہ قیام کرے گا اور وہاں کے لوگ بڑی بے تابی سے اس کی آمد کے منتظر ہیں۔

جبیلہ نے حیرت زدہ نگاہوں سے روبیل کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ "اس آنے والے نبی کے لیے یہ محل کس نے بنوایا ہے؟"

روبیل نے کہا۔ "آج سے برسوں پہلے یمن کا ایک عرب بادشاہ تبان بن اسعد ابوکرب بلاد مغرب پر حملہ آور ہوا اور جب وہ حدودِ مشرق کی طرف بڑھ رہا تھا تو یثرب سے ہو کر گزرا اور اس شہر پر قبضہ کر کے وہاں اپنے بیٹے کو حاکم مقرر کر کے آگے بڑھ گیا۔ اس کی غیر موجودگی میں اہل یثرب نے اس کے لڑکے کو قتل کر ڈالا۔ ان دنوں میرے قبیلے نجار کا ایک شخص عمرو بن طلہ اہل یثرب کا رئیس تھا اور میں اسی عمرو بن طلہ کی نسل سے

ں۔ تبان اسعد کو جب اپنے بیٹے کے قتل کی خبر ہوئی تو وہ سخت برہم اور سیخ پا ہوا شرق کی طرف آگے بڑھتے ہوئے وہ فوراً پلٹا اور یثرب کی طرف حملہ آور ہونے کے ادہ سے بڑھا۔ تمام قبائل نے یک جا ہو کر اس کا مقابلہ کیا۔ جنگ کے دوران یہود ی قریظہ کے دو معمر اور متبحر یہودی عالم اس کے پاس آئے اور کہا۔

"تو اپنے اس فعلِ بد سے باز آ تو اپنے ارادوں کو پورا کرنے پر قادر نہیں سکتا۔ اور نہ ہی یثرب کسی صورت خراب اور ویران ہو سکتا ہے کیوں کہ یہ نبی آخر الزماںؐ کا جو قریش مکہ میں پیدا ہوگا دارالہجرت ہے اور یہیں وہ آ کر قیام پذیر ہوگا۔"

روبیل نے ذرا رُک کر کہا۔ "تبان اسعد ان دونوں یہودی عالموں کی گفتگو سے اس قدر متاثر ہوا کہ اس نے فوراً لڑائی بند کرا دی۔ وہ اس نبیؐ پر ایمان لے آیا اور اس نے آنے والے اس نبیؐ کے لیے یثرب میں ایک عالی شان محل تعمیر کرایا اور کتابی صورت میں اس نبیؐ کے نام ایک پیغام بھی لکھا۔ یہ محل اور کتاب اس نے ایک یہودی کے حوالے کیے اور اسے ان کا متولی بنایا اور کہا کہ یہ محل اور کتاب پشت در پشت ے حوالے کرتے رہیں یہاں تک کہ میرے نبیؐ اس میں آ کر قیام کریں۔ اب تک اسی دی کی اولاد اس محل اور کتاب کی متولی ہے اور وہ اس نبیؐ کا انتظار کر رہے ہیں۔

اس محل کے اندر چاندی کا ایک صندوق ہے جس کے اندر وہ کتاب رکھی ہے۔ اس کتاب میں آنے والے نبیؐ کے نام کیا لکھا ہے کسی کو علم نہیں۔ تاہم یثرب لوگ اس کتاب کو متبرک جانتے ہیں اور اسکے احترام و تقدس کے سامنے دعائیں تے ہیں کیونکہ یہ کتاب مکہ سے آنے والے اس نبیؐ کے حوالے کی جائے گی جو اس محل قیام کرے گا۔ یاد رہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جب مکہ سے یثرب ہجرت ے آئے تو اسی محل کے سامنے ان کی ناقہ بیٹھ گئی۔ اسی محل میں انہوں نے پہلے حصے میں پھر اوپر کے حصے میں قیام کیا۔ اس وقت یہ محل حضرت ایوب انصاریؓ صرف میں تھا جو اسی یہودی کی نسل سے تھے جسے تبان اسعد نے اس محل کا لی مقرر کیا تھا۔

ابوجبیلہ نے چند ثانیوں تک سوچتے ہوئے پوچھا۔ "اوس وخرزج میں تمہاری حیثیت کیا ہے"۔

روبیل نے بلا تامل کہا۔ "میں صرف اوس وخرزج کے ایک حصّے کا سردار ہوں"۔

ابوجبیلہ نے جھلا کر پوچھا۔ "پورے اوس وخرزج کا سردار کون ہے"

"ان دِنوں اوس وخرزج کا سردار مالک بن عجلان ہے"۔

ابوجبیلہ نے سخت آواز میں کہا۔ "تو پھر اوس وخرزج کا سردار مالک بن عجلان میرے پاس امداد طلب کرنے کیوں نہیں آیا اور اس نے تمہیں میری طرف کیوں روانہ کر دیا"

روبیل نے التجا بھری نظروں سے ابوجبیلہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "میرے سردار مالک بن عجلان نے نہیں بھیجا، میں خود سے آیا ہوں۔ یثرب میں کسی کو یہاں تک خبر نہیں کہ میں تمہاری طرف آیا ہوں۔ میں تو یثرب سے اپنے ساتھیوں کے ساتھ اس بہانے سے نِکلا تھا کہ میں طواف کعبہ کی خاطر مکّہ جا رہا ہوں۔ تب سے تبان اسعد نے یثرب میں آنے والے نبیؐ کے لیے محل بنوایا ہے۔ یثرب میں مکّہ کی عزّت و وقعت بھی زیادہ ہو گئی ہے کیونکہ تبان اسعد کو جن یہودی علماء نے یثرب پر حملہ کرنے سے منع کیا تھا وہ انہیں اپنے ساتھ لے گیا۔ مکّہ کے پاس سے گزرتے ہوئے ان علماء نے تبان اسعد کو کعبہ کا طواف کرنے کو کہا۔ تبان اسعد تو خود یہ چاہتا تھا کیونکہ وہ آنے والے نبیؐ پر ایمان لا چکا تھا۔ وہ خود ہی طواف کرنے کا ارادہ رکھتا تھا۔ سو اس نے کعبہ کا طواف کیا اور اس پر غلاف بھی چڑھایا۔

عربوں میں وہ پہلا بادشاہ تھا جس نے کعبہ پر غلاف چڑھایا۔ سو میں طواف کعبہ کے بہانے اس طرف آیا ہوں مجھے کسی نے نہیں بھیجا بلکہ عرب قوم سے محبت اور ایک بڑے کام کے خلاف نفرت مجھے تمہاری طرف لائی ہے۔"

ابوجبیلہ نے کہا۔ "اگر تم اوس وخرزج کو پکارو تو کتنے مسلح جوان لبیک کہہ کر تمہارے ساتھ کھڑے ہو سکتے ہیں؟"

روبیل نے گردن جھکاتے ہوئے کہا۔ "میں اوس وخرزج کو کیونکر ایسے انداز میں پکار سکتا ہوں۔ میں تو بنی نجار پر قدرت رکھتا ہوں اور وہی میری پکار پر لبیک کہہ سکتے ہیں۔ اوس وخرزج کو ایسے انداز میں پکارنے کا حق ہمارے سردار مالک بن عجلان ہی کو ہے"۔

ابوجبیلہ نے فیصلہ کن انداز میں کہا "تو پھر واپس لوٹ جاؤ۔ تمہارے کہنے پر میں اوس وخرزج کی کوئی مدد نہ کر سکوں گا۔ میرے پاس ایسا آدمی مدد کی درخواست لے کر آئے جس کے پیچھے اوس وخرزج جان کی بازی لگا دیں اور جنگ میں مجھے بھروسہ ہو کہ وہ یہودیوں کے خلاف میرے پہلو سے پہلو ملا کر جنگ کریں گے۔ اگر وہ شخص مالک بن عجلان ہے تو ایسی درخواست لے کر وہ خود آئے۔ اب تم جا سکتے ہو۔ اس موضوع پر میں تمہارے ساتھ اور زیادہ گفتگو پسند نہ کروں۔"

روبیل کے چہرے سے زندگی کی ساری تازگی اور رسیلا پن جاتا رہا۔ وہ اُٹھ کھڑا ہو گیا اور افسوس بھرے انداز میں ابوجبیلہ کی طرف دیکھتے ہوئے اس نے اذیّت زدہ آواز میں کہا۔ "تم نے اپنے اس فیصلے سے مجھے مایوس کر دیا ہے۔ اب میں خود عربوں کے مقدّر کا نگہبان بن کر اُٹھوں گا۔ میں یثرب میں یہودیوں کو گِدھوں اور چیلوں کی طرح عربوں کا گوشت نہ نوچنے دوں گا۔ اے جبیلہ! میں اب خود ایک آب دار خنجر بن کر یہودیوں کے تاریک سینے اور گنہگار ضمیر میں پیوست ہوں گا۔ آنے والے صحرائی رسولؐ کی قسم! میں بے دین و فاسق قطیون کی شہوات ولذات کو اور زیادہ پھیلنے نہ دوں گا۔" ایک ہیجان کے عالم میں روبیل ابوجبیلہ کے محل سے باہر نکل گیا تھا۔

محل سے باہر روبیل کا چھوٹا بھائی یہودا اور ان کا دوست رباح تین گھوڑوں کی نکیلیں پکڑ کر کھڑے تھے۔ جب روبیل ان کے پاس آیا تو یہودا نے پوچھا۔

"اے میرے بھائی! تمہارا چہرہ اترا ہوا ہے کیا ابوجبیلہ نے تمہاری التماس کو نظر
کر دیا ہے"۔

روبیل نے کوئی جواب نہ دیا اور خفگی میں آگے بڑھ کر اپنے اونٹ کی
پکڑ لی اس بار رباح نے کہا۔ "تم چپ اور خاموش کیوں ہو؟ ہمارے اطمینا
خاطر ہی کچھ کہو۔ جبیلہ نے تم سے کیا کہا"۔

روبیل نے درد میں ڈوبی آواز میں کہا۔ جبیلہ ایک بے غرض و بے نو
انسان ہے۔ اس نے ہماری مدد کرنے سے انکار کر دیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ
درخواست اوس و خزرج کا سردار مالک بن عجلان آکر مجھ سے کرے تاکہ
بھروسہ ہو کہ یہودیوں کے ساتھ جنگ کے دوران اوس و خزرج اس کا سا
دیں گے۔ مجھے قطعاً کوئی امید نہیں کہ مالک بن عجلان ایسی درخواست لے کر
کے پاس آئے گا کیونکہ وہ اپنے حال میں مست اور پُرسکون ہے اسے اس کا
نہیں کہ فطیون کے ہاتھوں پر عرب کیسے عذاب اور قہر میں مبتلا ہیں۔ ہمیں
اپنی ہی علو ہمتی اور محنت کشی کے بھروسے فطیون اور اس کی قوت کے لیے نا
بننا ہوگا۔ اب یہاں رُکنے سے کچھ حاصل نہیں آؤ یہاں سے کوچ کر جائیں۔ ہ
زیادہ عرصہ تک یثرب سے باہر رہنا کئی وسوسے اور شبہات کھڑے کر دے
تینوں اپنے اونٹوں پر سوار ہوئے اور وہاں سے کوچ کر گئے تھے۔

غسان کے ہاں سے نکل کر وہ تینوں صحرا اور نخلستانوں کے اندر
اپنے اونٹوں کو تیزی سے ہانکتے ہوئے جب وادی القریٰ میں داخل ہو رہے
تو اُن کے سامنے سے ایک شتر سوار آیا اور دُور ہی سے انہیں آوازیں دے
رُکنے کو کہا۔ جب وہ نزدیک آیا تو وہ اسے پہچان گئے وہ رباح کا چھوٹا
خنوخ تھا۔ روبیل نے پریشان اور متفکر آواز میں اسے مخاطب کرتے ہوئے
"خنوخ! خنوخ! تم اس طرف کیوں آئے ہو؟ ہمارے بعد یثرب
خیریت تو گزری؟" خنوخ نے اپنے اونٹ کو قریب لاتے ہوئے کہا۔

"تم تینوں کی روانگی کے بعد کسی نے فطیون کو یہ شک ڈال دیا تھا کہ تم لوگ
کعبہ کا طواف کرنے کے بجائے کسی اور سمت اس کے خلاف سازش کرنے گئے ہو۔
اسے یہ بھی شک ڈالا گیا تھا کہ تم غسان کے بادشاہ ابوجبیلہ کی طرف گئے ہو۔ اس نے
اپنے چھ بہترین تیغ زن بھی تمہارے تعاقب میں روانہ کیے تھے اور انہیں نصیحت کی
تھی کہ اگر تم تینوں جبیلہ کی طرف گئے ہو تو تینوں کے سر کاٹ کر فطیون کے پاس لے
جائے جائیں۔ کیا تمہارا فطیون کے ان تیغ زنوں سے کہیں سامنا نہیں ہوا؟"

یہ خبر سُن کر یہودا اور رباح بجھے ہوئے شعلے کی مانند غمگین ہو گئے۔ ان
کے ہونٹ پتھرا گئے اور وہ کوئی بات نہ کر سکے تھے۔ روبیل نے زہر آلود لہجے میں کہا۔
"اگر فطیون کے وہ چھ تیغ زن ہمارا سامنا کرتے تو قسم ہے مجھے اپنے ظہور میں آنے
والے صحرائی نبی کی ہیں دشتِ شام کے اندر انہیں دامن دریدہ اور خون آلودہ کر دیتا۔ آؤ
یہاں سے فی الفور کوچ کریں۔ اپنی رفتار تیز کر دیں اور یہاں سے سیدھا یثرب جانے کے
بجائے مکہ کا رُخ کریں۔ وہاں کعبہ کا طواف کر کے ہم یثرب میں داخل ہوں گے تاکہ
جھوٹ کہنے کی نوبت نہ آئے اور اگر فطیون ہم سے پوچھے تو ہم بلا تامل کہہ سکیں کہ ہم
طوافِ کعبہ سے آئے ہیں"۔

چاروں رُکے بغیر وادی القریٰ سے نکل کر اس شاہراہ پر اپنے اونٹوں کو سرپٹ
دوڑانے لگے تھے جو دومۃ الجندل سے آتی ہوئی قبائل غسان اور وادی القریٰ سے گزر کر
فدک، خیبر اور پھر جبل احد کے بیچوں بیچ ہوتی ہوئی یثرب کی طرف چلی گئی تھی۔

دوپہر کے وقت جب کہ دھوپ میں نیلا اور ننگا آسمان پگھل رہا تھا وہ
چاروں گرم صحرا کے اندر جلتے ویران موسم میں جب وادی القریٰ اور فدک کے درمیان
آئے تو ان کے سامنے شاہراہ پر فطیون کے چھ مسلح تیغ زن نمودار ہوئے وہ اونٹوں پر
سوار تھے اور قریب آکر وہ ان چاروں کا راستہ روک کر کھڑے ہو گئے۔ پھر ان کے
سرخیل نے روبیل کو مخاطب کر کے کہا۔

"فطیون کے اندازے اور اندیشے درست ہی ثابت ہوئے۔ تو تم

شاہِ غسان ابوجبیلہ کے پاس سے ہو کر آرہے ہو۔ پھر روبیل کے جواب کا انتظار کیے بغیر اس نے رباح کے چھوٹے بھائی حنوخ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "تم ان کے ساتھ کیسے آملے۔ تمہیں تو ہم یثرب چھوڑ کر آئے تھے۔ لگتا ہے تم انہیں ہمارے تعاقب سے مطلع کرنے نکلے تھے۔ اچھا ہوا ان کے ساتھ ساتھ ہم تمہارا سر بھی کاٹتے چلے جائیں گے۔"

روبیل جو ابھی تک ان سب کو چیلنج دیتی ہوئی نظروں سے دیکھ رہا تھا اپنے پورے غضب اور بھرپور قساوت میں ان کے سرخیل کو مخاطب کر کے بولا۔

"میں اس گروہ کا سرکردہ ہوں مجھ سے بات کرو اگر میرے کسی ساتھی کے ساتھ تم نے بے ہودہ گفتگو اور بدکلامی کی تو سُن رکھو! تمہاری زبان کاٹ کر میں تمہاری ہتھیلی پر رکھ دوں گا۔ میں جانتا ہوں تم سب کس قدر بہادر اور شجاع ہو۔ آگے بڑھو! میں تم سب کو اکیلا ایک ساتھ مقابلے کی دعوت دیتا ہوں۔ اگر اس تپتے صحرا کے اندر میں تمہارے سارے کس بل نکال کر تمہاری تخریب کی خواہش کو مانجھ اور دھو نہ ڈالوں تو مجھے بنو نجار کا سردار نہیں کم ظرف و بددہن کہنا۔ آگے بڑھو! آگے بڑھو کہ میں تمہارے سروں سے زندگی کا بوجھ اُتار کر تمہیں موت کی خوشخبری اور حشر کی بشارت دوں اس کے ساتھ ہی روبیل نے اپنی ڈھال سنبھال کر تلوار کھینچ لی تھی اور اپنے سر پر لوہے کا خود خوب جما لیا تھا۔ اس کے ساتھیوں نے بھی اپنی تلواریں اور ڈھالیں سنبھال لی تھیں۔"

روبیل نے اپنے شتر کو مہمیز لگا کر آگے بڑھایا اور اپنی تلوار سونت کر دشمن پر حملہ آور ہوا۔ اس کے تینوں ساتھی بھی اس کے ساتھ ہی یہودیوں پر حملہ آور ہو گئے تھے۔ تپتے صحرا میں تلواروں اور ڈھالوں کے ٹکراؤ سے فضاؤں کا سکون درہم برہم ہو گیا تھا۔ یہودی شروع میں بڑھ چڑھ کر حملہ آور ہونے لگے تھے لیکن جلد ہی روبیل اپنی کاری اور خوفناک ضربوں سے اور یہودا، رباح اور حنوخ اپنے حملوں کی تیزی اور سرعت سے یہودیوں کے حواس پر حاوی اور بھاری ہونے لگے تھے۔

یہودی زیادہ دیر تک ان چاروں کے سامنے جم کر نہ لڑ سکے تھے کیونکہ لڑائی

میں روبیل نے ان کے خلاف اپنی تلوار اور ڈھال سے طوفان کھڑا کر دیا تھا۔ اس کا اونٹ بار بار پینترے بدل کر اسے یہودیوں پر مناسب رُخ سے بہترین حملے کرنے کے مواقع فراہم کر رہا تھا۔ تھوڑی ہی دیر کی کشمکش کے بعد تین یہودی روبیل کی تلوار کا شکار ہو گئے۔ ایک کو اس کے بھائی یہودا نے قتل کر دیا اور باقی دو کو رباح اور حنوخ دونوں بھائیوں نے مل کر ٹھکانے لگا دیا تھا۔

ایک زہریلی جست کے ساتھ روبیل اپنے اونٹ سے صحرا کی ریت پر کودا اور اپنی خون آلود تلوار کو گرم گرم ریت پر رگڑ کر صاف کرنے لگا تھا۔ اس کے تینوں ساتھی بھی اپنے اونٹوں سے اُتر کر اپنے ہتھیار صاف کرنے لگے تھے۔ اپنی تلوار دوبارہ نیام میں ڈالتے ہوئے روبیل نے اپنے ساتھیوں سے کہا۔

"میرے باجبروت ساتھیو! آؤ انہیں ریت میں دفن کر دیں تاکہ کسی کو ان کے قتل کا علم نہ ہو اور ان کے اونٹوں کو لے کر یہاں سے کوچ کر جائیں۔" اس کے تینوں ساتھی اس کے ساتھ فوراً حرکت میں آئے۔ یہودیوں کی لاشوں کو انہوں نے ریت میں دفن کر دیا پھر ان کے اونٹوں کی نکیلیں اپنے کجاووں سے باندھ کر وہ وہاں سے کوچ کر رہے تھے۔

فدک میں آکر انہوں نے یہودیوں کے اونٹوں کو بیچ کر رقم آپس میں تقسیم کر لی اور دوبارہ وہ کہیں رُکے اور قیام کیے بغیر وہ آگے بڑھتے رہے حتیٰ کہ وہ خیبر سے باہر ایک ایسے چوراہے پر آکھڑے ہوئے جہاں سے ایک راستہ شمال مغرب کی طرف نکل کر مدائن صالح سے ہوتا ہوا تبوک کی طرف نکل گیا تھا۔ دوسرا راستہ بائیں ہاتھ نجد کی طرف سے ہوتا ہوا ذہبل، وہاں سے طائف اور پھر مکہ کی طرف چلا گیا تھا اور دومۃ الجندل اور وادی القریٰ کی طرف سے آنے والی جس شاہراہ پر وہ سفر کر رہے تھے وہ اب سیدھی یثرب کی طرف چلی گئی تھی۔

روبیل نے حنوخ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "حنوخ! حنوخ! تم یہاں سے سیدھے یثرب چلے جاؤ۔ کسی سے یہودیوں کے ساتھ ہمارے ٹکراؤ کا ذکر نہ کرنا۔ ہم یہاں تم سے علیحدہ ہوتے ہیں۔ ہم کعبہ کو طواف کر کے یثرب میں داخل ہوں گے۔"

حنوخ اپنے اُونٹ کو مہمیز لگا کر سیدھا آگے بڑھ گیا۔ روبیل، یہودا اور رباح بائیں طرف مڑ گئے۔ طوفانی انداز میں سفر کرتے ہوئے وہ نجد، ہذیل اور طائف سے ہوتے ہوئے مکہ میں داخل ہوئے وہاں انھوں نے طواف کیا اور دوبارہ یثرب کی طرف کوچ کر گئے تھے۔

یثرب میں داخل ہونے کے بعد شہر کے جنوب مشرقی حصے میں بنی قینقاع کے محلے سے گزرتے ہوئے وہ تینوں بنو نجار کے محلے کی طرف جا رہے تھے کہ ایک سوار اپنا گھوڑا دوڑاتا ہُوا ان کے قریب آیا اور روبیل کو مخاطب کر کے اس نے کہا۔

"اے بنی نجار کے سردار! تمہیں اور تمہارے ساتھیوں کو فطیون نے طلب کیا ہے۔" روبیل اپنے ساتھیوں کے ہمراہ چپ چاپ اس سوار کے ساتھ ہو لیا۔ بنی قینقاع اور بنی نضیر کے قلعوں کے درمیانی حصے میں جو ایک کھُلی اور وسیع جگہ تھی وہاں ایک شہ نشین پر یثرب کا ابلیس فطیون بیٹھا تھا۔ اس کے اِردگِرد اس کے کئی مسلح محافظ تھے۔ عمر کے لحاظ سے وہ چالیس برس کے قریب ہوگا۔ خوب دراز قد اور بھاری تھا۔ چہرے پر خشخشی داڑھی تھی اور سر کے بال خوب لمبے ہو کر گردن سے نیچے تک چلے گئے تھے۔

روبیل، یہودا اور رباح فطیون کے قریب آ کر اپنے اونٹوں سے نیچے اُترے پھر وہ تینوں آگے بڑھے اور فطیون کے قریب ہو کر روبیل نے پوچھا۔ "کیا مجھے طلب کیا گیا ہے؟" فطیون غور سے روبیل کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اِتنے میں بنی قریظہ کے قلعہ کی طرف سے اس کا چھوٹا بھائی لابان اور چچا زاد تقیم دونوں ہاتھوں میں ہاتھ ڈال کر آئے اور فطیون کے قریب آ کر کھڑے ہو گئے۔ فطیون نے روبیل کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"بنو نجار کا سردار یثرب سے باہر اتنے روز کہاں رہا۔ میں نے مالک بن عجلان سے تمہارا پوچھا تو اس نے کہا تم طواف کعبہ کو اپنے چھوٹے بھائی یہودا اور رباح کے ساتھ گئے ہو لیکن کچھ لوگوں نے مجھے شکوک اور وسوسے میں ڈالا کہ تم مکہ کے بہانے بنو غسان کی طرف میرے خلاف کسی مہم کے سلسلے میں گئے ہو۔"

روبیل نے اپنی پوری بشاشت اور شائستگی کو کام میں لاتے ہوئے کہا۔ "روبیل بن حماد جو کہتا ہے وہی کرتا ہے۔ میں اپنے ساتھیوں کے ساتھ ابھی ابھی طواف کعبہ سے لوٹ کر شہر میں داخل ہوا ہوں۔ اگر تمہیں شک ہو کہ میں بنی نجار کا سردار جھوٹ کہتا ہے تو اپنے چند آدمیوں کو میرے ساتھ مکہ روانہ کرو۔ کعبہ کا متولی گواہی دے گا کہ میں طواف کر کے لوٹا ہوں کیوں کہ میں متولی سے مِلا ہوں اور اس کے پاس بیٹھ کر باتیں کرتا رہا ہوں۔ وہ کون لوگ ہیں جو میرے خلاف تمہیں اُکساتے ہیں کیا وہ ایسا کر کے یثرب کے ماحول کو مکدر اور یہاں کی فضاؤں کو متعفن نہیں بنا رہے کیا وہ ہمارے درمیان بے تعلقی اور فتنہ و فساد کی بساط بچھانا چاہتے ہیں۔ اگر ایسا ہے تو جان لو! یثرب نہ رہے گا۔ ایسے لوگوں کے غلط الزامات اور بہتان تراشیوں کے سبب یہی شہر دو دھڑوں میں بٹ کر جنگ کا میدان بن جائے گا پھر اس روز نہ کسی کی امارت رہے گی نہ کسی کا جان و مال محفوظ و مامون رہ سکے گا۔ کیا اب بھی تم اعتبار نہیں کرتے کہ میں طواف کعبہ سے لوٹا ہوں؟"

فطیون کے چہرے پر پھیلی ہوئی بداعتمادی کی جھلک جاتی رہی تھی اور اس نے خوش ہوتے ہوئے نرم آواز میں کہا۔

"حماد کے بیٹے! جن چھ آدمیوں نے مجھ سے تمہاری شکایت کی تھی میں نے انہیں ہی تمہاری تلاش میں بنو غسان کی طرف روانہ کیا ہے۔ اگر وہ سچے ہوتے تو راستے میں ان سے تمہاری ملاقات ضرور ہوئی ہوتی اور وہ تمہیں پکڑ کر میرے پاس لاتے۔ چونکہ ایسا نہیں ہُوا لہٰذا وہ جھوٹے اور سزا کے حق دار ہیں وہ جب لوٹیں تو میں تمہارے سامنے اگر ان کی گردنیں نہ کٹواؤں تو فطیون نہیں۔ اب تم جاؤ۔ مجھے بنی نجار کے سردار پر پورا بھروسہ ہے کہ وہ میرے اعتماد کو ٹھیس اور میری شخصیت کو نقصان نہیں دے گا۔"

روبیل، یہودا اور رباح مڑ کر اپنے اونٹوں پر سوار ہوئے اور وہاں سے چلے گئے۔

جب وہ بنی نجار کے محلے میں آئے تو روبیل نے یہودا اور رباح سے کہا۔

"تم دونوں گھر جاؤ۔ میں مالک بن عجلان سے مِل کر آتا ہوں۔" یہودا اور رباح بائیں

طرف مڑ کر آگے بڑھ گئے۔ روبیل اپنے اُونٹ کو ایڑ لگا کر دائیں ہاتھ موڑ چکا تھا۔ وہ سیدھا اس طرف آیا جہاں یمن کے عرب بادشاہ تبان اسعد نے نبی اکرمؐ کے لیے محل بنا رکھا تھا۔ اس محل کے عین سامنے اس نے اپنے اُونٹ کو روکا۔ نیچے کُود کر اس نے مُہار کی رسّی اُونٹ کے گھٹنے پر مارتے ہوئے اسے بٹھا دیا اور خود وہ محل میں داخل ہُوا۔ سامنے ہی محل کا بوڑھا متولی حوارین کھڑا تھا۔ روبیل کو دیکھتے ہی اس کے چہرے پر بشاشت پھیل گئی اور اس نے ایک پدرانہ شفقت میں اپنے دونوں بازو پھیلا دیئے تھے۔

روبیل آگے بڑھا اور بوڑھے حوارین سے گلے مِل گیا۔ حوارین نے اس سے سرگوشی کرتے ہوئے پوچھا۔ "ابوجبیلہ نے تم سے کیا کہا؟" روبیل نے بھی مدھم آواز میں کہا۔ "اس نے میرا کہا نہیں مانا۔ وہ کہتا ہے کہ مدد کی درخواست اوس و خزرج کا سردار مالک بن عجلان خود لے کر آئے تاکہ اسے بھروسہ ہو کہ جنگ میں قطیون کے خلاف اوس و خزرج اس کا ساتھ دیں گے"۔

حوارین علیٰحدہ ہُوا اور روبیل کا بازو پکڑ کر محل کے ایک کمرے کی طرف لے جاتے ہوئے اُس نے افسردگی اور مایوسی سے کہا۔ "آہ! ہمیں ناکامی ہوئی لیکن ایک وقت ضرور آئے گا کہ ہم آنے والے نبیؐ کو ماننے والے ضرور کامیاب ہوں گے۔ گو ظاہری طور پر میں یہودی ہوں پر باطن سے میں یہودی نہیں رہا کہ اب ہمارا مذہب وہی ہے جس کی تلقین ہمارا صحرائی رسولؐ کرے گا۔ اللہ کرے وہ ہماری زندگی میں ہی مکّہ سے ظاہر ہو اور ہم اس پر ایمان لا کر اس کی خدمت کر سکیں"۔

روبیل نے اعتراض کرتے ہوئے کہا۔ "اس پر ایمان تو ہم اب بھی لا چکے ہیں"۔

حوارین نے معذرت طلب لہجے میں کہا۔ "ہاں! میں نے غلط کہا۔ تمہارا کہنا درست ہے۔ ہم اس پر ایمان لا چکے ہیں"۔

دونوں ایک کمرے میں داخل ہوئے جس کے اندر چاندی کا ایک صندوق رکھا تھا۔ یہ وہی صندوق تھا جس کے اندر وہ کتاب محفوظ تھی جس میں تبان اسعد نے نبی اکرمؐ کے نام کوئی پیغام اور تحریر لکھ رکھی تھی۔ اس تحریر کو کسی نے کھول کر پڑھا

نہ تھا بلکہ یہ نسل در نسل ایک دوسرے کے حوالے ہوتی جا رہی تھی۔ روبیل اس صندوق کے پاس آ کر بیٹھ گیا۔

صندوق کے سامنے والے حصّے پر یمن کے بادشاہ کے عربی اشعار کندہ تھے، جن کا ترجمہ یوں بنتا ہے:۔

"میں گواہی دیتا ہوں، بے شک احمدؐ اللہ کے رسولِ برحق ہیں۔ اگر میری عمر نے وفا کی اور ان کی آمد تک زندہ رہا تو میں ضرور ان کا معین و مددگار بنوں گا"۔

روبیل تھوڑی دیر تک ایک عجیب سے پاکیزہ جذبے کے تحت چاندی کے اس صندوق پر ہاتھ پھیرتا رہا۔ پھر اس نے حوارین کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"کیا تم میرے لیے اس صندوق کو نہ کھولو گے کہ میں اس کے اندر رکھی کتاب پر ہاتھ رکھ کر دعا مانگ سکوں"۔

حوارین نے اپنی جیب سے چابی نکالی اور آگے بڑھ کر اس نے صندوق کھول دیا۔ روبیل نے صندوق کے اندر رکھی چمڑے کے چند اوراق پر مشتمل اس کتاب کو چوما۔ دوبارہ اس نے چرمی کتاب کو چاندی کے اس صندوق میں رکھ دیا پھر کھلے صندوق کے سامنے بیٹھ کر وہ ایک وجد اور ایک انوکھے التہابی و آتشی انداز میں دُعا مانگ رہا تھا۔

"اے زمین و آسمان کے پیدا کرنے والے! یثرب تیرے آنے والے نبیؐ کا دارالہجرت ہے۔ اس پر گناہوں کی راتیں اپنی پوری تاریکیوں کے ساتھ نزول کر رہی ہیں۔ یہاں کی فضا جس کے مقدر میں کبھی مقدس ہونا لکھا ہے اس کے اندر بے کراں عصیانوں اور بے شمار خطاؤں کا سرسام و طوفان برپا ہے"۔

روبیل کے ہاتھ آسمان کی طرف اُٹھے تھے اس کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے اور وہ دُعا مانگ رہا تھا۔

"اے خدا! قطیون ایک خون آشام بھیڑیے کی صورت میں

یثرب پر حاوی ہے۔ اس کے پاس قوت و دولت ہے۔ میں اس کے خلاف انفرادی جنگ تو کر سکتا ہوں پر اس کی گندی فطرت نہیں بدل سکتا۔ تو اپنے آنے والے نبیؐ کے طفیل یثرب کو گناہوں سے بچا اور ہم جو اس پر ایمان لا چکے ہیں ان کی عزتوں اور عصمتوں کو محفوظ رکھو"۔

دُعا ختم کر کے روبیل اپنی عبا کی کھلی آستینوں سے اپنے آنسو پونچھتا ہوا کھڑا ہو گیا۔ اس نے جب مُڑ کر دیکھا تو اس کے پیچھے حوارین کھڑا تھا، اس حالت میں کہ اس کے ہاتھ چھاتی پر بندھے تھے، آنکھیں بند تھیں اور اس کے آنسو بہہ رہے تھے۔

روبیل نے دِل فگار سی آواز میں کہا "میرے محترم! صندوق بند کر دو۔ مَیں اب مالک بن عجلان کے پاس جاتا ہوں"۔ حوارین سنبھل گیا۔ اس نے اپنی آنکھیں خشک کر لیں اور نیچے بیٹھ کر وہ صندوق بند کرنے لگا تھا۔ روبیل تیز تیز قدم اُٹھاتا ہوا تبان کے محل سے باہر نکل گیا تھا۔

ایک خوبصورت اور خوشنما مکان کے سامنے روبیل نے اپنے اونٹ کو پھر روک لیا۔ وہ نیچے اُترا اور آگے بڑھ کر مکان کے دروازے پر دستک دی۔ تھوڑی دیر بعد ایک خوب صورت، نوجوان اور دل کش لڑکی نے دروازہ کھولا۔ روبیل نے اُسے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "قنطورا! قنطورا! کیا تمہارا بھائی اندر ہے"۔

لڑکی جس کا نام قنطورا لے کر پکارا گیا تھا ذرا ہی مسکرائی پھر دلنشین لہجے میں اس نے کہا "اخی تو اندر ہی ہے پر تم تو کعبہ کے طواف کو گئے تھے کب لوٹے ہو"؟

——— "مَیں آج ہی آیا ہوں، اپنے بھائی کو ذرا بلاؤ مجھے اس سے کچھ کہنا ہے"۔

قنطورا نے دروازہ پورا کھولتے ہوئے کہا۔ "اندر آ جاؤ، مَیں اسے بُلاتی ہوں"۔

روبیل اس کے ساتھ مکان میں داخل ہوا۔ قنطورا نے اسے دیوان خانے میں بٹھایا اور خود اپنے بھائی کو بُلانے چلی گئی تھی۔ تھوڑی ہی دیر بعد قنطورا واپس آئی اس کے ساتھ اس کا بھائی اوس وخزرج کا سردار مالک بن عجلان بھی تھا۔ روبیل نے اُٹھ کر اس سے مصافحہ کیا۔ مالک نے مُسکراتے ہوئے پوچھا "تم مکّہ سے کب لوٹے ہو"؟ دوبارہ اپنی نشست پر بیٹھتے ہوئے روبیل نے کہا۔

"مَیں ابھی ابھی مکّہ سے لوٹا ہوں۔ ابھی اپنے گھر بھی نہیں گیا۔ ایک ضروری کام سے سیدھا تمہاری طرف آیا ہوں"۔ مالک اور قنطورا دونوں اس کے سامنے بیٹھ گئے۔ مالک نے کسی قدر تجسّس اور جستجو سے پُوچھا "تمہیں ایسا کیا کام آن پڑا جو تم گھر جانے کی بجائے سیدھے میرے پاس چلے آئے ہو"۔

روبیل نے بالغانہ و مدبرانہ لہجے میں کہا "کیا ایسا ممکن نہیں کہ تم غسان کے بادشاہ ابوجبیلہ کے پاس مدد کی درخواست لے کر جاؤ کہ وہ اپنی قوت استعمال کر کے ہمیں فطیون کی لعنت سے نجات دلائے"۔ مالک نے چونکتا ہوتے ہوئے کہا "ایسا کوئی خیال بھی اپنے دِل میں نہ لانا۔ اگر فطیون کو علم ہو گیا کہ ہم اس کے متعلق ایسے خیالات رکھتے ہیں تو وہ یثرب میں عربوں کا جینا محال ہی نہیں ناممکن کر دے گا۔ مَیں جانتا ہوں، تم جذباتی اور شجاع ہو اس کے باوجود مَیں تمہیں تاکید کروں گا کہ خاموشی سے جس طرح وقت گزر رہا ہے گزارتے رہو۔ ہم فطیون کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ اس کے خلاف کسی بھی سازش کی ابتدا ہماری اپنی زندگیوں کی انتہا ہو گی۔ وہ ہر چیز برداشت کر لے گا لیکن اپنی ذات اور اپنے افعال کے خلاف کوئی بغاوت اور کوئی بھی سرکشی اسے جھونکے سے طوفان اور چنگاری سے شعلہ بنانے میں کافی ہو گی۔ بس میرا یہی مشورہ ہے کہ اپنے ہونٹ سی لو"۔

روبیل نے کہا "مَیں ابوجلیلہ کے پاس سے ہو کر آیا ہوں۔ اس نے کہا تھا اگر اوس وخزرج کا سردار یہ درخواست لے کر آئے تو مَیں ضرور مدد کروں گا"۔

مالک بن عجلان نے دُکھ سے کہا "تم نے بُرا کیا"۔

روبیل نے تلخ لہجے میں کہا "میرے ساتھ مالک بن عجلان بن کر اوس وخزرج کا سردار بن کر بات کرو اور مَیں عربوں کے سردار سے پوچھتا ہوں فطیون کی صورت میں یہ تباہی کب سمٹے گی؟ کب یہ شورش و فغاں تھمے گی؟ کیا اس وقت جب عربوں

کا سارا دامن خون میں ڈوب جائے گا، ذہنی رشتے بکھر جائیں گے اور ہماری مساعی میں کوئی ربط، کوئی قاعدہ اور کوئی ضابطہ باقی نہ رہے گا۔ عجلان کے بیٹے! قسمت کے معبد میں کھڑے ہو کر اپنی قوم کے لیے صبح آزادی کی تمہید نہ باندھو۔ فطیون ہماری روحوں کا قاتل ہے اور اس کے لیے ایک غیر فانی عمل شروع کرنے کی ضرورت ہے۔ اگر تم ابوجبیلہ کے پاس نہیں جا سکتے تو آؤ اوس و خزرج کو مسلح کریں اور یثرب میں ظلم کے دوزخ اور مقتل کے اس محافظ کو ہم خود ٹھکانے لگا دیں۔ اگر تم ایسا بھی نہیں کر سکتے تو پھر مجھے مصلوب کر دو۔ یاد رکھو مالک! یہودی صرف خنجر کی زبان سمجھتے ہیں اور ان کے شعور کو بیدار کرنے کے لیے ہمیں ایک نہ ایک روز اپنے خنجر کو بے نیام کرنا ہی ہوگا۔ کیوں نہ اس کی ابتداء ابھی سے کر دیں۔ اُس وقت کی ابتدا سے کیا حاصل جب عربوں کی ساری لڑکیاں بے آبرو اور داغدار ہو چکی ہوں گی"۔

روبیل جب خاموش ہوا تو قنطورا نے کہا۔ "روبیل ٹھیک کہتا ہے۔ ہمیں فطیون کے خلاف ضرور کسی عمل کی ابتدا کرنی چاہیے"۔

مالک نے اِن دونوں کے خیالات کو جھٹلاتے ہوئے کہا۔ "تم دونوں کا فیصلہ جذباتی ہے۔ ہم میں اتنی سکت نہیں کہ ہم فطیون کی قوت کا مقابلہ کر سکیں۔ روبیل! یہ تمہیں مکّہ سے لوٹتے ہوئے کیا ہو گیا کہ تم ایسی سرکشی اور بغاوت کی باتیں کرنے سیدھے میرے پاس چلے آئے ہو۔ گھر جاؤ تمہیں آرام کی ضرورت ہے۔ تمہاری ماں اور تمہاری بہن تمہارا انتظار کر رہی ہوں گی"۔

روبیل نے مُنہ سے کچھ نہ کہا، وہ اُٹھا اور چراغ پا سا ہوتا ہُوا باہر نکل گیا۔ اپنے اونٹ پر سوار ہو کر وہ آگے بڑھ گیا تھا۔

تھوڑی ہی دیر بعد وہ اپنے گھر داخل ہو رہا تھا۔ اس کی بارہ سالہ بہن زرعہ اُسے دیکھتے ہی بھاگ کر اس سے لپٹ گئی تھی جب کہ اس کی ماں نے اُسے اپنے ساتھ لپٹا کر پیار کر لیا تھا۔ اس کا چھوٹا بھائی اس کے اُونٹ کی مہار پکڑ کر اصطبل کی طرف لے گیا تھا جب کہ اس کی بوڑھی ماں زمران اس کا ہاتھ تھام کر پیار بھرے

شکوے میں کہہ رہی۔

"تم کہاں رُک گئے تھے بیٹے! یہودا کہہ رہا تھا تم مالک کے پاس گئے ہو۔ سیدھا گھر آنے کی بجائے اس کے پاس جانے کی کیا ضرورت پیش آ گئی تھی۔ تمہارے انتظار میں تمہارے بھائی نے ابھی تک کھانا بھی نہیں کھایا"۔

روبیل نے ماں کو ٹالتے ہوئے کہا۔ "بس ایک ضروری کام سے مالک کے پاس گیا تھا۔ کوئی ایسی اہم بات نہیں ہے مجھے بھوک لگی ہے کھانا دو"۔

زمران اسے پکڑ کر اندر لے گئی، اتنی دیر تک یہودا بھی اونٹ کو اصطبل میں باندھ آیا تھا پھر وہ چاروں اکٹھے بیٹھ کر کھانا کھا رہے تھے۔

یثرب کے شمال مغرب میں وادیٔ عتیق کے اندر اور بیر رومہ کے آس پاس ہر سال فنونِ سپاہ گری کا ایک میلہ سا لگا کرتا تھا۔ بیر رومہ وادی عتیق میں یثرب سے تین میل کے فاصلے پر ہے۔ یہ وہی کنواں تھا جس کا پانی شیریں تھا اور جسے سیدنا عثمان ذی النورینؓ نے بیس ہزار درہم میں اس کے یہودی مالک سے خرید کر وقفِ عام کر دیا تھا۔ بعد میں یہی کنواں بیر عثمانؓ کے نام سے موسوم کیا گیا۔

وادیٔ عتیق کے اندر یہ میلہ کئی روز تک جاری رہتا تھا۔ اس میں یثرب کے مانے ہوئے تیغ زن، گھوڑ سوار، تیر انداز، نیزہ باز اور پہلوانی کے علاوہ ایسے ہی دوسرے فنون کے ماہر اپنی طاقت، شہ زوری اور فن کا مظاہرہ کرتے تھے۔ یہ سارے مقابلے فطیون کی نگرانی میں ہوتے تھے اور میلے پر اٹھنے والے اخراجات بھی وہی برداشت کرتا تھا۔

اس سال کے میلے سے چند یوم قبل فطیون نے یہودی قبائل کے تمام سرداروں

کی ایک خفیہ مجلس اپنی حویلی میں منظم کی۔ جب یہود کے قبائل بنو شقمہ، بنو زرعہ، بنو قینقاع بنو ثعلبہ، بنو یزید، بنو نضیر، بنو بہدل، بنو عوف اور بنو عصص کے سردار فطیون کے سامنے آکر بیٹھ گئے تو فطیون نے انہیں مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"میرے حریت پسند ساتھیو! تم عرب سرداروں میں سب سے زیادہ اپنے لیے خطرناک کسے جانتے ہو؟" کئی قبائل کے سرداروں نے یک زبان ہو کر کہا۔ "بنو نجار کے سردار روبیل بن حماد کو۔"

فطیون نے خواب انگیز سی آواز میں کہا۔ "اگر روبیل بن حماد کا خاتمہ کر دیا جائے تو عربوں میں کوئی اور سردار ہے جو ہمارے خلاف سر اٹھا کر بغاوت کھڑی کر سکے۔" کئی سرداروں نے پھر مل کر کہا۔ "ہرگز نہیں۔"

فطیون نے پھر راز داری سے کہا۔ "سنو میرے ساتھیو! چند یوم تک وادیٔ عتیق میں میلہ لگے گا۔ اس میلے میں آج تک کبھی قبائل کے سرداروں کے آپس میں مقابلے نہیں ہوئے اور اس بار میں یہ رسم بھی ڈالوں گا اور یہ بھی اعلان ہوگا کہ مقابلے میں جو بھی اپنے حریف کو جان سے مار دے اس پر قصاص واجب نہ ہوگا۔ کیا تم میں سے کوئی ایسا سردار ہے جو روبیل بن حماد سے مقابلہ کر کے اسے موت کے گھاٹ اتار سکے۔"

بنو بہدل کے قوی ہیکل اور جوان سال سردار فرزق نے کھولتے لہجے میں کہا۔ "میں روبیل کو مقابلے کے دوران موت کے گھاٹ اتاروں گا۔ وہ کوئی ایسا تیغ زن نہیں جسے زیر نہ کیا جا سکے۔ وادیٔ عتیق کے اندر میں اس کے جسم کو ٹکڑوں میں کاٹ کر صحرا کی ریت کو خون آلودہ کر دوں گا۔ اگر میں ایسا نہ کر سکا تو اپنے قبیلے کی سرداری سے دست بردار ہو جاؤں گا۔"

فطیون نے توصیفی انداز میں فرزق کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "میں تمہارے جذبے کی قدر کرتا ہوں۔ سنو! جب عام لوگوں کے مقابلے ہو رہے ہوں تو تم مسلح ہو کر میدان میں اترنا اور یثرب کے سارے قبائل کے سرداروں کو مقابلے کے لیے للکارنا۔ ظاہر ہے ہمارے سرداروں میں سے کوئی بھی باہر نہ آئے گا۔ جو بھی مقابلے

پر آیا وہ عربوں میں سے ہی ہوگا اور روبیل کے علاوہ کوئی دوسرا شاید میدان میں اترنے کی جرأت بھی نہ کرے گا اور جب روبیل میدان میں اترے تو تم اس کی گردن کاٹ دینا۔ یاد رکھو جس روز بھی عربوں نے ہمارے خلاف سرکشی اور بغاوت کی وہ روبیل بن حماد کی سرکردگی میں ہی ہوگی۔ اسے دوسری طرح بھی قتل کیا جا سکتا ہے لیکن ایسی صورت میں ہمارے لیے خطرات اٹھ کھڑے ہوں گے۔ اوس و خزرج مدینہ کے اطراف میں پھیلے ہوئے عرب قبائل بنو سلیم، بنو قریظہ، بنو زبیدہ، بنو سعد اور بنو عسفان کو ساتھ ملا کر ہمارے لیے خطرات پیدا کر سکتے ہیں۔ یاد رکھو! جس روز عرب قبائل آپس میں متحد ہو گئے اس روز یثرب میں یہود کا آخری دن ہوگا۔ اس لیے میری ایک بات گرہ باندھ کر رکھو! عرب کے ساتھ اپنی طرف سے جنگ کی پہل نہ کرو۔ اسی میں ہماری بہتری ہے۔ ظاہری طور پر ان سے برادرانہ اور دوستانہ مراسم رکھو اور اندر ہی اندر ان کے اتحاد اور ان کی قوت کی ساری جڑیں ایک ایک کر کے کاٹتے چلے جاؤ۔ اگر تم ایسا کرنے میں کامیاب رہے تو عرب ابد تک بھی تم پر غلبہ حاصل کرنے میں کامیاب نہ ہو سکیں گے۔ اب تم جاؤ اور اپنے اپنے قبائل کی طرف سے میلے میں حصہ لینے کی تیاری کرو۔ عرب اکثر ان میلوں میں ہم پر بھاری رہے ہیں۔ اس بار اگر ہم نے روبیل بن حماد کو قتل کر دیا تو آج تک جس قدر ہزیمتیں ہمیں اٹھانا پڑیں ان کا ازالہ ہو جائے گا۔" یہود کے تمام سردار اٹھے اور فطیون کی حویلی سے باہر نکل گئے تھے۔

وادیٔ عتیق میں ہر رومہ کے اطراف میں فنون سپہ گری کا میلہ لگا اور تین دن تک جاری رہا۔ اس میں جانوروں اور دیگر اشیاء کی خرید و فروخت کے علاوہ اونٹ اور گھوڑ دوڑ، تیغ زنی، نیزہ بازی، تیر اندازی اور کشتیوں کے مقابلے ہوتے رہے جس میں اوس و خزرج کے جوانوں کا پلہ بھاری رہا۔

یہ قدیم رسم چلی آتی تھی کہ ان مقابلوں میں عام لوگ حصہ لیتے تھے جب کہ قبائل کے سردار اس میں شرکت نہ کیا کرتے تھے۔ یثرب کے مرد اور عورتیں انتہائی شوق سے جم

غفیر کی صورت میں یہ میلہ دیکھتے تھے۔ اشیاء کے لین دین کے علاوہ یہ ان کے لیے تفریح کا ایک سلسلہ بھی تھا۔

تیسرے اور آخری روز جب تقریباً تمام مقابلوں کا فیصلہ ہو گیا بنو بہدل کا یہودی سردار فرزق جس نے اپنے آپ کو پوری طرح مسلح کر رکھا تھا اپنے گھوڑے پر سوار میدان میں اُترا۔ اس کے ہاتھ میں برہنہ تلوار تھی اور اس کا گھوڑا اپنے لمبے ایالوں کی موٹی گردن کو خم کیے کلیلیں کرتا ہوا میدان میں اُترا تھا۔ میدان کے وسط میں آکر فرزق نے اپنی تلوار فضا میں بلند کی اور بلند آواز سے پکار کر کہا۔

"اے اہلِ یثرب! میں بنی بہدل کا سردار فرزق ہوں اور آج میں سرداران قبائل کی ان مقابلوں میں حصّہ نہ لینے کی رسم کو توڑتا ہوں کہ اس طرح ہمارا خون منجمد ہوتا ہے۔ تم میں کوئی ایسا سردار ہے جو یہ جان کر میرے مقابلے پر آئے کہ اگر وہ میرے ہاتھوں مقابلے کے دوران مارا گیا تو اس کا کوئی قصاص نہ ہوگا۔"

فطیون جبلِ اُحد کی سمت ایک بلند شہ نشین پر یہودی سرداروں کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا۔ فرزق کے اس فعل پر وہ مطمئن تھا۔ اس کے لبوں پر مسکراہٹ تھی کہ یہ سارا کام اس کی اپنی خواہش کے مطابق ہو رہا تھا۔ یہودی سردار بھی فرزق کے اس اعلان پر مسرور تھے۔

اوس و خزرج کا سردار مالک بن عجلان بھی بیررومہ کی جانب عرب سرداروں کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا۔ فرزق کا یہ اعلان ان سب نے حیرت و استعجاب سے سنا تھا۔ اور وہ ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگے تھے۔ بنو حطمہ کے سردار نے تیز نگاہوں سے مالک بن عجلان کی طرف دیکھا پھر گرج کر کہا۔

"لگتا ہے یہودی ہمارے خلاف کسی نئی سازش کی ابتدا کر رہے ہیں۔"

مالک بن عجلان جواب میں کچھ کہنے والا تھا کہ بنی ساعدہ کا سردار بول اُٹھا۔

"یہودی فرزق کے اس اعلان کا جواب کیوں دیں گے۔ کیا ہم میں کوئی ایسا نہیں جو فرزق کو نیچا دکھائے اس کے سارے کس بل نکالے اور وادی عتیق کے اس میدان میں اسے خون

آلودہ کر دے۔"

اس کے بعد بنو سالم، بنو قوافل اور بنو واقف کے سردار بھی اپنی اپنی رائے کا اظہار کر رہے تھے تاہم بنو نجار کا سردار رویل بن حماد ابھی تک خاموش اور چپ تھا اور وہ غصیلے انداز میں میدان میں مقابلے کے لیے للکارتے ہوئے فرزق کی طرف دیکھ رہا تھا۔

جب سارے عرب سردار خاموش ہو گئے تو مالک بن عجلان نے تاسف کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ "کاش بنی بہدل کا یہودی سردار ایک نئی رسم کی ابتدا نہ کرتا۔ اس نے مقابلے کے لیے للکار کر ہم عرب سرداروں کو نیچا اور کم دل دکھانے کی کوشش کی ہے۔"

رویل غصّے کی حالت میں کھڑا ہو گیا اور اپنی تلوار کو بے نیام کرتے ہوئے اس نے کہا۔ "کم ہمت تو ہم اس وقت ثابت ہوں گے جب ہم مقابلے کے لیے میدان میں نہ اُترے یا فرزق ہمیں نیچا نہ دکھالے۔ میں فرزق کی اس پکار پر لبیک کہتا ہوں۔"

رویل کے پیچھے اس کا چھوٹا بھائی یہودا اور اس کا قابلِ اعتماد دوست رباح بیٹھے ہوئے تھے۔ رویل نے رباح کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "ذرا میرا گھوڑا تو لاؤ، میں دیکھوں فرزق میدان میں کتنی دیر تک میرا سامنا کر سکتا ہے۔"

رباح ابھی اُٹھنے بھی نہ پایا تھا کہ بنو نجار میں سے ایک جوان نے کہا۔ "اے میرے امیر! تمہارا گھوڑا لانے کی سعادت میں حاصل کرتا ہوں۔" اس کے ساتھ ہی وہ جوان اس طرف بھاگ کھڑا ہوا جدھر سردارانِ عرب کے گھوڑے بندھے ہوئے تھے۔ آناً فاناً اس جوان نے رویل کا گھوڑا کھولا اور اسے بھگاتا ہوا میدان میں لے آیا تھا۔

رویل اپنے گھوڑے کے پاس آیا۔ زین سے لٹکتا ہوا آہنی خود اس نے اپنے سر پر جمایا اور جب وہ گھوڑے پر سوار ہونے لگا تو مالک بن عجلان نے بڑی شفقت اور پیار سے کہا۔ "ٹھہرو رویل! زرہ پہن کر جاؤ میں تمہارے لیے زرہ منگواتا ہوں۔ کیا تم نہیں دیکھتے فرزق کے سر پر خود اور جسم پر زرہ چمک رہی ہے۔"

رویل ایک زقند کے ساتھ اپنے گھوڑے پر بیٹھتا ہوا بولا۔ "اے سردار!

مطمئن رہو، فرزق کی زرہ میری تلوار اور اس کے جسم کے درمیان دیوار اور آڑ ثابت نہ ہوسکے گی۔" اس کے ساتھ روبیل نے اپنے گھوڑے کو ایک سخت مہمیز لگا کر میدان میں اتار دیا تھا۔

فرزق کے قریب آکر روبیل نے اپنی تلوار اور ڈھال سنبھالتے ہوئے تیز عقابی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا پھر طنزاً کہا۔ "کیا تیری اصلاح کا وقت تو نہیں آگیا جو تُو نے مقابلے کے لیے پکار کر ایک نئی رسم کی ابتدا کی ہے۔ یاد رکھو فرزق! وادیٔ عتیق کے اندر میں تیرے تصورات کے سارے بُت توڑ کر تیرے ظلم و کدورت کو تیرے ہی خون سے دھو ڈالوں گا۔ اب جان بچا کر میدان سے نکلنا تیرے لیے محال ہوگا۔"

فرزق کے چہرے پر غصے کے عالم میں سلوٹیں گہری ہوگئیں اور اس نے اپنے گھوڑے کو آگے بڑھا کر روبیل پر حملہ کر دیا تھا۔ روبیل نے اس کا وار اپنی ڈھال پر لیا اور جوابی حملہ کیا جسے فرزق نے بھی اپنی تلوار پر روک لیا تھا۔ پھر وہ دونوں اپنے اپنے گھوڑے کو دائیں بائیں سے ایڑ لگا لگا کر اور پینترے بدل بدل کر حملہ آور ہونے لگے تھے شروع شروع میں روبیل نے اپنے آپ کو زیادہ تر دفاع اور ہلکی پھلکی جارحیت پر محدود رکھا تھا پھر آہستہ آہستہ وہ بھڑک اُٹھا اور اس کے حملوں میں شعلوں کی سی چمک اور چنگاڑتے رعد کی سی ہولناکی پیدا ہوگئی تھی۔ لگتا تھا اپنے دامن میں قیامت لیے وہ فرزق کے لیے برق و بار کا طوفان بن گیا ہو۔

وادیٔ عتیق میں اس نے تیز اور خطرناک و مہیب حملوں کا ایک ہنگام واژدہام کھڑا کر دیا تھا۔ جب کہ فرزق نے اب اپنے آپ کو صرف دفاع تک محدود کر لیا تھا۔ روبیل کی تیزی اور تواتر کے ساتھ برستی ہوئی تلوار سے دفاع کرتے کرتے اس کی حالت اس بھیڑ جیسی ہوگئی تھی جو اپنے گلے سے بھٹک کر کسی بھیڑیے کا شکار ہوگئی ہو۔ شاید وہ یہ سوچ رہا تھا۔ کاش! فطیون کے کہنے پر اس نے اس مقابلے کی ابتدا نہ کی ہوتی۔

فرزق کی اس وقت چیخ نکل گئی جب روبیل نے دائیں طرف کا چکمہ دے کر بائیں جانب سے اس پر تلوار گرا دی جس سے شانے کے قریب سے فرزق کی زرہ کی

کڑیاں کٹ گئی تھیں اور خون بہہ نکلا تھا۔ شاید اسے ہلکا سا زخم بھی آیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی روبیل نے زہر آلود لہجے میں کہا۔

"سُن فرزق! قسم ہے مجھے اپنے آنے والے صحرائی رسولؐ کی میں نے اپنی پوری قوت سے تجھ پر وار نہیں کیا اگر ایسا کرتا تو تیری زرہ کے ساتھ میں تیرے سارے جسم کو بھی کاٹ کر رکھ دیتا۔ دیکھ فرزق! میرے اس ہلکے سے وار نے تیری زرہ کی کڑیاں کاٹ دی ہیں اب میرا دوسرا وار تیرے جسم کی ہڈیوں اور گوشت کو کاٹے گا۔"

فرزق کا رنگ پیلا ہوگیا تھا۔ روبیل نے پھر طوفانی حملے شروع کر دیے تھے۔ اچانک اس کی تلوار چمکتی اور کوندتی ہوئی پھر وہاں گری جہاں سے کڑیاں کٹ گئی تھیں اور فرزق کے جسم کو پسلیوں تک کاٹتی چلی گئی تھی۔ فرزق گھوڑے سے گرا اور دم توڑ گیا تھا۔

روبیل نے چلّا کر کہا۔ "بنو یہدل کے لوگو! اپنے سردار کی لاش اُٹھا کر لے جاؤ۔ کیوں کہ اس کے اپنے فیصلے کے مطابق مجھ پر کوئی قصاص نہیں ہے اور اپنے نئے مقرر ہونے والے سردار سے کہہ دینا کہ تمہارا قبیلہ پھر کسی نئی رسم کی ابتدا نہ کرے کہ اس سے تلخیاں بڑھیں گی اور غلط فہمیاں جنم لیں گی۔"

فطیون کو سخت مایوسی ہوئی۔ وہ سوچ تک نہ سکتا تھا کہ روبیل اس قدر آسانی سے فرزق کو موت کے گھاٹ اُتار دے گا۔ وہ سخت بددلی اور غم کی حالت میں وہاں سے اُٹھ کر چلا گیا۔ دوسرے یہودی سردار بھی اُٹھ کر وادیٔ عتیق سے اپنے گھروں کو چلے گئے تھے۔

روبیل جب میدان سے باہر نکلا تو اس کے چھوٹے بھائی یہودا نے بھاگ کر اس کے گھوڑے کی باگ پکڑ لی تھی اور اس کے دائیں ہاتھ پر ایک طویل بوسہ دیتے ہوئے اس نے کہا۔

"میں اپنے بھائی کو مبارک دیتا ہوں کہ اس نے بنی یہدل کے سردار کو مقابلے کے کھلے میدان میں کاٹ کر فطیون کے قلب کو درد آشنا کر دیا ہے۔"

روبیل جب گھوڑے سے اُترا تو اوس و خزرج کے سردار مالک بن عجلان نے بھاگ کر اسے گلے لگاتے ہوئے کہا۔ "حماد کے بیٹے! قسم ہے مجھے ابراہیم کے رب کی تُو نے یہودیوں کے دیو کو زیر کرکے موت کے گھاٹ اُتارا ہے۔ تحسین تیری شجاعت کو، احسنت تیرے جذبے کو۔ آج تُو نے وادیٔ عتیق میں اپنی شجاعت اور اپنے فنونِ سپہ گری میں ممارست کی اصل شخصیت کا پرتو دکھایا ہے۔ اب یثرب کا ہر یہودی تم سے دہشت زدہ ہو کر رہے گا۔" مالک بن عجلان جب علیحدہ ہوا، تو بنو سالم، بنو قوافل اور بنو واقف کے سردار اس سے گلے مل رہے تھے۔

لوگوں کے ہجوم کے اندر سے روبیل کی ماں زمران اور اس کی چھوٹی بہن زرعہ اچانک نکلیں اور روبیل کی طرف بڑھیں۔ زرعہ بھاگ کر روبیل سے لپٹ گئی اور بھائی کی چھاتی پر سر رکھتے ہوئے کہا۔ "اخی! آپ کو یہ فتح مبارک ہو۔" اتنی دیر تک اس کی بوڑھی ماں زمران بھی وہاں پہنچ گئی اور بیٹے کی کامیابی پر وہ اسے گلے لگا کر بار بار چوم رہی تھی۔

اتنی دیر میں تبان کے محل کا متولی اور روبیل کے ہر معاملے کا رازدان بوڑھا حوارین وہاں آگیا اس کے ساتھ ایک نوعمر اور دراز قد نوخیز لڑکی تھی۔ اس کا حُسن آسمان پر آدھی رات کے وقت چمکتے ستاروں جیسا معصوم اور دلکش تھا۔ اس کا گلابی گلابی جوان و صندلیں جسم خوب بھرا ہوا اور گداز تھا۔ اس کی گہری نیلی آنکھوں میں صحرائی رات کی گہری خاموشی جیسا اسرار تھا اور اس کے دلکش و حسین چہرے پر رات کے پچھلے پہر کے کنوارے خواب جیسی تازگی اور نکھار تھا۔

حوارین نے قریب آکر کہا۔ "روبیل! روبیل! میں تمہیں فتح کی مبارک باد دیتا ہوں۔" پھر اس نے اپنے پہلو میں کھڑی اس لڑکی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "یہ تمہارے مداحوں میں سے ایک ہے۔ یہ تمہیں مل کر تمہاری شجاعت اور تمہاری فتح پر تمہیں دعائے خیر اور برکت دینا چاہتی تھی پر شرماتی ہوئی اکیلی نہ آرہی تھی۔ اس لیے مجھے ساتھ لائی ہے۔ ہماری طرح یہ بھی ہمارے آنے والے صحرائی رسولؐ پر ایمان

رکھتی ہے۔" پھر اس نے لڑکی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "کہو کیا کہنا چاہتی ہو؟"

لڑکی نے اپنے آپ کو سنبھالا پھر اس نے گنگناتی ندیوں اور آبشاروں کے ترنم جیسی اپنی آواز میں کہا۔ "فرزق یثرب میں ناقابلِ تسخیر سمجھا جاتا تھا۔ آپ نے لمحوں میں اسے زیر کرکے ثابت کر دیا ہے کہ بنو نجار کے سردار سے مقابلہ کرنا آسان اور سہل نہیں ہے آپ کی فتح ہماری خوشی کا باعث ہے کہ آپ اب ہمارے مستقبل کی اُمیدوں کے چاند ہیں۔ مکہ کے نبیؐ کا رب آپ کو اس سے بھی زیادہ توفیق اور استقامت دے۔"

روبیل نے پہلی بار لڑکی کو مخاطب کرکے پوچھا۔ "تمہارا نام کیا ہے۔" لڑکی نے جھٹ کہا۔ "میرا نام راحیل ہے۔ راحیل بنت عجیل میں عرب ہوں اور بنی سالم سے ہوں۔" روبیل نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "بہت اچھا نام ہے۔"

راحیل نے چونک کر کہا۔ "میں تو عم حوارین سے آپ کے نام کی تعریف کر رہی تھی کہ یہ ایک بہادر اور شجاع جوان کا نام ہے۔ میرا نام کس لحاظ سے اچھا ہے۔"

روبیل نے اور زیادہ مُسکراتے ہوئے کہا۔ "اس لیے اچھا ہے کہ یعقوبؑ کی بیوی اور یوسفؑ و بنیامین کی ماں کا نام بھی راحیل تھا۔" راحیل کی گردن جُھک گئی اور کسی قدر شرما کر وہ بولی۔ "آپ نے سچ کہا۔"

قریب کھڑی روبیل کی ماں نے پہلی بار راحیل کو مخاطب کرکے کہا۔ "اے بیٹی! میرا نام زمران ہے اور میں روبیل کی ماں ہوں۔ تیری باتوں میں تاثیر اور تیرے اندازِ گفتگو میں دلکشی ہے کیا تو میرے ساتھ میرے گھر چلے گی کہ تیری باتوں سے مجھے سکون اور تیری ذات سے میرے گھر میں رونق ہوگی۔"

راحیل نے کسی قدر شرما اور پھر مسکرا کر کہا۔ "میں ضرور آپ کے ساتھ چلوں گی۔ آپ کا سکون میری خوشنودی کا باعث ہوگا۔" اتنی دیر میں زرعہ آگے بڑھی اور راحیل سے لپٹتے ہوئے اس نے کہا۔ "میرا نام زرعہ ہے اور میں روبیل کی بہن ہوں۔" راحیل اسے لپٹا کر پیار کرنے لگی تھی۔ چُپ اور خاموش کھڑا یہودا سامنے آیا اور راحیل کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "اے بہن! مجھے تو آپ فراموش ہی کر گئیں۔ روبیل میرے بڑے

بھائی ہیں"۔ راحیل نے مسکرا کر کہا۔ "آپ سب لوگ بہت اچھے ہیں"۔

یہودہ نے کھلکھلا کر ہنستے ہوئے کہا۔ "ہاں بہن! ہم سب اچھے ہیں مگر اخی روبیل کے دم سے"۔ راحیل نے شرما کر منہ دوسری طرف پھیر دیا تھا۔ زمران نے سلسلہ کلام بدلتے ہوئے کہا۔ چلو گھر چلیں۔ بوڑھے حوارین نے جب وہاں سے ہٹنا چاہا تو روبیل نے کہا۔ "اے عم! آپ بھی ہمارے ساتھ چلیں۔ آج سب مل کر اکٹھے کھانا کھائیں گے"۔ سب واپس لوٹے اور حوارین بھی ان کے ساتھ ہو لیا تھا۔

حویلی میں داخل ہونے کے بعد روبیل، حوارین اور یہودہ دیوان خانے میں بیٹھ گئے۔ زمران اور زرعہ، راحیل کو لے کر اندر گئیں۔ سامنے والے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے زمران نے راحیل سے پوچھا۔ "تمہارے یہاں قیام سے تمہارے گھر والے خفا تو نہ ہوں گے"۔ راحیل نے پُرسکون رہتے ہوئے کہا۔ "نہیں میرے باپ کو جب خبر ہوگی کہ میں عربوں کے فاتح روبیل کو مبارک دینے کے بعد ان کی ماں کے ساتھ ان کے گھر گئی تھی تو انہیں کوئی اعتراض نہ ہوگا"۔

زمران نے ہمدردی کرتے ہوئے کہا۔ تم گھر کے کتنے افراد ہو؟" راحیل ایک دم ماند پڑ گئی اور اداس بکھرے لہجے میں اس نے کہا۔ "میں اپنے ماں باپ کی واحد اولاد ہوں اور ——— راحیل کہتے کہتے رُک گئی اور کسی احساس کے تحت اس نے مڑ کر جب پیچھے دیکھا تو وہاں روبیل کھڑا تھا۔ راحیل کو خاموش ہوتے دیکھ کر اس نے اس کی ہمت بڑھاتے ہوئے کہا۔ تم اپنی گفتگو مکمل کرو۔ میں تمہاری باتیں دلچسپی اور غور سے سن رہا ہوں"۔

راحیل نے گردن جھکاتے ہوئے کہا۔ "میں نے جو کچھ کہنا تھا کہہ چکی"۔ روبیل نے پوچھا۔ "تمہارے بابا کیا کرتے ہیں اور تمہاری گزر بسر کیسے ہوتی ہے"۔

اپنی گردن جھکائے ہی جھکائے راحیل نے دکھ سے کہا۔ "بیرا ویس کے قریب ہمارا ایک چھوٹا سا باغ ہے۔ اس کے علاوہ چند بکریوں پر مشتمل ہمارا ایک ریوڑ ہے۔ بس یہی دو چیزیں ہماری گزر بسر کا ذریعہ ہیں"۔

روبیل نے اس بار زمران کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ماں! آج کھانے کا کوئی بندوبست نہ ہوگا۔ مجھے بھوک لگی ہے اور پھر دیوان خانے میں حوارین بھی ہیں۔ ہم سب وہیں کھانا کھائیں گے اور ہاں ماں! راحیل کو کھانا کھلائے بغیر جانے نہ دینا"۔

زمران نے مسکرا کر کہا۔ "یہ جائے گی کہاں۔ آج یہ اس گھر کا کھانا خود ہی تیار کرے گی۔ تم راحیل سے اس کے گھر کا پتہ پوچھ لو اور اس کے بابا کو جا کر خبر کر آؤ کہ راحیل ہمارے ہاں ہے۔ تاکہ وہ پریشان نہ ہوں"۔

روبیل نے فوراً راحیل سے کہا۔ "اپنے گھر کا پتہ کہو، میں ابھی تمہارے بابا کے پاس جاتا ہوں"۔ راحیل نے مسکرا کر کہا۔ "پتے کی کوئی ضرورت نہیں ہے آپ بنو سالم میں چلے جائیں۔ وہاں جس سے بھی پوچھیں گے وہ آپ کو میرے باپ کے متعلق بتا دے گا"۔

میرا خیال ہے آپ تھوڑی دیر رُک جائیں۔ میرے بابا میلے میں میرے ساتھ تھے۔ میں انہیں بتا کر ہی حوارین کے ساتھ آپ کے پاس گئی تھی۔ پر مجھ سے غلطی ہوئی آپ لوگوں کے ساتھ آتے ہوئے مجھے اپنے بابا سے اجازت لینی چاہیے تھی۔ اگر انہوں نے مجھے آپ کے ساتھ آتے ہوئے دیکھ لیا ہے تو وہ گھر جانے کی بجائے ادھر ہی آئیں گے۔ اس لیے کہ ——— اسی وقت ایک بوڑھا گھر میں داخل ہوا اور راحیل نے ذرا رُک کر پھر کہا۔ "اب آپ کو ہمارے گھر جانے کی ضرورت نہیں۔ میرے بابا آ گئے ہیں"۔

روبیل آگے بڑھا اور اس بوڑھے سے مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔ "میرا نام روبیل ہے اور راحیل کو میری ماں اپنے ساتھ لے آئی ہے۔ میں اسی کی اطلاع کرنے آپ کے گھر جا رہا تھا"۔

اس بوڑھے نے بھی خوش طبعی سے مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔ "میں راحیل کا باپ عجیل ہوں۔ میں جانتا ہوں تم بنو نجار کے سردار روبیل بن حماد ہو اور آج تو یثرب کے ہر فرد کو خبر ہو گئی ہے کہ تم شیر دل روبیل ہو کہ آج عربوں ہی نہیں بلکہ یہودیوں کے گھروں میں بھی تمہاری اس عظیم فتح اور فرزق کی بدترین موت کے چرچے ہوں گے"۔

بوڑھا عجیل جب خاموش ہوا تو راحیل نے اس سے قریب ہو کر کہا۔ "بابا! ان

کی ماں مجھے شام کے کھانے تک یہاں روکنا چاہتی ہے ۔اگر تم اجازت دو تو ــــــــــ

عجیل نے فراخ دلی سے مسکراتے ہوئے کہا۔تم بڑی خوشی سے شام تک یہاں رکو بیٹی ! اس گھر پہ مَیں پورا بھروسہ اور اعتماد کرسکتا ہوں ۔مَیں میلے میں تم سب سے قریب ہی کھڑا تھا اور مَیں نے وہاں تم سب کی گفتگو سُنی تھی اسی لیے تمہارے پیچھے پیچھے یہاں چلا آیا ہوں ۔اب مَیں گھر جاتا ہوں تم یہاں سے فارغ ہو کر اور ان سے اجازت لیکر آجانا“۔

زمران نے اسے روکتے ہوئے کہا ” تم بھی یہیں رُک جاؤ بھائی ! دونوں باپ بیٹی اب شام کا کھانا کھا کر اکٹھے چلے جانا“۔ عجیل نے بڑی عاجزی سے کہا ” نہیں بہن ! مَیں چلتا ہوں ۔گھر میں بکریوں کا ایک چھوٹا سا ریوڑ ہے اسے بھی جاکر سنبھالنا ہے ۔تم ایک مہربانی کرنا اگر دیر ہو جائے تو راحیل کو کسی کے ساتھ روانہ کرنا اسے اکیلی نہ بھیجنا ۔مَیں یہودیوں کی طرف سے اس کے متعلق فکرمند رہتا ہوں “۔

روبیل نے چونک کر پوچھا ۔” ان کی طرف سے آپ کو کیسا خطرہ اور فکر ہے “۔

عجیل نے ندامت کے انداز میں اپنی گردن جھکاتے ہوئے کہا ۔” راحیل کا دراز قد اور خوبصورت ہونا ہی میری فکر مندی کی علامت ہے ۔فطیون اپنے آدمیوں کے ذریعے کئی بار مجھے پیغام بھجوا چکا ہے کہ اپنی بیٹی کی شادی کر دو ۔اس نے یہ پیشکش بھی کی ہے کہ اگر تمہیں کوئی مناسب رشتہ نہیں مِلتا تو اس کا انتظام مَیں کرتا ہوں ۔ دراصل فطیون مجھے ہی نہیں ہر خوب صورت لڑکی کے والدین کو ایسے ہی پیغامات بھجواتا ہے ۔اس لیے کہ ہر شادی ہونے والی لڑکی اپنی عروسی شب کو اپنے شوہر کے پاس جانے کی بجائے فطیون کی خواب گاہ کی طرف جاتی ہے اور یہ ایک ایسی لعنت ہے جس کا کوئی حل کوئی سدِباب نہیں ہے “۔

روبیل سوچوں میں کھو گیا تھا ۔عجیل نے فوراً بات کا رُخ بدلتے ہوئے کہا ۔” میری بکریاں بھوکی پیاسی بندھی ہوں گی، مَیں اب چلتا ہوں “۔جلدی جلدی میں اس نے روبیل سے مصافحہ کیا اور حویلی سے باہر نِکل گیا تھا ۔

زمران، راحیل اور زرعہ وہاں سے ہٹ کر کھانا پکانے کی تیاریاں کرنے لگی تھیں جبکہ روبیل دیوان خانے میں حوارین اور اپنے چھوٹے بھائی یہودا کے پاس بیٹھ کر باتیں کرنے لگا تھا ۔

شام کے کھانے کے بعد جب راحیل نے زمران سے جانے کی اجازت طلب کی تو زمران پہلے باورچی خانے میں گئی وہاں سے ایک برتن میں کھانا باندھ کر وہ ایک ملحقہ کمرے میں آئی وہاں سے اس نے نقدی کی ایک چھوٹی خریطی لی اور صحن میں آکر اس نے روبیل کو آواز دی جس کے جواب میں دونوں بھائی دیوان خانے سے اُٹھ کر صحن کی طرف آگئے ۔

زمران نے یہودہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا ” تم حوارین کے پاس ہی بیٹھو بیٹا ! مَیں نے روبیل کو آواز دی ہے کہ وہ راحیل کو اس کے گھر چھوڑ آئے ۔یہودہ کی طبیعت کچھ کچھ تمسخرانہ تھی اس نے آگے بڑھتے ہوئے کہا ۔

” ماں ! عم حوارین تو جا چکے ہیں ۔تم نے جو کچھ کہنا ہے کہو ماں ! میرا وعدہ ہے کہ میں کسی کے گلے میں ہڈی نہ بنوں گا“۔ زمران کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کھیل گئی اس نے رومال میں بندھا ہوا کھانا اور نقدی کی تھیلی راحیل کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا ۔

” یہ دونوں چیزیں سنبھالو بیٹی ! رومال میں تمہارے بابا کا کھانا ہے ۔گھر جاکر تم کہاں اکیلے باپ کا کھانا تیار کرنے کی زحمت اُٹھاؤ گی اور اس تھیلی میں تھوڑی سی نقدی ہے اس سے اپنے لیے کپڑے بنا لینا ۔تمہیں بیٹی کہہ کر اپنے گھر لائی تھی ۔لہذا اس گھر سے تم اب خالی ہاتھ کیونکر جا سکتی ہو ۔

راحیل نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا ” کھانا تو مَیں لے جاؤں گی لیکن نقدی کی یہ تھیلی نہ لوں گی ۔مَیں سمجھتی ہوں اس کی ضرورت نہیں ہے “۔

کسی اور کے بولنے سے قبل ہی یہودہ نے جھٹ کہا ۔” لے لو میری بہن ! اس تھیلی میں سنہری سکّوں کی ایک اچھی خاصی رقم ہے ۔ایسے مواقع بار بار نہیں مِلتے ۔اگر مَیں تمہاری جگہ لڑکی ہوتا تو جھپٹ کر اس تھیلی کو لے چکا ہوتا “۔ راحیل کے لبوں پر بے ساختہ مسکراہٹ بکھر گئی تھی ۔پر جلدی جلدی اس نے اپنی مسکراہٹ کو دبا کر یہودہ کی طرف تیز نگاہوں سے گھور کر دیکھا ۔اتنی دیر تک روبیل نے بھی راحیل کو مخاطب کر کے کہا ۔

” لے لو راحیل ! انکار کیوں کرتی ہو“۔ راحیل نے ممنونیت کے عالم میں روبیل کی طرف دیکھا پھر اس کی گردن جُھک گئی اور ہاتھ بڑھا کر اس نے زمران سے دونوں

چیزیں لے لی تھیں۔

راحیل خاموشی کے ساتھ زمران اور زرعہ سے ملی پھر وہ روبیل کے ساتھ گھر سے نکل گئی تھی۔ دونوں بنی نجار پھر بنی واقف کے محلوں سے گزرنے کے بعد بنو سالم میں داخل ہوئے اور راحیل نے ایک مکان کے سامنے رُک کر دروازے پر دستک دیتے ہوئے کہا۔ "یہ میرا گھر ہے"۔ اِتنے میں دروازہ کھُلا اور اُن دونوں کے سامنے بوڑھا عجیل کھڑا تھا۔ اس نے آگے بڑھ کر روبیل سے مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔ "میں خوش بخت ہوں کہ میرے گھر میں عربوں کا عظیم سپوت اور شیر دل فرزند آیا ہے"۔

مصافحہ کے بعد روبیل نے ہاتھ علیحدہ کرتے ہوئے کہا۔ "میں راحیل کو چھوڑنے آیا تھا۔ میں اب جاتا ہوں۔ ویسے بھی اندھیرا گہرا ہو گیا ہے پھر کسی روز دن کے وقت آؤں گا اور آپ کے پاس بیٹھوں گا"۔

عجیل نے ممنونیت سے کہا۔ "اگر دن کے وقت آنا چاہو تو شام کے قریب آنا۔ اس سے پہلے ہم دونوں باپ بیٹی اپنے باغ میں ہوتے ہیں۔ بیر اویس کے پاس میرا ایک باغ ہے۔ اس کے اندر میں اپنی ضرورت کی فصلیں بھی اُگاتا ہوں۔ دن کے وقت میں وہاں باغ اور کھیتوں میں کام کرتا ہوں اور راحیل اپنے ریوڑ کو چراتی ہے"۔

روبیل نے پیچھے ہٹتے ہوئے کہا۔ "بیر اویس سے ذرا ہٹ کر ہمارا بھی ایک باغ ہے میں اکثر وہاں جاتا ہوں، میں آپ سے ضرور وہاں ملوں گا"۔ روبیل نے ایک الوداعی نگاہ راحیل پر ڈالی اور عجیل سے دوبارہ مصافحہ کر کے وہ چلا گیا تھا۔ عجیل اور راحیل تھوڑی دیر وہاں کھڑے ہو کر اسے دیکھتے رہے۔ جب وہ اندھیرے میں رُوپوش ہو گیا تو اُنہوں نے اپنے گھر کا دروازہ بند کر لیا تھا۔

چند دن بعد ایک روز شام کے قریب روبیل اور اس کا بھائی یہودہ دن بھر اپنے باغات میں کام کرنے کے بعد جب واپس گھر لوٹ رہے تھے تو انہوں نے ذرا فاصلے ہی سے دیکھ لیا کہ ان کے گھر سے باہر لوگوں کی خوب بھیڑ اور جمگھٹا ہو رہا تھا۔ یہودہ نے

پریشان ہو کر پوچھا۔ "یا اخی! ہمارے گھر کے سامنے یہ بھیڑ کیسی ہے اور اس قدر لوگ وہاں کیوں جمع ہیں"۔

تمسخرانہ انداز میں گفتگو کرنے والا یہودہ اس وقت انتہائی سنجیدہ اور فکرمند دکھائی دے رہا تھا۔ روبیل نے بکھری بکھری سی اور متفکر آواز میں کہا۔ "اس قدر لوگوں کا جمع ہونا کسی غیر معمولی واقعہ کی نشاندہی کرتا ہے۔ اللہ کرے میری ماں اور بہن ٹھیک ہوں"۔

دونوں نے اپنے گھوڑوں کو ایڑ لگا کر ان کی رفتار تیز کر دی تھی۔ جب وہ اپنی حویلی میں داخل ہوئے تو اُنہوں نے دیکھا وہاں اَن گنت مرد اور عورتیں جمع تھے۔ مطبخ کی دیوار کے پاس ان کی ماں زمران اور بہن دونوں اپنی گردنیں جھکائے اُداس اور افسردہ کھڑی تھیں۔ لگتا تھا وہ روتی رہی تھیں۔ ان کے قریب ہی راحیل کھڑی اپنے آنچل سے اپنے آنسو پونچھ رہی تھی۔

راحیل کے ساتھ ہی دائیں طرف اوس و خزرج کا سردار مالک بن عجلان اور اس کی بہن قنطورا بھی تھی اور ان سب کے سامنے لوگوں کے اندر ایک بوڑھی عورت اُونچی آواز میں بین کرتی ہوئی رو رہی تھی۔ اس کے بال بکھرے ہوئے تھے جنہیں وہ بار بار نوچ رہی تھی۔

روبیل اسے پہچان گیا وہ اس کے قبیلے کی ایک بیوہ تھی۔ اس کے بین کرنے سے اُسے یہ اندازہ لگانے میں دیر نہ لگی کہ وہ اپنی بیٹی کے لیے رو رہی تھی اور اس بڈھی خاتون کے قریب ہی راحیل کا باپ عجیل کھڑا تھا۔

روبیل کے گھر میں داخل ہوتے ہی مالک بن عجلان نے اشارے سے یہودہ کو اپنے پاس بُلایا۔ راحیل اور زرعہ کو بھی اس نے اپنے قریب بُلا لیا اور بڑی رازداری کے ساتھ وہ ان سے گفتگو کرنے لگا تھا۔

روتی اور بین کرتی ہوئی بوڑھی عورت نے جب روبیل کو دیکھا تو اس نے بین اور واویلا کرنا بند کر دیا اور غصیلی حالت میں وہ روبیل کی طرف بڑھی۔ قریب آکر اس

نے بڑی سختی سے روبیل کا گریبان پکڑ لیا اور زور سے اُسے کھینچتے ہوئے اس نے قہر برساتی آواز میں کہا۔ "حماد کے بیٹے! تو بنی نجار کا کیسا سردار ہے کہ تیری موجودگی میں میری بیٹی مجھ سے بچھڑ گئی"۔

اس نے غصّے کی حالت میں اس زور سے روبیل کو کھینچا کہ اس کا گریبان پھٹ گیا۔ روبیل نے صبر کیا اور بڑے تحمل سے کام لیتے ہوئے اس نے بڑے ہمدرد لہجے میں پوچھا۔ "خاتون! میں تمہاری بات کو سمجھا نہیں۔ کھُل کر کہو تمہاری بیٹی کیسے اور کس نے چھین لی۔ یاد رکھو جو بھی اس کام میں ملوث ہوا خواہ وہ میرا بھائی ہی کیوں نہ ہوا میں بنو نجار کے سردار کی حیثیت میں اس سے تیرا انتقام ضرور لوں گا۔ بولو خاتون! کس نے تم سے تمہاری بیٹی کو چھین لیا ہے"؟

اس بوڑھی خاتون نے روبیل کا گریبان چھوڑ دیا اور درد میں ڈوبی ہوئی آواز میں اس نے کہا۔ "موت میری بیٹی کو مجھ سے چھین کر لے گئی ہے۔ پرسوں اس کی شادی تھی اور آج اس نے اپنے سینے میں خنجر گھونپ کر اس لیے خودکشی کر لی ہے کہ شادی کے بعد سے اپنے شوہر کی نہیں بلکہ فطیون کی خواب گاہ میں جانا نصیب ہوگا۔ وہ فطیون کے ہاتھوں بے آبرو اور عیب دار نہ ہونا چاہتی تھی۔ لہٰذا اس نے خودکشی کر لی"۔

وہ خاتون ذرا رُکی پھر پاگلوں کے انداز میں اس نے کہا۔ "میری بیٹی نے اچھا ہی کیا۔ زندہ رہتی تو فطیون کے ہاتھوں عیب دار ہو جاتی اور پھر یہاں کسی کی کون سنتا ہے۔ مالک بن عجلان سے شکایت کی اس نے کچھ نہ کیا۔ اب تمہارے سامنے فریاد کی ہے اور تم بھی خاموش ہو۔ میری بیٹی تو مر گئی، اب اس رسم کو توڑ کر عربوں کی عصمت کو بے آبرو ہونے سے تو بچاؤ"۔

ایک جھٹکے کے ساتھ روبیل نے اپنی تلوار میان سے کھینچ لی اور اس بوڑھی عورت کی طرف دیکھتے ہوئے اس نے کہا۔ "تم یہیں رکو خاتون! میں فطیون کی طرف جاتا ہوں۔ آج میں اس کی گردن کاٹ کر ہی رہوں گا۔ چاہے اس جرم کی سزا میں یہودی میرا گوشت ہی کیوں نہ نوچ لیں۔ اگر میرا خون بہنے سے عربوں کی آزادی اور عزت بحال ہو سکتی ہے تو مجھے اپنا خون بہانے پر فخر ہوگا"۔ روبیل تیز تیز قدم اُٹھاتا ہوا باہر نکلنا چاہتا تھا کہ مالک بن عجلان کے سمجھانے پر یہودہ اور اس کی چھوٹی بہن بھاگے، دونوں بری طرح روبیل سے لپٹ گئے اور اسے باہر لے جانے سے روک لیا۔ مالک بن عجلان نے سب لوگوں کو اپنے گھروں کو چلے جانے کا اشارہ کیا اور لوگ حویلی سے باہر نکل گئے۔ کچھ عورتیں اس بوڑھی عورت کو بھی سہارا دے کر لے گئی تھیں جو اپنی بیٹی کی فریاد لے کر آئی تھی۔

روبیل اپنے بھائی اور بہن سے اپنے آپ کو چھڑانے کی کوشش کر رہا تھا کہ زمران اور راحیل بھی وہاں آگئیں۔ راحیل نے روبیل کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ اپنی تلوار مجھے دے دیں۔ پہلے کمرے میں چل کر ہماری بات سنیں اس کے بعد آپ جو بھی فیصلہ کریں گے ہم سب آپ کا ساتھ دیں گے۔ راحیل نے زبردستی روبیل کی مٹھی کھولی اور اس سے اس کی تلوار لے لی۔ یہودہ اور زرعہ نے ابھی تک روبیل کو اپنے بازوؤں میں جکڑا ہوا تھا۔

زمران نے یہودہ اور زرعہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "چھوڑ دو بھائی کو"۔ یہودہ اور زرعہ پیچھے ہٹ کر کھڑے ہو گئے۔ روبیل نے غصّے میں مالک کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "یہودہ اور زرعہ کو مجھ سے لپٹ جانے اور راحیل کو مجھ سے تلوار لینے کا سبق تم نے دیا ہے۔ آخر کیوں؟ تم اگر فطیون کے خلاف نہیں بول سکتے تو ساتھ میری زبان بندی کیوں کرتے ہو، تم اس ماحول میں زندگی بسر کر سکتے ہو لیکن میرے لیے یہ ناقابلِ برداشت ہے۔

مالک نے اپنی بہن قنطورا اور راحیل کے باپ عجیل کے ساتھ روبیل سے قریب ہو کر کہا۔ جذباتی نہ بنو وقت کا انتظار کرو اور دیکھو میں کیا کرتا ہوں۔ روبیل نے مجروح لہجے میں کہا۔ کب تک انتظار کرتے رہو گے؟ کیا اس وقت حرکت میں آؤ گے جب عربوں کو سرِ مقتل اور دار و رسن پر کھڑا کر دیا جائے گا۔ کیا اس وقت تم جاگو گے جب عربوں کی حمیت سلگ سلگ کر اپنے آپ ختم ہو جائے گی اور وہ صدیوں کے فاصلوں کی خونی گرد میں دب چکے ہوں گے۔ کلیاں مرجھا جانے کے بعد باغبان حرکت میں آیا بھی تو کیا حاصل۔ آج تو تم نے میرے بھائی اور بہن کی وساطت سے

مجھے روک لیا ہے کل کو عربوں میں اور ذگ بھی اُٹھ کھڑے ہوئے تو تم کس کس کی راہ روکو گے ۔ کس کس عرب کی زبان بندی کروگے ۔ خدا کرے وہ لمحہ قبل از وقت ہی آجائے جس کا تم انتظار کر رہے ہو۔"

مالک بن عجلان نے کچھ کہنے سے قبل ہی اس کی بہن قنطورا نے دکھتے الفاظ کی دکھ آمیز رقت میں کہا "وہ لمحہ قبل از وقت میں لاؤں گی اور ایسا لاؤں گی کہ عربوں کی آنے والی پشتیں اور نسلیں تک یاد رکھیں گی کہ کسی عرب لڑکی نے بے آبروئی کے خلاف احتجاج اور غدر کیا تھا۔"

مالک بن عجلان نے آگے بڑھ کر پیار سے روبیل کا شانہ تھپتھپاتے ہوئے کہا۔ "مجھے تم بھائیوں کی طرح عزیز ہو۔ میں جانتا ہوں ایسے موقعوں پر تمہارے کیا جذبات ہوتے ہیں لیکن میں بے وقت عربوں کو یہودیوں سے ٹکرا کر ان کا خون بہانا نہیں چاہتا۔ مجھے مناسب وقت کی تلاش ہے ۔ اور یاد رکھو جس روز میں ان کے خلاف حرکت میں آیا یہ یثرب میں اپنے مضبوط اور آہنی قلعوں کے اندر بھی اپنے آپ کو غیر محفوظ اور تنہا محسوس کر رہے ہوں گے اس میں ان کے ہر فعل کا احتساب کروں گا اور ان کی ہر بدی کا انتقام لوں گا تم تھکے ہوئے آئے ہو۔ کھانا کھا کر آرام کرو ۔ میں اب جاتا ہوں ۔ میرے بعد کوئی نیا ہنگامہ نہ کھڑا کر دینا۔ بس تم مجھے چند یوم کی مہلت دو ۔

مالک بن عجلان جب قنطورا کے ساتھ باہر نکلنے لگا تو زمران نے ان دونوں کو مخاطب کر کے کہا ۔ "ٹھہرو ! اچھا ہوا آج اس گھر میں راحیل اور اس کے باپ کے ساتھ تم دونوں بہن بھائی بھی ہو ۔ میں ایک فیصلہ کرنا چاہتی ہوں اور اس میں تم دونوں کی موجودگی بھی ضروری ہے ۔ مالک اور قنطورا دونوں رُک کر پھر زمران کے ساتھ کھڑے ہوگئے ۔ زمران نے اس بار راحیل کے باپ عجیل کو مخاطب کر کے کہا۔" اے بھائی ! میں نے راحیل کو روبیل کے لیے پسند کیا ہے کیا تم اس رشتے کو بخوشی منظور کرتے ہو۔"

زمران کے اس انکشاف پر راحیل کے ہونٹوں پر اطمینان اور سکون کی گہری خوشیاں

بکھر گئی تھیں ساتھ ہی وہ شرما کر ذرا پیچھے بھی ہٹ گئی تھی ۔

عجیل نے بڑی عاجزی اور انکساری میں کہا "میرے لیے یہ ایک بہت بڑی سعادت اور خوشی ہوگی کہ میری بیٹی روبیل جیسے شجاع اور جوانمرد عرب کی بیوی بنے ۔ میں بخوشی اس رشتے کو منظور اور قبول کرتا ہوں"۔

عجیل کے ہاں کرنے پر زرعہ بھاگ کر راحیل سے لپٹ گئی تھی ۔ زمران تیزی سے اندر گئی پھر ایک طلائی انگشتری اس نے لا کر عجیل کو تھماتے ہوئے کہا۔" یہ میری طرف سے اپنے ہاتھ سے راحیل کو پہنا دو ۔ جس روز یہ میلے میں مجھے ملی تھی اور میں اسے اپنے ساتھ گھر لائی تھی اسی روز ہی میں نے اسے روبیل کے لیے پسند کر لیا تھا ۔ یہ صرف میری ہی پسند نہیں بلکہ یہ دونوں بھی اب ایک دوسرے کو پسند کرنے لگے ہیں ۔

عجیل نے زمران سے وہ طلائی انگشتری لے لی ۔ پھر وہ آگے بڑھا اور انگشتری اس نے راحیل کے ہاتھ میں پہنا کر اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔" میری بیٹی ! تو خوش قسمت ہے ۔ آج سے تو سردار روبیل کی امانت ہے"۔

راحیل کی گردن جھک گئی تھی اور حیا سے اس کا رنگ سرخ ہو کر رہ گیا تھا ۔
اتنے میں مالک بن عجلان نے کہا ۔" ایک خوشخبری میں بھی کہوں ! میں نے بھی قنطورا کی نسبت بنو خزرج کے ایک جوان سے طے ہو چکی ہے اور چند یوم تک اس کی شادی کر دوں گا"۔

زرعہ بھاگ کر اندر گئی اور ایک دف اٹھا لائی ۔ پھر دف سے بندھی رسی اس نے گلے میں ڈال لی اور دف بجا کر وہ ترنم اور لے میں گانے لگی تھی ۔

یا فوز نفس فی ھراک ھواؤھا

اے کامیاب نفس تیری خواہش میں اس محبوب کی محبت مربوط ہے

وقتِ معانیقا وراق مناق ھا

اس لیے اس خواہش کے معانی سبک اور اس کی تمنا پسندیدہ ہے

زرعہ دف بجا بجا کر گا رہی تھی ۔ روبیل ، زمران ، یہودہ ، مالک ، قنطورا

اور عجیل کھل کھلا کر ہنس رہے تھے جب کہ راحیل دبی دبی اور پسندیدہ مسکراہٹ میں شرما رہی تھی۔ ہنستے ہنستے مالک نے زمران سے اجازت لی اور دونوں بہن بھائی وہاں سے چلے گئے تھے۔ عجیل اور راحیل نے کچھ دیر وہاں قیام کیا۔ شام کا کھانا دونوں باپ بیٹی نے روبیل کے ساتھ ہی کھایا پھر وہ اپنے گھر چلے گئے تھے۔

اوس و خزرج کے سردار مالک بن عجلان کی حویلی کے ایک طرف عربوں کے سب ذیلی قبائل کے سردار اور اکابر جمع تھے۔ آج قنطورا کی شادی تھی اور ان کے انتظامات کرنے کے لیے ہی مالک بن عجلان نے سب سرداروں کو جمع کیا تھا۔ عین اس وقت جب کہ مالک بن عجلان عرب اکابر کے ساتھ محوِ گفتگو تھا حسین اور نوخیز قنطورا بالکل ننگی اور برہنہ حالت میں حویلی کے اندر سے نکلی اور ان کے پاس سے گزرتی ہوئی دوبارہ حویلی کے اندر چلی گئی۔ غصے میں مالک بن عجلان کا رنگ سُرخ ہو گیا تھا جب کہ سارے عرب سرداروں کی نگاہیں جُھک گئی تھیں۔

مالک بن عجلان نے اپنے پہلو میں بیٹھے ہوئے روبیل کی طرف دیکھا۔ وہ اداس اور افسردہ گہری سوچوں میں کھویا ہُوا تھا اور اس کی گردن خوب خم تھی۔ مالک بن عجلان چند لمحوں تک وہاں بیٹھ کر اپنے ہونٹ کاٹتا رہا پھر اس نے روبیل کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "روبیل! روبیل! تم ذرا میرے ساتھ آؤ۔"

روبیل کھڑا ہو گیا۔ اتنے میں بنو سالم کے سردار نے مالک بن عجلان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "تم دونوں یہاں سے جاتو رہے ہو لیکن قنطورا کے خلاف کوئی قدم اٹھانے سے پہلے خوب سوچ لینا کہ وہ سب قبائل کی عزت ہے اور اگر اس واقعہ کو اُچھالا گیا تو یثرب کے عربوں کی خوب رسوائی ہوگی۔

مالک اور روبیل وہاں سے ہٹ کر حویلی کے اندرونی حصّے کی طرف جانے ہی والے تھے کہ قنطورا ایک بار پھر حویلی سے باہر آئی۔ اب وہ کپڑے پہن چکی تھی۔ مالک بن عجلان نے اس کی طرف دیکھا اور غضب ناک ہو کر کہا "تو اس قابل ہے کہ تیری گردن کاٹ دی جائے۔ تجھے شرم و حجاب نہ آیا کہ تُو اپنے بھائی اور اپنے ان سب عرب احباب کے سامنے سے دانستہ طور پر ننگی اور برہنہ ہو کر گزری۔ مَیں تجھے اس بے حجابی اور بے حمیتی کی سزا ضرور دوں گا۔"

قنطورا نے بھی غصّے کی حالت میں کہا۔ "مجھے ضرور سزا دو لیکن اس کے ساتھ ساتھ اپنی سزا بھی تجویز کر رکھو کہ تم وہ لوگ ہو جو خود شادی کی پہلی رات اپنی بیٹیوں کو ننگا اور برہنہ ہونے کے لیے فسطیون کی خلوت گاہ میں بھیجتے ہو۔ فسطیون کے سامنے ننگی ہونے سے کیا یہ بہتر نہیں کہ مَیں اپنے بھائی احباب کے سامنے ننگی ہو جاؤں۔ تم نے میری برہنگی کی سزا تو تجویز کر دی ہے لیکن تم سب کی سزا کیا ہو گی جب آج شادی کے بعد تم مجھے فسطیون کے پاس بھیجو گے اور رات کو وہ تم عربوں کی عزت کو داغدار کرنے کے لیے اسے اپنے ہاتھوں سے برہنہ کر رہا ہو گا۔

تمہاری حمیت اِس وقت تو جوش و غضب میں آئی ہے جب مَیں برہنہ ہو کر تمہارے سامنے آئی لیکن اس وقت تم بے غیرت اور اندھے کیوں ہو جاتے ہو جب فسطیون تمہاری بیٹیوں کو ننگا کر کے ان کی عزّت و عصمت سے کھیلتا ہے۔ پہلے تم سب مِل کر اپنی بُزدلی اور بے حمیتی کی سزا تجویز کرو۔ اس کے بعد تم لوگ جو سزا مجھے دو گے مَیں ہنس کر قبول کر لوں گی۔

ایک بار ان سب کی گردنیں پھر جُھک گئی تھیں۔ قنطورا نے اس بار روبیل کو مخاطب کر کے کہا۔ "اخی روبیل آج اوروں کے ساتھ تمہاری گردن بھی کیوں جُھکی ہوئی ہے کیا چند روز قبل تمہاری حویلی میں کھڑے ہو کر مَیں نے یہ نہ کہا تھا کہ وہ لمحہ قبل از وقت مَیں لاؤں گی اور ایسا لاؤں گی کہ عربوں کی پشتیں اور نسلیں تک یاد رکھیں گے۔ مَیں نے اپنی برہنگی کی قربانی دے کر تمہارے ضمیر کو جھنجھوڑ دیا ہے اب یہ **تمہاری مرضی**

ہے چاہے تو دوبارہ اپنے اُوپر غفلت مسلّط کر لو۔ چاہے تو بیدار ہو کر فطیون کے خلاف کوئی عملی قدم اُٹھاؤ پر ایک بات یاد رکھنا میں شادی کے بعد فطیون کے پاس رات بسر کرنے کی بجائے موت کو ترجیح دوں گی۔

رویبل بھائی! تمہیں خصوصیت کے ساتھ مَیں نے اس لیے مخاطب کیا ہے کہ عربوں میں ایک تم ہی واحد سردار ہو جس سے اُمید کی جا سکتی ہے کہ وہ فطیون کے خلاف کوئی عملی قدم اُٹھانے کے لیے عربوں میں اُمید کی چنگاری پیدا کر سکتا ہے۔ آخر کو ایک روز تمہاری شادی بھی راحیل کے ساتھ ہوتی ہے کیا تم برداشت کر لوگے کہ راحیل ایک شب فطیون کی خلوت گاہ میں بسر کرے۔"

قنطورا جب خاموش ہوئی تو رویبل نے گردن سیدھی کی اور مالک بن عجلان کی طرف دیکھتے ہوئے اُس نے کہا۔ "مجھے کچھ کہنے کی اجازت ہے"۔ مالک نے بڑی سعادت مندی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ "تمہیں اس کی اجازت ہے تم جو کچھ کہنا چاہتے ہو میری اجازت کے بغیر ہی کہہ سکتے ہو۔ مَیں آج تک یہودیوں کے خلاف حرکت میں آنے سے تمہیں روکتا رہا۔ آج اور آج کے بعد اُن کے متعلق تم جو بھی فیصلہ کرو گے تمہیں میری تائید حاصل ہوگی"۔

رویبل مڑا اور وہاں بیٹھے ہوئے عرب اکابرین سے کہا۔ "آپ سب لوگ فی الحال اپنے روزمرہ کے کام میں لگ جائیں۔ بہر حال قنطورا کی شادی آج شام کو ضرور ہوگی کسی بھی بنا پر ہم اس شادی کو التوا میں نہ ڈالیں گے"۔ سب عرب سردار اُٹھ کر جب چلے گئے تو رویبل نے مالک اور قنطورا سے کہا۔ "تم دونوں یہاں بیٹھو اور میری بات سنو"۔

تینوں اُن نشستوں پر بیٹھ گئے جہاں سے عرب سردار اُٹھ کر گئے تھے۔ رویبل نے مالک کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "مالک! مالک! مجھے غور سے سنو! قنطورا نے جو کچھ کہا ہے اسے بھول جاؤ اس کے خلاف کوئی تادیبی کارروائی نہیں کی جائے کی اس نے جو کچھ کیا ہے ہماری آنکھیں کھولنے اور ہمیں غفلت سے بیداری کی طرف لانے کے

لیے درست ہی کیا ہے۔ آج جب قنطورا کی شادی ہوگی اور فطیون کے آدمی قنطورا کو لینے آئیں گے تو ہم دونوں بھی اپنا آپ ڈھانپ کر قنطورا کی سہیلیوں کے بھیس میں اس کے ساتھ ہو لیں گے اور جب قنطورا کو فطیون کی خواب گاہ میں پہنچایا جائے گا تو وہاں تک ہم بھی ساتھ جائیں گے اور موقع پا کر فطیون کو قتل کر دیں گے۔ اگر کسی نے ہمیں فطیون کو قتل کرتے دیکھ لیا تو ہم اُسے بھی قتل کر دیں گے اور رات کی تاریکی میں وہاں سے بھاگ کر ہم اپنے اپنے گھروں میں آجائیں گے۔

اس کے بعد تم لباس تبدیل کر کے اور گھوڑے پر سوار ہو کر میرے ہاں آجانا اس وقت تک مَیں بھی تیار ہو چکا ہوں گا۔ پھر ہم دونوں مل کر بنی قریظہ کے اس یہودی مہاجن کے پاس جائیں گے جس کا نام زبولون ہے اور جس سے میرے قبیلے والے قرضے لیتے رہتے ہیں۔ میرے قبیلے کی وہ بیوہ جس کی لڑکی نے چند روز پیشتر خودکشی کر لی تھی، وہ بھی اس کی مقروض ہے اور مَیں نے اس سے وعدہ بھی کر رکھا ہے کہ مَیں اس کے سارے قرضے ادا کر دوں گا۔ ہم دونوں اس بیوہ کے سارے قرضے چکا کر وہاں زبولون کے پاس بیٹھے رہیں گے۔

اب قنطورا کا کام شروع ہوگا۔ فطیون کے قتل کے بعد یہ اس کی خواب گاہ میں کچھ دیر تک خاموش بیٹھی رہے گی۔ جب اسے اندازہ ہو جائے گا کہ ہم لباس تبدیل کر کے زبولون کے ہاں پہنچ چکے ہیں تو یہ شور کرنا شروع کر دے گی کہ فطیون کے کمرے میں پہلے سے ہی تین آدمی چھپے بیٹھے تھے جنہوں نے فطیون کو قتل کر دیا اور کھڑکی کے راستے بھاگ گئے ہیں"۔

رویبل ذرا رکا اور دوبارہ کہنا شروع کیا۔ "قنطورا کے شور کرنے پر یقیناً یہودی قاتلوں کو تلاش کرنے کی کوشش کریں گے۔ ہم دونوں چونکہ اس وقت زبولون کے ہاں ہوں گے اس لیے ہم پر کوئی شک بھی نہ کر سکے گا۔ اس کے علاوہ زبولون ایک ایسا سودکار ہے جو یہودیوں کے اندر سب مہاجنوں سے زیادہ اثر و رسوخ رکھتا ہے۔ جب وہ یہ گواہی دے گا کہ ہم دونوں اس کے ہاں تھے تو یہودی اعتبا

کرلیں گے۔

اس کے علاوہ اس وقت یہودی فطیون کی موت پر خوفزدہ اور پریشان بھی ہوں گے اور انہیں زیادہ سوچنے کی مہلت بھی نہ ہوگی۔ گو ان کی قوت زیادہ ہے پھر بھی فطیون کو وہ اپنا ستون سمجھتے ہیں اور اس کے بل بوتے پر ہی وہ عربوں سے زیادتیاں کرتے رہتے ہیں، اس کی موت پر وہ عربوں کی طرف سے بھی دہشت زدہ اور فکرمند ہوں گے اور معاملہ رفع دفع ہو جائے گا۔

روبیل جب خاموش ہوا تو مالک اور قنطورا دونوں بہن بھائی کے چہروں پر مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ روبیل نے بھی مسکراتے ہوئے پوچھا "کیسی تجویز ہے؟" مالک بن عجلان نے خوشی اور اطمینان کا اظہار کرتے ہوئے کہا "نہایت مناسب اور معقول تجویز ہے۔ اس پر اگر ہم عمل کرنے میں کامیاب ہو گئے تو آنے والی شب فطیون کی آخری رات ہو گی۔"

روبیل نے کہا "میں اب جاتا ہوں مجھے تھوڑی دیر تک کھیتوں میں کام کرنا ہے۔ جَو کی ایک کھیتی پک گئی ہے اسے اگر کاٹا نہ گیا تو دو ایک روز تک اس کے خوشے گرنا شروع ہو جائیں گے۔"

مالک بن عجلان نے اس کا ہاتھ تھامتے ہوئے کہا۔ "آج جَو کاٹنے موقوف کرو۔ یہیں رہو، تمہارے یہاں ہونے سے مجھے حوصلہ اور دلیری ہوگی۔"

روبیل نے بھی مالک کا ہاتھ تھامتے ہوئے کہا "نہیں میرا جانا ضروری ہے پچھلے کئی روز سے راحیل ضد کر رہی تھی کہ ہم اسے اپنے باغات دکھائیں۔ آج وہ دونوں باپ بیٹی بھی ہمارے ساتھ ہمارے اس باغ میں کام کریں گے جو بیراویس کے قریب ہے۔ اگر تم ناگہانی طور پر میری ضرورت محسوس کرو تو وہاں سے مجھے بُلا لینا ویسے اُمید ہے کہ ایسی کوئی ——"

روبیل کہتے کہتے رُک گیا۔ کیوں کہ حویلی میں یہودہ داخل ہوا تھا اور روبیل کو مخاطب کر کے اس نے کہا "اخی! آپ تو یہ کہہ کر گھر سے آئے تھے کہ میں ابھی آتا

ہوں اور یہاں ایسے بیٹھے ہیں جیسے کوئی کام ہی نہ۔"

روبیل کھڑا ہوتا ہوا بولا "کیا ماں، زرعہ، راحیل اور عم عجیل باغ کی طرف چلے گئے ہیں" —— "کہاں گئے ہیں یہ حویلی سے باہر کھڑے آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔"

روبیل اُٹھا، حویلی کے اصطبل سے بندھا ہوا اس نے اپنا گھوڑا کھولا اور یہودہ کے ساتھ جب وہ حویلی سے باہر نکلا تو اس نے دیکھا اس کی ماں زمران، یہودہ کے گھوڑے پر سوار تھی جب کہ عجیل اور راحیل دونوں باپ بیٹی اپنے بکریوں کے ریوڑ کو وہاں روکے ہوئے تھے اور زرعہ بھی اس کام میں ان کی مدد کر رہی تھی۔ روبیل اپنے گھوڑے کی باگ پکڑے راحیل کے پاس آیا اور اُسے کہا۔

"راحیل! راحیل! تم اور زرعہ دونوں میرے گھوڑے پر بیٹھ جاؤ۔ ریوڑ کو اب ہم سنبھال لیں گے"۔ راحیل اور زرعہ گھوڑے پر بیٹھ گئے جب کہ عجیل کے ساتھ مل کر روبیل اور یہودہ ریوڑ کو ہانکنے لگے تھے۔ اس طرح وہ شہر سے نکل کر بیراویس کی طرف جا رہے تھے۔

بیراویس کے قریب آ کر وہ رُک گئے اور ریوڑ کو پانی پلانے لگے تھے۔ یہ کنواں قبا سے دو سو فٹ مغرب کی جانب ہے اور یہ وہی کنواں ہے جس کے اندر اسلامی دور میں حضرت عثمانؓ کی انگوٹھی گر گئی تھی۔ یہ انگوٹھی وہی تھی جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دستِ مبارک میں ہوا کرتی تھی۔ اُن کے بعد یہ انگوٹھی حضرت ابوبکرؓ اور پھر حضرت عمر فاروقؓ کے پاس اور آخر میں حضرت عثمان غنیؓ کو ملی۔

ایک روز حضرت عثمانؓ بیراویس پر بیٹھے حسبِ عادت انگوٹھی انگلی میں پھرا رہے تھے کہ کنوئیں میں گر گئی۔ مسلسل تین روز تک کنوئیں کا سارا پانی خشک کر کے انگوٹھی کو تلاش کیا گیا مگر وہ نہ ملنی تھی نہ ملی۔ جس طرح حضرت سلیمانؑ کی انگوٹھی گم ہونے سے ان کی مملکت میں افراتفری اور انتشار برپا ہو گیا تھا اسی طرح حضرت عثمانؓ سے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اس انگوٹھی کا گم ہونا تھا کہ عالمِ اسلام

میں فساد و فتنوں کا طوفان اُٹھ کھڑا ہوا اور مسلمانوں کا شیرازہ تار تار ہو کر بکھر گیا۔ ۱۹۵۹ء تک اس کنوئیں میں پانی موجود تھا مگر ۱۹۶۴ء میں اس کا پانی خشک ہو گیا۔

اسلامی دور میں اینٹوں کی سیڑھیوں کی جگہ لوہے کی سیڑھیاں لگا دی گئی تھیں اور لوگ کنوئیں کی زیارت کے لیے ان سیڑھیوں سے نیچے اترا کرتے تھے کیونکہ اس کنوئیں سے حضورؐ آشر پانی پیا کرتے تھے۔ ۱۹۶۸ء تک اس کنوئیں کے آثار باقی تھے لیکن بعد میں ایک سڑک کی توسیع کی زد میں آ گیا۔ آج کل اس کے آثار معدوم ہیں۔

ریوڑ کو پانی پلانے کے بعد روبیل سب کے ساتھ اپنے باغ میں آیا۔ وہاں دور دور تک بلند و بالا کھجوریں کھڑی تھیں اور کھجوروں کے اندر گندم اور جَو کی فصلیں کھڑی تھیں۔ جَو پک چکے تھے لیکن گندم ابھی ہری تھی۔ ریوڑ کو انہوں نے چرنے کے لیے باغ کے اس حصّے میں کھلا چھوڑ دیا جہاں فصل نہ تھی۔

روبیل، یہودہ اور عجیل جَو کاٹنے لگے تھے جب کہ راحیل، زمران اور زرعہ جَو کے گٹھے بنا بنا کر اس ہموار اور سخت میدان میں ڈھیر کرنے لگی تھیں جو کھجوریں خشک کرنے کے لیے بنایا گیا تھا۔ سہ پہر تک انہوں نے جَو کاٹ کر گٹھے باندھ دیے اور پھر ان گٹھوں پر اس خیال سے پتھر رکھ دیے گئے کہ ہوا سے کھلیان اُڑ نہ جائے۔

کام سے فارغ ہونے کے بعد روبیل نے زمران سے کہا "ماں! تم لوگ گھر چلو۔ راحیل اور عم عجیل کو ساتھ لے کر جانا، یہ نہ صرف کھانا ہمارے ہاں کھائیں گے بلکہ رات بھی وہیں رہیں گے۔ میں اپنے بیر غرس کے باغ کی طرف چکر لگا کر سیدھا گھر آتا ہوں۔ وہاں بھی جَو میں اگر وہ پک گئے ہوئے تو کل انہیں بھی کاٹ لیں گے۔"

روبیل اپنے گھوڑے پر سوار ہو کر بیر غرس کی طرف چلا گیا جو وہاں سے نصف میل کے فاصلے پر شمال مشرق کی طرف تھا۔ راحیل، زمران، زرعہ، عجیل اور یہودہ ریوڑ کو ہانکتے ہوئے شہر کی طرف جا رہے تھے۔

جب وہ بیر اولیس کے پاس آتے تو انہوں نے دیکھا۔ وہاں بہت سے لوگ جمع تھے اور کنوئیں کے اردگرد کئی ریوڑ کھڑے تھے۔ ایک جگہ گول دائرے

کی شکل میں عرب مرد اور عورتیں جمع تھے۔ راحیل ریوڑ کو اس کچّے حوض سے پانی پلانے لگی جس میں ہر وقت پانی جمع رہتا تھا۔ یہودہ، زمران، عجیل اور زرعہ اس طرف بڑھے جہاں لوگوں کا جمگھٹا ہو رہا تھا۔ یہودہ ہجوم کو چیر کر جب اندر گیا تو اس نے دیکھا وہاں ننگی زمین پر ایک بوڑھی عورت کی لاش پڑی تھی اور وہ خون میں لت پت تھی۔

یہودہ نے قریب کھڑے ایک بوڑھے سے پوچھا۔ "یہ خاتون کون ہے اور اسے کس نے قتل کیا ہے؟" اس بوڑھے نے اپنی بھیگی پلکیں اپنے عمامے کے پلو سے خشک کرتے ہوئے انتہائی بے بسی اور مایوسی میں کہا۔

"یہ عرب ہے اور بنو واقف سے ہے۔ کنوئیں پر اس کا ریوڑ پانی پی رہا تھا کہ اُوپر سے دو یہودی اپنا ریوڑ لے آئے انہوں نے زبردستی اس بوڑھی خاتون کے ریوڑ کو ہانک کر پیچھے ہٹا دیا اور اپنے ریوڑ کو پانی پلانے لگے۔ اس مرنے والی خاتون نے جب اعتراض کیا تو ان دونوں نے اسے اس قدر مارا کہ یہ بے بسی کی حالت میں مر گئی۔ یہ بے چاری آج ہی ریوڑ کے ساتھ آئی تھی۔ ریوڑ اس کا پندرہ سالہ بیٹا چرایا کرتا تھا، وہ بے چارہ کل بیمار ہو گیا اور مجبوراً اس خاتون کو ریوڑ کے ساتھ آنا پڑا۔"

یہودہ نے غضب و غیض کی حالت میں پوچھا۔ "وہ یہودی جوان کہاں ہیں؟" اس بوڑھے عرب نے کنوئیں کے قریب ہی کھڑے دو یہودیوں کی طرف اشارہ کیا۔ یہودہ وہاں سے نکل کر کنوئیں کے قریب کھڑے ان دونوں جوانوں کی طرف بڑھا۔ ان کے قریب جا کر یہودہ نے غصیلی آواز اور زہریلے لہجے میں پوچھا "تم دونوں نے اس بوڑھی عورت کو کیوں مار دیا ہے؟"

ان میں سے ایک نے کہا۔ "وہ ہمارے ساتھ اُلجھی تھی اور ہمارے ریوڑ کے پانی پلانے میں حائل ہوئی تھی"۔ یہودہ نے ان کی طرف خوفناک انداز میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔ "پہلے اس کا ریوڑ پانی پی رہا تھا۔ تم نے اس کا ریوڑ زبردستی ہٹا کر اپنے ریوڑ کو کیوں پانی پلانا شروع کر دیا تھا؟"

اس یہودی نے ہٹ دھرمی اور بدمعاملگی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا "یہ ہمارا حق تھا اور پھر تم ہم سے استفہامیہ انداز میں کیوں پوچھ رہے ہو۔ تم ہمارے محتسب نہیں ہو کہ ہم تمہارے سامنے جواب دہ ہوں۔ اس بوڑھی اور ضعیف عورت کا قتل کوئی اتنا اہم نہیں ہے۔ اگر ہم اسے نہ مارتے تو چند یوم بعد وہ اپنی موت آپ مر جاتی۔

یہودہ نے غصّے کی حالت میں ایک زوردار طمانچہ اس یہودی کے مُنہ پر مارتے ہوئے کہا "تو ایسی قدرت تو نہیں رکھتا کہ عربوں پر مظالم کو اپنا حق جانے۔ تُو نے میری ایک عرب ماں کو قتل کیا ہے میں تیری کھال اُدھیڑ کر رکھ دوں گا۔ اور تجھ سے اس کے قتل کا قصاص لوں گا۔ اس کے ساتھ ہی یہودہ نے ایک سخت جھٹکے کے ساتھ اپنی تلوار کھینچی اور اس کی گردن کاٹ دی۔

دوسرا یہودی زقند لگا کر پیچھے ہٹ گیا اور فوراً اپنی تلوار نیام سے نکال کر دوبارہ آگے بڑھا اور یہودہ پر حملہ آور ہُوا۔ لیکن اس وقت تک یہودہ اس کے ساتھی کو قتل کر کے اس سے نمٹنے کو تیار ہو چکا تھا۔ لوگوں کے ہجوم سے زمران، عجیل اور زرعہ نے نکل کر یہودہ کو اس لڑائی سے روکنا چاہا لیکن جب وہ اس کے پاس پہنچے تو یہودہ نے دوسرے یہودی کی گردن بھی کاٹ کر اس کے جسم سے علیحدہ کر دی تھی۔ راحیل کو ابھی تک اس لڑائی کی خبر نہ ہوئی تھی کیوں کہ اس کے اور یہودہ کے درمیان لوگوں کا ہجوم حائل تھا لہٰذا وہ بڑے سکون سے اپنے ریوڑ کو پانی پلا رہی تھی

دو یہودی جوانوں کے قتل ہونے پر وہاں کھڑے بیس پچیس کے قریب یہودی جوان پِل پڑے اور اپنی تلواریں سونت کر یہودہ کی طرف بھاگے۔ زمران، عجیل اور زرعہ نے آگے بڑھ کر یہودہ کو ان سب سے بچانا چاہا لیکن وہ یوں حملہ آور ہوئے تھے جیسے بھوکے سُور اپنے باڑے سے نکلتے ہیں۔ یہودہ نے مقابلے کرنے کی کوشش کی لیکن اتنے لوگوں کے سامنے وہ بے چارہ اکیلا کیا کرتا اور حملہ آور یہودیوں نے یہودہ کے ساتھ ساتھ زمران، عجیل اور زرعہ کو بھی موت کے گھاٹ اتار دیا تھا۔ وہاں کھڑے

سارے عرب ایسے خوفزدہ ہو گئے تھے کہ ان میں سے کسی ایک کو بھی جرأت نہ ہوئی کہ آگے بڑھ کر یہودہ کا دفاع کرتا۔

جب ریوڑ پانی پی کر پیچھے ہٹ گیا تو راحیل، یہودہ، زمران، عجیل اور زرعہ کو بلانے اُس طرف آئی جہاں لوگ جمع ہو رہے تھے۔ اس وقت حملہ آور یہودی اپنا کام کر کے پیچھے ہٹ گئے تھے اور اب وہ اس خدشے کے تحت کہ وہاں کھڑے عرب کہیں بپھر کر ان پر حملہ آور نہ ہو جائیں اپنے اپنے ریوڑ ہانک کر وہاں سے کھسکنے کی کوشش کرنے لگے تھے۔ راحیل جب اس جگہ آئی جہاں اس کے باپ کے علاوہ یہودہ، زمران اور زرعہ کی لاشیں خون میں لت پت پڑی تھیں تو وہ بے چاری بھاگ کر آگے بڑھی اور ایک ایک لاش سے لپٹ لپٹ کر دھاڑیں مار مار کر رونے لگی تھی۔

عین اُسی وقت شمال مشرق کی طرف سے روبیل اپنا گھوڑا سرپٹ دوڑاتا ہُوا آیا تھا۔ کنوئیں کے قریب آ کر جب اس نے لاشیں بکھری ہوئی دیکھیں تو اس کا رنگ فق ہو گیا۔ وہ جب گھوڑے سے اُتر کر آگے بڑھا تو اس نے دیکھا راحیل یہودہ کا سر اپنی گود میں لیے بیٹھی تھی اور دھاڑیں مار مار کر رو رہی تھی اس کے سارے کپڑے بھی خون آلود ہو رہے تھے۔ راحیل نے جب سر اُٹھا کر روبیل کو اپنے سر پر کھڑے دیکھا تو وہ بے چاری اور زیادہ بے تاب ہو کر رونے لگی تھی۔ وہاں کھڑے سارے عرب روبیل کے گرد جمع ہو گئے اور قبل اس کے روبیل کچھ پوچھتا وہی بوڑھا جس نے یہودہ سے گفتگو کی تھی آگے بڑھا اور روبیل سے ساری داستان کہہ دی تھی۔

رستم کی پوری داستان سننے کے بعد روبیل نے وہاں کھڑے عربوں کو مخاطب کر کے کہا "اے اوس و خزرج! حیف! صد حیف! تمہاری بے بسی اور بزدلی پر یہودی قتل کرتے رہے اور تم خاموش کھڑے رہ کر تماشہ دیکھتے رہے میں پوچھتا ہوں کب تک تم لوگ پتھروں سے پانی تلاش کرتے رہو گے۔ کب تک تم یہودیوں کے اندر پَر شکستہ چڑیا کی طرح یاس و قنوط اور شدید نا اُمیدی میں ڈوبے رہو گے۔ اے اوس و خزرج کے فرزندانِ ازل! کب تک تمہاری روح

میں تڑپ اور قلب میں حرارت پیدا ہو گی۔ اپنے اُوپر مسلط خاموشی کی بُکل کو اُتار پھینکو اور زندگی کی حرارت اور توانائی سے کام لے کر تازہ سفر کا آغاز کرو۔ اگر تم یوں ہی خاموش رہ کر اپنے عرب بھائیوں کا قتلِ عام دیکھتے رہے تو یاد رکھو ایک روز وہ بھی آئے گا کہ یثرب کے یہودی تمہاری نسلیں تک مٹا دیں گے تاریخ کے بوسیدہ اوراق میں تمہاری حیثیت ایک بُزدل اور بے حمیت قوم کی سی ہو کر بکھر جائے گی۔"

روبیل ذرا رکا پھر انتہائی کرب آمیز اور جاں گسل لہجے میں اس نے کہا۔ "اے اوس و خزرج! قاتل یہودی بچ کر یثرب میں داخل نہ ہونے پائیں، آؤ ضرب قوی اور برق شکن بن کر ان سے انتقام لیں۔ اگر تم میرے ساتھ متحد ہو گئے تو میں فتح کی نوید اور انقلاب آفریں پیغام کی خبر دوں گا۔"

اپنے گھوڑے کو وہیں چھوڑ کر روبیل اپنی تلوار بے نیام کرتا ہوا بولا۔ "آؤ میرے ساتھ، میں دیکھتا ہوں وہ ہم سے کیسے بچ سکتے ہیں۔ عرب جو تھوڑی دیر قبل تک یہودیوں کے سامنے خوف و دہشت کا شکار تھے زور زور سے یہودیوں کے خلاف نعرے بلند کرنے لگے تھے۔ لگتا تھا انہوں نے روبیل کے کہنے پر غم و حسرت کی نقاب اُتار پھینکی ہو اور وہ وحشیانہ انداز میں اپنی تلواریں بے نیام کرتے اور شور برپا کرتے ہوئے ایک انوکھے نشے اور نادیدہ اشتیاق میں روبیل کے ساتھ ہو لیے تھے۔ روبیل ان کے آگے آگے تھا اور سب عرب اس کے پیچھے پیچھے ان یہودیوں کی طرف بھاگے تھے جو کنوئیں کے پاس اپنے ریوڑ سمیٹ رہے تھے۔

یہودیوں نے جب عربوں کو روبیل کی سرکردگی میں اپنی طرف بھاگتے دیکھا تو اپنے ریوڑ چھوڑ کر انہوں نے اپنی تلواریں سونت لیں اور ایک جگہ جمع ہو گئے لیکن غصّے اور انتقام کی آگ میں بپھرے ہوئے روبیل اور اس کے ساتھیوں نے آتے ہی ان پر اس قدر خشونت اور قہرمانیت کے ساتھ حملہ کیا تھا کہ یہودی جارحیت تو ایک طرف اپنے دفاع تک کے سارے قاعدے اور اصول بھول گئے تھے۔

عربوں نے ایک ایک یہودی کے جسم کو کئی کئی ٹکڑوں میں کاٹ کر رکھ دیا تھا۔ سارے یہودیوں کو ختم کرنے کے بعد روبیل نے عربوں سے کہا کہ وہ اپنے ریوڑ لے کر اپنے اپنے گھروں کو چلے جائیں۔ لہٰذا سب عرب واپس آئے اور اپنے اپنے ریوڑ کو شہر کی طرف ہانکنے لگے تھے۔ روبیل اس جگہ آیا جہاں لاشیں پڑی تھیں۔ اس نے دیکھا وہاں راحیل بیٹھی ابھی تک رو رہی تھی۔

جب روبیل اس کے پاس آیا اور راحیل نے اسے خون آلود کپڑوں میں دیکھا تو وہ تڑپ کر اُٹھ بیٹھی اور اپنے آنسو پونچھتے ہوئے اس نے تشویشناک لہجے میں پوچھا "آپ زخمی تو نہیں ہیں؟" روبیل نے اُسے حوصلہ دلاتے ہوئے کہا "نہیں یہ قتل ہونے والے یہودیوں کا خون ہے۔ ہم نے سب کو ٹھکانے لگا دیا ہے۔" روبیل نے باری باری لاشوں کو اُٹھایا اور انہیں وہ اپنے اور یہودہ کے گھوڑے پر رکھنے لگا تھا۔

راحیل کو نہ جانے کیا سوجھی وہ بھاگ کر آگے بڑھی اور روبیل کی پُشت سے لپٹتے ہوئے اس نے کہا "آپ یہاں سے بھاگ جائیے! میں ان لاشوں کو سنبھال لوں گی۔ خدا کے لیے آپ بھاگ کر اپنی جان بچائیے ورنہ یہودی آپ سے انتقام لیں گے۔ میں آپ کی ماں، بہن، بھائی اور اپنے باپ کا غم تو سہہ گئی ہوں لیکن آپ کو اگر کچھ ہو گیا تو میں برداشت نہ کر سکوں گی۔ زندہ درگور ہو جاؤں گی۔"

روبیل جب خاموش رہا تو راحیل نے اسے کندھوں سے پکڑ کر جھنجھوڑتے ہوئے کہا "آہ میرے حبیب! آپ میری زندگی کی حرارت اور میری گویائی ہیں۔ اگر یہودیوں نے آپ کو مجھ سے چھین لیا تو میں بے وطن طیور کی طرح یثرب کے صحراؤں میں بھٹک بھٹک کر مر جاؤں گی۔" پھر اچانک راحیل نیچے بیٹھ گئی اور روبیل کے پاؤں پکڑ کر اس نے روتی اور سسکتی ہوئی آواز میں کہا "بھاگ جائیے، اللہ کے واسطے بھاگ کر اپنی جان بچائیے۔"

روبیل مُڑا اور زمین پر بیٹھی ہوئی راحیل کو شانوں سے پکڑ کر اُوپر اُٹھاتے

ہوئے اس نے کہا" راحیل ! راحیل ! میں یثرب میں تمہیں تنہا چھوڑ کیوں بھاگ جاؤں" راحیل نے اپنے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔ "چلیے میں بھی آپ کے ساتھ چلتی ہوں۔ اب ہم یثرب میں نہیں رہیں گے۔ یہاں ہر وقت موت ہمارے سروں پر منڈلاتی رہیگی۔

روبیل نے سوچتے ہوئے کہا" نہیں راحیل ! ہم یہاں سے بھاگیں گے نہیں۔ آج رات میرے اور مالک بن عجلان کے ذمہ ایک ایسا کام ہے اگر ہم اس میں کامیاب ہوگئے تو فطیون کی لعنت سے ہمیشہ کے لیے ہمیں نجات مل جائے گی اور اپنی قوم کی خاطر اپنی زندگی داؤ پر لگا کر بھی میں یہ کام کروں گا۔"

پھر روبیل نے راحیل کی پیٹھ پیار سے تھپتھپاتے ہوئے کہا" چلو راحیل گھر چلیں اور لاشوں کو دفنا کر تبان کے محل میں چاندی کے صندوق کے پاس بیٹھ کر دعا کریں ابراہیمؑ کا خدا اپنے آنے والے صحرائی رسولؐ کے صدقے میں ہماری مدد و حمایت کریگا تم فکر مند نہ ہو راحیل ! میرا دل کہتا ہے کوئی ہمیں ہاتھ نہ ڈال سکے گا۔ چلو گھر چلیں آج سے تم میرے ساتھ میرے گھر میں رہو گی، اپنا ریوڑ بھی وہیں لے چلو کل سے میں تمہارے اس ریوڑ کو بنو نجار کے متحدہ ریوڑ میں شامل کر لوں گا۔ آج کے بعد تم ریوڑ چرانے نہ جایا کرو گی گھر میں رہا کرو گی۔ تم ریوڑ کو ہانک کر لاؤ میں لاشوں کو لے کر گھر چلتا ہوں"۔

راحیل نے ہار مانتے ہوئے کہا" اگر آپ کی یہی رضا ہے تو مجھے بھی منظور ہے۔ اگر کوئی مصیبت آئے گی تو دونوں پر اکٹھی ہی آئے گی" روبیل جب دونوں گھوڑوں کی باگیں پکڑ کر چلنے لگا تو راحیل نے اس کا بازو پکڑتے ہوئے کہا۔ آپ ابھی یہیں رُکیے۔ میں ریوڑ کو ہانک لاؤں، پھر اکٹھے چلتے ہیں، میں آپ کو تنہا نہ جانے دوں گی اپنے ساتھ لے کر جاؤں گی۔

راحیل اپنے ریوڑ کو ہانک اس جگہ لائی جہاں روبیل دونوں گھوڑوں کی باگیں پکڑے کھڑا تھا۔ دونوں گھوڑوں میں ایک پر زمران، زرعہ اور بنو واقف کی بوڑھی عورت اور دوسرے پر یہودہ اور عجیل کی لاشیں رکھی ہوئی تھیں۔ دونوں جب

شہر میں داخل ہوئے تو اوس و خزرج کے آن گنت مسلح جوان ان دونوں کی حفاظت کے لیے ان کے گرد جمع ہو گئے تھے۔ شاید وہ عرب جنہوں نے یہودیوں کو قتل کرنے میں روبیل کی مدد کی تھی وہ پہلے ہی عربوں کو اس سانحہ کی اطلاع کر چکے تھے۔ بکریوں کو ہانکتے ہوئے راحیل روبیل کے پاس آئی اور کسی قدر سکون محسوس کرتے ہوئے اس نے کہا۔" یہاں تو ہر جوان ہماری حمایت میں مسلح ہو رہا ہے۔ آپ کا نہ بھاگنے کا فیصلہ مناسب اور درست تھا۔ اپنے اس قدر مسلح عرب بھائیوں کے اندر اب میں محسوس کر رہی ہوں کہ ہم دونوں محفوظ ہیں اور یثرب میں ہمیں یہودیوں سے کوئی خطرہ نہیں ہے"۔

روبیل نے اسے تسلی دینے کی خاطر کہا۔" تم فکر مند اور غمزدہ نہ ہونا راحیل! اوس و خزرج کے اس قدر مسلح جوانوں کی موجودگی میں یہودی آسانی کے ساتھ ہم دونوں پر چڑھائی نہ کر سکیں گے"۔

اوس و خزرج کے مسلح جوانوں کے جمگھٹے میں جب روبیل اور راحیل حویلی میں داخل ہوئے تو انہیں حیرت ہوئی کہ حویلی کا صحن بنو نجار کے مسلح جوانوں سے بھرا ہوا تھا۔ جب وہ اندر گئے تو کچھ جوان آگے بڑھے اور بکریوں کو پکڑ پکڑ کر صحن میں باندھنے لگے تھے۔ روبیل اور راحیل کچھ اور جوانوں کی مدد سے لاشوں کو گھوڑوں سے اُتار کر چارپائیوں پر ڈالنے لگے تھے جب کہ حویلی کے چاروں طرف باہر گلی میں اوس و خزرج کے مسلح جوان پھیل کر روبیل اور راحیل کی حفاظت کے لیے پہرہ دینے لگے تھے۔

یثرب کا ابلیس فطیون اپنی حویلی کے دیوان خانے میں یہودی سرداروں اور زعما کے ساتھ بیٹھا روبیل کے ہاتھوں مارے جانے والے بیس پچیس یہودی جوانوں کی موت کے متعلق گفتگو کر رہا تھا اور دیوان خانے سے باہر کچھ مسلح یہودی کھڑے پہرہ دے رہے تھے کہ اوس و خزرج کا سردار مالک بن عجلان اپنے گھوڑے کو بھگاتا

ہوا حویلی میں داخل ہوا۔ شاید اسے خبر ہو گئی تھی کہ یہودی روبیل کے متعلق کوئی فیصلہ کرنے کے لیے فطیون کے ہاں جمع ہیں لہٰذا وہ دیوان خانے کے قریب آ کر اپنے گھوڑے سے اُترا اور وہاں کھڑے مسلح پہریداروں میں سے ایک کو مخاطب کر کے اس نے کہا۔

"فطیون سے کہو کہ مالک بن عجلان آیا ہے اور وہ علیحدگی میں صرف چند لمحوں کی گفتگو کرنا چاہتا ہے۔" وہ پہریدار دیوان خانے کا دروازہ کھول کر اندر چلا گیا تھا۔ تھوڑی دیر بعد فطیون باہر نکلا اور مالک بن عجلان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "تم باہر کیوں کھڑے ہو گئے اندر آ جاتے اس گھر میں تم سے کوئی پردہ نہیں۔"

مالک نے حویلی کے باغ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "ذرا اس طرف آئیے میں ذرا علیحدہ میں کچھ کہنا چاہتا ہوں۔" فطیون سیڑھیاں اُتر کر باغ کی طرف ہو لیا۔ مالک بھی اس کے ساتھ تھا۔ کھجور کے ایک درخت سے ٹیک لگاتے ہوئے فطیون نے پوچھا۔ "کہو کیا کہنا چاہتے ہو۔" مالک نے عاجزی اور مسکنت میں کہا۔ "دراصل میں یہ بتانے آیا تھا کہ کن ناگزیر حالات میں روبیل اور چند عربوں کے ہاتھوں یہودی جوان قتل ہوئے ہیں۔ وہ بے چارہ بے گناہ ہے۔ اس کے ہاتھوں مرنے والوں نے پہلے بنو واقف کی ایک بوڑھی عورت کو مارنے کے علاوہ اس کے بھائی، اس کی ماں اور بہن کے ساتھ اس کے ہونے والے سُسر کو بھی قتل کر دیا تھا۔"

فطیون نے چونکتے ہوئے پوچھا۔ "اس کی شادی کس سے ہونے والی ہے؟"

"بنو سالم کے عجیل کی بیٹی راحیل کے ساتھ۔" فطیون نے دلچسپی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ "میرے خیال میں وہ عربوں ہی میں نہیں بلکہ یثرب کی سب سے حسین اور پرکشش لڑکی ہے۔ میں ایک عرصے سے آس لگائے بیٹھا تھا کہ اس کی شادی ہو۔ تم فوری طور پر ان دونوں کی شادی کا انتظام کرو۔"

مالک بن عجلان نے کسی قدر مطمئن لہجے میں کہا۔ "میں کل ہی ان دونوں کی شادی کا بندوبست کر دیتا ہوں لیکن تم یہ وعدہ کرو کہ روبیل کے خلاف کوئی تادیبی اردوائی نہ کی جائے گی۔"

فطیون نے اپنے سر کو جھٹکتے ہوئے کہا۔ "میں جذبات میں یہ تو بھول ہی گیا تھا کہ وہ قاتل ہے اور سب یہودی زعما مجھ سے مطالبہ کر رہے ہیں کہ اسے قتل کر دیا جائے۔" مالک نے دھیمی آواز میں کہا۔ "اس کے قتل سے تمہیں کیا حاصل ہوگا۔ اگر ایسا ہوا تو راحیل خودکشی کر لے گی کیوں کہ وہ روبیل سے محبت کرتی ہے اور پھر یہ بھی سوچو کہ اس بے چارے کی ماں بہن کے علاوہ جوان اور اکلوتا بھائی بھی مارا گیا ہے۔ ان کے علاوہ اوس و خزرج کے جوان مسلح ہو کر اس کی حویلی کے اندر اور باہر پہرہ دے رہے ہیں۔ اس موقع پر اگر اس سے بازپرس کی گئی تو عربوں اور یہودیوں میں ایسی جنگ چھڑ جائے گی جیسی یثرب کے آسمان نے پہلے کبھی نہ دیکھی ہوگی اور اگر اطراف کے اکناف میں پھیلے ہوئے دوسرے عرب قبائل بھی اس جنگ میں کود گئے تو تم اندازہ لگا سکتے ہو کہ جنگ کی صورتِ حال کیسی خوفناک ہوگی۔"

فطیون نے پریشان آواز میں پوچھا۔ "کیا تم مجھے جنگ کی دھمکی دے رہے ہو؟"

مالک نے نرم لہجے میں کہا۔ "نہیں، میرا کہنے کا مطلب ہے کہ ایسا بھی ممکن ہے۔ اور پھر اس کے خلاف اگر تادیبی کارروائی کی گئی تو میرے سارے اخراجات اور انتظامات پر بھی پانی پھر جائے گا۔ کیونکہ آج شام میری بہن قنطورا کی شادی ہے اور روبیل کو کچھ ہو گیا تو یہ شادی روک دینی پڑے گی۔ جو اخراجات میں نے کیے ہیں اکارت جائیں گے۔"

مالک بن عجلان ہر طرح لوبھ اور لالچ دے کر فطیون کو اپنے جال میں پھنسانے کی کوشش کر رہا تھا۔ فطیون نے خوشی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ "اوہ! میں واقعی بھول ہی گیا تھا کہ آج تمہاری بہن قنطورا کی شادی ہے۔ اچھا اب مختصر کہو تم چاہتے کیا ہو؟"

مالک بن عجلان نے نہایت نرم آواز میں کہا۔ "میں چاہتا ہوں روبیل کو معاف کر دیا جائے کیوں کہ فساد کھڑا کرنے میں اس نے پہل نہیں کی اور پھر یہ بھی تو

سوچ رکھو کہ عرب اس بات سے بھی نالاں ہیں کہ ان کی بیٹیاں شادی کے بعد
پہلی رات تمہارے پاس بسر کرتی ہیں۔ روبیل کو اگر قتل کیا گیا تو وہ اور بپھر جا
گے۔ ہو سکتا ہے کچھ لوگ چھپ کر تم پر بھی حملہ کرنے کی کوشش کریں۔ اگر
مارے گئے تو جانو تمہارے بعد تمہارے اہلِ خانہ کی حالت کیا ہوگی۔ لوگ تمہاری
کی عزت بھی برباد کریں گے۔ مَیں کہتا ہوں جب کہ تم سب کچھ کر سکتے ہو
واقعہ کو یہیں دبا دو، اسی میں تمہاری اور میری بہتری ہے۔

مالک کے ڈرانے دھمکانے اور لوبھ والا لچ دینے کا ایسا اثر ہوا کہ فطیو
نے ہتھیار ڈالتے ہوئے کہا۔ مالک! مالک! تم درست کہتے ہو۔ روبیل کی زند
میں ہی میری فلاح ہے تم مطمئن ہو کر چلے جاؤ۔ مَیں سب یہودی زعماء کو سمجھا لو
ہوں۔ کوئی بھی روبیل سے کسی قسم کا تعرض نہ کرے۔"

فطیون وہاں سے ہٹ کر دوبارہ دیوان خانے میں چلا گیا تھا جبکہ مالک
بن عجلان مطمئن انداز میں اپنے گھوڑے پر سوار ہوا اور اسے بھگاتا ہوا حویلی سے
باہر نکل گیا تھا۔

روبیل کی حویلی سے باہر مالک بن عجلان نے اپنے گھوڑے کو روکا۔ وہاں کھڑے
ہو کر پہرہ دینے والے اوس خزرج کے جوانوں میں سے ایک نے بھاگ کر اس کے
گھوڑے کی باگ پکڑ لی۔ مالک بن عجلان گھوڑے سے اُترا اور تقریباً بھاگتا ہوا
جب وہ حویلی میں داخل ہوا تو اس نے دیکھا۔ چارپائیوں پر لاشیں پڑی تھیں اور
وہاں راحیل اوس و خزرج کی اَن گنت عورتوں کے ساتھ بیٹھی رو رہی تھی۔ ایک
ستون سے ٹیک لگا کر روبیل کھڑا تھا اس کی آنکھیں بند تھیں اور ان سے آنسو بہ
رہے تھے اور ان کے اِرد گرد بنو نجار کے نوجوان اپنے ہاتھوں میں ننگی تلواریں لے
چست و چوبند کھڑے تھے۔

مالک کی گردن غم اور دکھ میں جھک گئی تھی۔ آہستہ آہستہ وہ روبیل کی
طرف بڑھا۔ اس کی آنکھوں سے بھی آنسو بہہ نکلے تھے اور آگے بڑھ کر روبیل کو گلے
سے لگا لیا۔ مالک سے گلے ملنے پر روبیل بے چارہ اور زیادہ سسک پڑا اور اس کے
آنسو تیزی سے مالک کے شانے پر گرنے لگے تھے۔ مالک نے پہلے اپنی آنکھیں خشک
کیں پھر اپنے عمامے کے پلّو سے اس نے روبیل کے بہتے ہوئے آنسو پونچھتے ہوئے کہا
"میرے محسن! میرے بھائی! صبر کرو۔ مَیں جانتا ہوں یہ گھر خالی ہو گیا ہے لیکن قسم
ہے مجھے زمین و آسمان کے خالق کی، عنقریب وہ وقت آیا چاہتا ہے جب مَیں یہودیوں
کے گھروں میں بدترین تباہی اور اس سے کہیں زیادہ ہولناک ویرانی برپا کر دوں گا
مجھے یہاں آنے میں دیر ہوئی مَیں تمہارے سلسلے میں بات کرنے فطیون کے پاس
چلا گیا تھا وہاں سارے یہودی سردار بھی جمع تھے۔ مَیں نے فطیون کو علیحدہ بلا کر اس
سے گفتگو کی اور اسے اس امر پہ آمادہ کر لیا ہے کہ تمہارے خلاف کوئی بھی تادیبی
کارروائی نہ کی جائے گی۔

مالک بن عجلان نے ذرا رک کر روبیل سے کہا۔ "روبیل! روبیل! اگر تم
کہو تو اس حادثے کے افسوس میں قنطورا کی شادی ملتوی کر دی جائے۔"

روبیل نے چونک کر کہا۔ "نہیں نہیں! یہ شادی ضرور ہو گی اور آج کی
رات ہم فطیون کا بوجھ عربوں کے سر سے اُتار پھینکیں گے۔"

مالک نے روبیل کا ہاتھ تھامتے ہوئے کہا۔ "تو پھر آؤ مرنے والوں کی
تجہیز و تکفین کے بعد اپنی اصل مہم کی ابتدا کریں۔ دونوں وہاں سے ہٹے اور اوس
و خزرج کے جوانوں کے ساتھ مِل کر لاشوں کو دفن کرنے کا بندوبست کرنے لگے

ساری لاشوں کو دفن کرنے کے بعد روبیل اور راحیل گھر آئے۔ اب شام

ہو گئی تھی اور اندھیرا پھیل کر خوب گہرا ہو گیا تھا۔ اوس وخزرج کے جوان ابھی تک
کی حویلی کے اندر اور باہر پہرہ دے رہے تھے۔

اپنے کمرے میں کھڑا ہو کر روبیل کچھ دیر سوچتا رہا اور راحیل اس کے قر
کھڑی افسردہ افسردہ سی اسے دیکھے جا رہی تھی۔ پھر روبیل نے لکڑی کا ایک مر
کھولا اور اس میں سے اس نے اپنی ماں کا ایک لباس نکالا اور بغل میں دبا کر جیسے
کمرے سے باہر نکلنے لگا تو اداس کھڑی راحیل نے چونکتے ہوئے کہا۔

"ٹھہریے!" روبیل رک گیا۔ راحیل اس کے قریب آئی اور اس کے
کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے اس نے پوچھا۔ "آپ اس وقت کہاں جا رہے ہیں اور
اپنی ماں کا لباس آپ نے کیوں بغل میں دبا لیا ہے"

روبیل نے اس کی ڈھارس بندھاتے ہوئے کہا۔ "ابھی کچھ مت پوچھو را
دعا کرو جس کام کے لیے میں جا رہا ہوں اس میں مجھے کامیابی ہو تو واپس آ کر پور
داستان تم سے کہہ دوں گا"

راحیل نے روتی ہوئی آواز میں کہا۔ "آپ کے انداز بتا رہے ہیں کہ آ
کسی انتقامی کارروائی کے لیے جا رہے ہیں"۔ پھر راحیل نے روبیل کا بازو پکڑ لیا
پیچھے کھینچتے ہوئے اس نے کہا۔ "میں آپ کو رات کے اس وقت کہیں نہ جانے دو
گی، آرام سے گھر بیٹھئے میں اب آپ کو باہر نہ جانے دوں گی"

روبیل نے کپڑوں کی گٹھڑی مضبوطی سے بغل میں دبا لی اور پیار سے راحیل
گداز ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے اس نے کہا۔ "راحیل! راحیل! یہ نہ سوچنا
اپنی ذمہ داریوں سے آگاہ نہیں۔ میں جانتا ہوں تم اس دنیا میں تنہا رہ گئی ہو
تمہیں میری ضرورت ہے۔ یہی نہیں بلکہ مجھے بھی تمہاری ضرورت ہے۔ میں
ستون کو گرانے جا رہا ہوں جس کے گرنے کے بعد میں اور تم میاں بیوی کی حیثیت
سے پرسکون زندگی بسر کر سکیں گے۔ تم فکرمند نہ ہو، میں جانتا ہوں میں کس کا
ہوں لہذا میں اپنے آپ کو خطرات میں ڈالنے کی کوشش نہ کروں گا۔ میں مالک

عجلان کے ساتھ مل کر وہ کام ایسی ترکیب اور تدبیر سے کروں گا کہ ہم دونوں پر کوئی
حرف بھی نہ آ سکے گا اور ہمارا کام بھی ہو جائے گا۔

میں قنطورا کی شادی میں شرکت کے لیے جا رہا ہوں۔ پانچ انسانی جانوں کے
زیاں کے بعد یہ شادی یقیناً ملتوی ہو چکی ہوتی لیکن مجبوری کے تحت یہ شادی ہو رہی
ہے۔ حالات پُرسکون ہوتے تو اس شادی میں تمہیں بھی میں ساتھ لے کر جاتا لیکن
ان پُرآشوب لمحات میں تمہارا گھر کے اندر رہنا ہی بہتر ہے۔ میری غیر موجودگی میں
تم اپنے اوپر گھبراہٹ طاری نہ کر لینا۔ میں بہت جلد لوٹ آؤں گا۔ تم میری کامیابی
کی دعا بھی کرنا۔

راحیل کچھ کہنا چاہتی تھی کہ روبیل نے کمرے سے نکل کر اصطبل سے اپنا
گھوڑا لیا اور حویلی سے باہر نکل گیا تھا۔

عشاء کے تھوڑی دیر بعد قنطورا کی شادی کی رسم ادا ہوئی اور جب فطیون
کے آدمی اسے محافہ میں بٹھا کر لے جانے لگے تو روبیل اور مالک بن عجلان بھی زنانہ
کپڑوں میں اپنا آپ ڈھانپ کر اس کی سہیلیوں کے حیثیت سے اس کے ساتھ بیٹھ
گئے اور فطیون کے کہار انہیں اٹھا کر فطیون کی حویلی کو روانہ ہو گئے تھے۔

راستے میں روبیل نے مالک کے کان میں سرگوشی کرتے ہوئے کہا۔ "میں
تم سے ایک بات کہنا بھول گیا تھا۔" سنو! فطیون کو ٹھکانے لگانے کے بعد میں
بھی تمہارے ساتھ تمہاری حویلی میں آؤں گا اسی لیے میں اپنا گھوڑا وہیں چھوڑ
آیا ہوں اور وہاں سے لباس تبدیل کر کے ہم یہودی مہاجن کی طرف روانہ ہو جائیں
گے۔ میری حویلی میں چونکہ اپنے جوان پہرہ دے رہے ہیں اس لیے فطیون کو قتل
کر کے زنانہ لباس میں میرا وہاں جانا مناسب نہیں"۔ پالکی فطیون کی حویلی میں
داخل ہو گئی تھی لہذا روبیل خاموش ہو گیا تھا۔

کہار پالکی کو سیدھا فطیون کی خواب گاہ میں لائے۔ انہوں نے پالکی ایک
سجی ہوئی مسہری کے قریب رکھ دی اور جب وہ واپس جانے لگے تو روبیل اور

مالک طوفان کی طرح پالکی سے باہر نکلے۔ روبیل نے بھاگ کر خواب گاہ کا دروازہ بند کر دیا۔ پھر ایک جھٹکے کے ساتھ اس نے اپنی تلوار نکالی اور ان چاروں کہاروں کی گردنیں اس نے کاٹ دیں۔ اس وقت تک مالک اپنی تلوار کی نوک فطیون کی گردن پر رکھ کر کھڑا ہو گیا۔

قنطورا بھی پالکی سے نکل کر باہر آ گئی تھی۔ چاروں کہاروں کو ختم کرنے کے بعد روبیل فطیون کے پاس آیا اور قہر آلود انداز میں اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "ذلیل کتے! تم نے دیکھا آج تمہاری بداعمالیوں کے عوض قدرت نے کیسے تمہیں بے بس اور مجبور کر کے ہمارے سامنے کھڑا کیا ہے۔"

روبیل اور مالک نے نگاہوں نگاہوں میں ہی کوئی اشارہ کیا پھر مالک کی چمکدار تلوار بلند ہوئی گری اور فطیون کو دو حصّوں میں کاٹتی ہوئی نکل گئی تھی۔ روبیل اور مالک نے اپنی تلوار فطیون کے لباس سے پونچھ کر میان میں کر لیں۔ اور کھڑکی کے راستے وہ حویلی سے باہر کود گئے تھے۔

گہری تاریکی میں ڈوبی گلیوں میں دونوں واپس بھاگتے جا رہے تھے آسمان پر بادلوں کے تاریک وزنی ٹکڑے ایک دوسرے کے پیچھے بھاگ رہے تھے۔ چاند ابھی طلوع نہیں ہوا تھا اور تاریکی اپنے عروج اور جوبن پر تھی۔ کبھی کبھی کوئی صحرائی پرندہ دنیا کے آغاز اور ابتداء کے گیت گاتا ہوا یثرب کے اوپر سے گزر جاتا تھا۔ ان کی آوازوں سے چند لمحوں تک فضا میں ایک ارتعاش سا پیدا ہوتا اور دوبارہ فضا میں کسی اداس ریگست کی طرح مغموم اور ملول ہو کر رہ جاتی تھیں۔

مالک کی حویلی میں دونوں بھاگتے ہوئے واپس آئے۔ جلدی جلدی انہوں نے کپڑے بدلے اور اپنے گھوڑوں پر سوار ہو کر وہ حویلی سے باہر نکل گئے تھے۔ تھوڑی دیر بعد وہ یہودی مہاجن زبولون کی حویلی کے سامنے کھڑے تھے۔ دروازے پر دستک دینے سے قبل مالک نے روبیل کے کان میں سرگوشی کرتے ہوئے کہا۔

"یہ تم نے اچانک اپنا فیصلہ کیوں بدل لیا اور فطیون کے ساتھ تم نے

کہاروں کو بھی قتل کر دیا۔"

روبیل نے بھی سرگوشی کرتے ہوئے کہا۔ "مجھے بھی دیر سے اس کا خیال آیا تھا۔ ایسا کرنا ضروری تھا۔ اگر ہم اکیلے فطیون کو مارتے تو لوگ یہ بھی شک کر سکتے تھے کہ اسے قنطورا نے مروایا ہے۔ اب کہاروں کے ساتھ مرنے سے قنطورا پر کوئی شک کی گنجائش نہ رہے گی۔"

مالک نے خوش ہوتے ہوئے روبیل کی پیٹھ تھپتھپاتے ہوئے کہا۔ "تم نے نہایت دانشمندانہ قدم اٹھایا۔ زمین و آسمان کے مالک کی قسم، جس کا تم جیسا رفیق اور حبیب ہو اسے کوئی خطرہ کوئی خوف نہیں ہو سکتا۔"

مالک جب خاموش ہوا تو روبیل نے دروازے پر دستک دی۔ تھوڑی دیر بعد زبولون نے دروازہ کھولا اور ان دونوں کی طرف دیکھتے ہوئے اس نے کہا۔ "آج تم دونوں سردار میری طرف کیسے نکل آئے ہو۔" روبیل نے کہا۔ "بنو نجار کی وہ بیوہ جس کی بیٹی نے پچھلے دنوں خودکشی کر لی تھی۔ میں اس کا نام بھول گیا ہوں اس نے تم سے کچھ قرض لے رکھا تھا میں وہ ادا کرنے آیا ہوں۔"

زبولون نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔ "اندر آ جاؤ۔ میں تمہارے لیے دیوان خانے کا دروازہ کھولتا ہوں پھر حساب لگا کر بتاتا ہوں اس کے ذمہ کتنی رقم ہے۔"

زبولون نے دیوان خانے میں ان دونوں کو بٹھایا۔ پھر اس نے اس بیوہ کی رقم بتائی جو روبیل نے ادا کر دی اور جب وہ وہاں بیٹھے باتیں کر رہے تھے تو زبولون کا جاننے والا ایک یہودی بھاگتا ہوا آیا اور زبولون سے کہا۔

"غضب ہو گیا، فطیون کو کسی نے قتل کر دیا ہے۔ آج جب مالک بن عجلان کی بہن قنطورا کو اس کی خواب گاہ میں پہنچایا گیا تو کچھ دیر بعد وہ چیختی ہوئی خواب گاہ سے باہر نکلی اور لوگوں سے کہا کہ فطیون کو کسی نے قتل کر دیا ہے۔ قنطورا کا کہنا ہے۔ کہ کچھ لوگ پہلے سے خواب گاہ میں چھپ کر بیٹھے تھے انہوں نے اپنے چہرے چھپا رکھے تھے لہٰذا قنطورا پہچان نہیں سکی۔ بہرحال اس کا کہنا ہے کہ وہ تعداد میں تین

تھے اور انہوں نے صرف فطیون کو ہی نہیں بلکہ ان کہاروں کو موت کے گھاٹ اُتار دیا ہے جو اس کی پالکی لے کر خواب گاہ میں آئے تھے ۔

زبولون نے روبیل اور مالک کی طرف دیکھتے ہوئے غمزدہ لہجے میں کہا ۔ آؤ فطیون کی حویلی میں چلتے ہیں اور دیکھتے ہیں فطیون کو کس نے اور کیسے قتل کیا ہے ۔

روبیل اور مالک رضامند ہو گئے اور اس کے ساتھ ہو لیے ۔ جب وہ فطیون کی حویلی میں داخل ہوئے تو انہوں نے دیکھا وہاں اَن گنت یہودی جمع تھے اور فطیون کے قتل پر غم و غصّے کا اظہار کر رہے تھے ۔

روبیل اور مالک جب وہاں پہنچے تو یہودیوں نے ان دونوں کی شک کی نگاہ سے دیکھا لیکن جب زبولون نے انہیں بتایا کہ یہ دونوں میرے پاس بیٹھے ہوئے تھے تو یہودی مطمئن ہو گئے ۔ اس وقت تک قنطورا اپنے گھر جا چکی تھی ۔ مالک نے روبیل کو اشارہ کیا اور دونوں حویلی سے باہر نکل گئے ۔ ایک تاریک اور ویران جگہ آ کر مالک رُک گیا اور روبیل کی طرف دیکھتے ہوئے کہا ۔

’روبیل ! روبیل ! میں ابھی اور اسی وقت بنو غسان کے بادشاہ ابوجبیلہ کی طرف روانہ ہوتا ہوں ۔ مَیں آج رات ہی اپنے سفر کا کافی حصّہ طے کر لوں گا ۔ میرے بعد قنطورا اور میرے گھر کے دوسرے افراد کا خیال رکھنا ۔ مَیں واپس آ کر قنطورا کو اس کے شوہر کے گھر روانہ کروں گا ۔ میرے بعد اوس و خزرج کا خیال رکھنا ۔ کوشش کرنا کہ میرے آنے تک یہودیوں کے ساتھ کوئی اُلجھن پیدا نہ ہو ۔ ویسے مجھے اُمید ہے کہ چند روز تک ویسے بھی یہودی مصروف رہیں گے اور وہ فطیون کی جگہ کسی کو اپنا سربراہ بنانے کے لیے چند روز تک جوڑ توڑ اور بھاگ دوڑ کرتے رہیں گے اس وقت تک مَیں جبیلہ کی صورت میں ان کے لیے عذاب بن کر نازل ہو جاؤں گا ۔ میرا کوئی پوچھے تو کہنا ۔ بہن کی شادی پر اس نے کعبہ کا طواف مان رکھا تھا اور وہ مکّہ چلا گیا ہے ۔

گھوڑے پر بیٹھے ہی بیٹھے مالک نے روبیل سے مصافحہ کیا اور اپنی منزل کی طرف روانہ ہو گیا ۔ روبیل وہاں اندھیرے میں تھوڑی دیر تک کھڑا رہا ۔ چاند اب

طلوع ہو گیا تھا ۔ اور بادلوں کے ٹکڑوں کے بیچوں بیچ دامنِ آسمان پر ستاروں کے نقش و نگار فطرت کے گیت گاتے اور کائنات پر مسکراتے دکھائی دینے لگے تھے ۔ جب مالک کے گھوڑے کی ٹاپوں کی آواز آنا بند ہو گئی تو روبیل نے اپنے گھوڑے کو موڑ کر ایڑ لگا دی تھی ۔

روبیل اپنی حویلی میں داخل ہوا ۔ اوس اور خزرج کے جوان حویلی کے اندر اور باہر کچھ سو رہے تھے اور کچھ جاگ کر پہرہ دے رہے تھے ۔ روبیل اصطبل کی طرف گیا ۔ گھوڑے کو وہاں باندھ کر اس کی زین و دھانہ اُتارا اور اسے چارہ ڈال کر جب وہ اپنے کمرے میں آیا تو اس نے دیکھا کمرے میں راحیل نے زیتون کے تیل سے جلنے والا ایک چومکھیا دیا روشن کر رکھا تھا اور وہ خود فرش پر چٹائی بچھا کر بیٹھی روبیل کا انتظار کر رہی تھی ۔ جونہی اس نے روبیل کو دیکھا وہ کھڑی ہو گئی اور اس کے قریب آ کر اس نے سرگوشی کرتے ہوئے کہا ۔

” مَیں آپ کو آپ کی کامیابی پر مبارک باد دیتی ہوں ۔ مَیں جانتی ہوں آپ اور مالک کے سوا فطیون کو کوئی قتل نہیں کر سکتا ۔ اپنے آنے والے صحرائی رسولؐ کے رب کی قسم آپ نے ایسا عمدہ فعل اور نیک عمل کیا ہے جس پر آنے والی عرب نسلیں فخر و تعلّی کریں گی “ ۔ پھر راحیل نے پیار سے روبیل کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے پوچھا ۔ ” آپ نے کھانا کھایا ؟ “

روبیل نے جب نفی میں سر ہلا دیا تو راحیل نے اسے کھینچ کر چٹائی پر بٹھاتے ہوئے کہا ۔ ” قنطورا نے ہم دونوں کے لیے کھانا بھجوایا تھا ۔ باہر پہرہ دینے والے جوان بھی باری باری جا کر کھانا کھا آئے ہیں ۔ آپ بیٹھیں مَیں آپ کے لیے کھانا گرم کر کے لاتی ہوں “ ۔ روبیل چٹائی پر بیٹھ گیا ۔ تھوڑی دیر بعد راحیل آئی اور روبیل کے سامنے کھانا رکھنے کے بعد وہ پھر مطبخ میں گئی اور وہاں سے دُودھ کا ایک برتن بھر کر لے آئی اور روبیل سے کہا ۔ ” آپ کے جانے کے بعد مَیں نے بکریوں کا دُودھ بھی نکال لیا تھا ۔ اب آپ کھانا کھائیں “ ۔

روبیل نے کھانے کی طرف ہاتھ بڑھایا پھر اچانک راحیل کی طرف دیکھتے ہوئے اس نے پوچھا۔ "تم نے کھانا کھایا"۔ راحیل نے جب نفی میں سر ہلایا تو روبیل نے ہاتھ کھینچتے ہوئے کہا۔ "پھر میں بھی نہیں کھاؤں گا"۔ راحیل نے اس کا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا۔ "آپ ہاتھ کیوں روک رہے ہیں۔ شروع کیجئے، میں بھی آپ کے ساتھ کھاتی ہوں"۔ دونوں مل کر کھانا کھانے لگے تھے۔ گو دونوں اداس اور غمزدہ تھے لیکن دونوں کے وہاں اکٹھے ہونے سے ان کو کسی قدر اطمینان اور یکسوئی ضرور ملی تھی۔

ایک روز دوپہر کے قریب مالک بن عجلان، شام میں بنو غسان کے بادشاہ ابو جبیلہ کے سامنے پیش ہو رہا تھا۔ یہ وہی کمرہ تھا جس میں ایک بار روبیل بھی جبیلہ سے مل کر گیا تھا۔ جبیلہ کی نشست کے عقب میں خدام کھڑے شتر مرغ کے پروں کا چھتر لہرا رہے تھے اور دائیں بائیں اس کے عرب محافظ کھڑے تھے۔ دائیں ہاتھ کی دیوار کے ساتھ مریمؑ کا ایک مجسمہ رکھا ہوا تھا جس کے اوپر دیوار کے ساتھ عیسیٰؑ کا بت تھا جو آبنوس کی صلیب پر لٹک رہا تھا۔

مالک بن عجلان ابو جبیلہ کے کہنے پر جب اس کے سامنے بیٹھ گیا تو جبیلہ نے پوچھا۔ "کون ہو اور کہاں سے آئے ہو"۔ مالک بن عجلان ہوں"۔ جبیلہ نے سوچتے ہوئے کہا۔ تمہارا ایک سردار پہلے ہی میرے پاس مدد کی درخواست لے کر آیا تھا۔ شاید وہ بنو نجار سے تھا اور اس کا نام روبیل تھا"۔

مالک نے بڑی بے تابی سے کہا۔ "ہاں! اس کا نام روبیل ہے۔ وہ میرے قابلِ اعتماد ساتھیوں میں سے ایک ہے۔ وہ ایسا بہادر اور شجاع ہے کہ اس جیسے ایک ہزار جوان بھی اگر میرے ساتھ ہوں تو میں دنیا کے آخری کونے تک یہود کا تعاقب کر سکتا ہوں۔ مدد کی جو درخواست روبیل لایا تھا وہی اب میں لے کر آیا ہوں"۔

ابو جبیلہ نے بڑی ہمدردی کا اظہار کرتے ہوئے پوچھا۔ "کیا فطیون کے مظالم تم پر اور زیادہ ہو گئے ہیں"۔ جواب میں مالک بن عجلان نے اپنی بہن کی شادی اور فطیون کے قتل کی پوری داستان کہہ دی تھی۔ ابو جبیلہ نے مسکراتے اور خوش ہوتے ہوئے کہا۔ "اب روبیل اور تم نے عربوں جیسا کام سرانجام دیا ہے۔ فطیون جب قتل ہو چکا ہے تو پھر اب تمہیں کاہے کی فکر ہے"۔

مالک نے کہا۔ یہودی کسی وقت بھی ہم پر اور ہمارے گھروں پر حملہ آور ہو سکتے ہیں۔ جس روز میری بہن کی شادی تھی اس روز چند یہودیوں نے ایک عرب بیوہ عورت کو جان سے مار دیا تھا۔ جس کے جواب میں روبیل کے چھوٹے بھائی یہودہ نے ان دو یہودیوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ جنہوں نے اس عرب عورت کو قتل کیا تھا۔ اس پر یہودی بپھر گئے اور انہوں نے روبیل کی ماں بہن اور اس کے بھائی کے علاوہ اس کی ہونے والی بیوی کے باپ کو بھی قتل کر دیا۔ روبیل موقع پر موجود نہ تھا جب اسے خبر ہوئی تو اس نے چند عربوں کے ساتھ مل کر پچیس یہودی جوانوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ اس وقت اوس و خزرج کے مسلح جوان روبیل کی حفاظت کے لیے اس کے گھر کے اردگرد پہرہ دے رہے ہیں۔ یہودی چند روز تک اپنا نیا سردار منتخب کرنے میں الجھے رہیں گے۔ اس کے بعد وہ ضرور عربوں کے خلاف حرکت میں آئیں گے۔ اگر ایسا ہوا تو وہ یثرب میں ہم عربوں کا نسب و نشان تک مٹا دیں گے"۔

ابو جبیلہ غصے کی حالت میں کھڑا ہوتا ہوا بولا۔ "قبل اس کے کہ وہ یثرب کے عربوں کو مٹائیں۔ ہم عرب انہیں ایسی سزا دیں گے کہ وہ ہمارے سامنے مفلوج اور اپاہج ہو کر رہ جائیں گے۔ قدس سے لے کر حضرموت اور عمان سے لے کر غزہ تک کی سرزمین ہم عربوں کی ہے۔ اس کے اندر یہودی اگر ہم پر زیادتی کریں تو ہم پر حیف اور لعنت ہے۔ میں دیکھتا ہوں وہ عربوں پر کیسے مظالم اور ستم ڈھاتے ہیں اگر تم تھکاوٹ محسوس نہیں کر رہے تو میں ابھی اور اسی وقت اپنے لشکر کے ساتھ یثرب کی طرف کوچ کرنے کو تیار ہوں"۔

مالک بن عجلان بھی کھڑا ہو گیا اور دبی دبی مسرت میں اس نے کہا۔ "آپ میری تھکاوٹ کا احساس نہ کریں۔ میں یہودی کے ساتھ جنگ کرنے کے لیے دنیا کے

آخری کونے تک برہنہ پا آپ کا ساتھ دینے کو تیار ہوں"۔ ابو جبیلہ نے مسکراتے ہوئے ہوئے مالک بن عجلان کا ہاتھ تھام لیا تھا اور اس کمرے سے باہر نکل گیا تھا۔

رات بھاگتی جا رہی تھی۔ قدرت کے گماشتے سحر کی تلاش میں اندھیروں کی طنابیں پرانی زنجیروں کی طرح توڑ رہے تھے۔ آدھی رات کے آسمان پر تابندہ ستارے اپنے منجھے ڈھلے چہروں کے ساتھ وقت کی نشو و ارتقا کا منظر دیکھ رہے تھے۔ روبیل ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ اس کے قریب ہی دوسری مسہری پر لیٹی ہوئی راحیل بھی اٹھی، اور روبیل کے قریب آکر اس نے پیار سے اس کا ہاتھ تھامتے ہوئے پوچھا۔

"کیا ہوا؟ آپ یوں پریشان ہو کر اٹھ کیوں گئے؟"۔ روبیل نے راحیل کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ "کیا تم جاگ رہی تھیں؟"

"ہاں مجھے نیند نہیں آ رہی تھی لیکن آپ بھی تو جاگ رہے تھے۔ آپ نے ابھی تک بتایا نہیں کہ آپ اٹھ کر کیوں بیٹھ گئے ہیں"۔ روبیل نے کہا۔ "میں نے کسی گھوڑے کی ٹاپوں کی آواز سنی ہے"۔ پھر روبیل نے چونکتے ہوئے کہا۔

"سنو! سنو! راحیل! کیا تم گھوڑے کے دوڑنے کی آواز نہیں سن رہی ہو جو قریب سے قریب تر آتی جا رہی ہے۔ یا یہ میری سماعت کا دھوکہ ہے"۔ راحیل نے غور سے سنتے ہوئے کہا۔ "یہ سماعت کا دھوکہ نہیں۔ آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ کوئی اپنے گھوڑے کو بھگاتا ہوا ہماری حویلی کی طرف آ رہا ہے"۔

روبیل اپنے بستر سے اٹھ کھڑا ہوا۔ "میں جانتا ہوں وہ کون ہے۔ میں خود اٹھ کر اس کے لیے دروازہ کھولوں گا"۔ راحیل نے پریشان ہو کر پوچھا۔ "کون ہے اور اس کے لیے آپ دروازہ کھولیں گے"۔ روبیل نے دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔ "رات کے اس وقت یثرب کی گلیوں میں اکیلا سوار مالک بن عجلان کے علاوہ اور کون ہو سکتا ہے"۔ راحیل بھی اس کے ساتھ ہو لی تھی اور حویلی کے اردگرد پہرہ دینے والے مسلح جوان ان دونوں کے اردگرد پھیل گئے تھے۔

کوئی سوار حویلی سے باہر آ کر رکا۔ اور باہر کھڑے اوس و خزرج کے جوانوں کے ساتھ گفتگو کرنے لگا تھا۔ روبیل نے آگے بڑھ کر جب دروازہ کھولا تو اس نے دیکھا سامنے مالک بن عجلان اپنے گھوڑے کی باگ تھامے کھڑا تھا۔ روبیل آگے بڑھا اور اس سے گلے ملتے ہوئے پوچھا۔

"ابو جبیلہ کہاں ہے اور اس نے تم سے کیا کہا"۔ مالک بن عجلان نے حویلی میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔ "اتنے بے تاب نہ ہو صبر سے کام لو سب کچھ تم سے کہہ دوں گا"۔ صحن میں آ کر انہوں نے دروازہ بند کر دیا اور پھر وہیں کھڑے کھڑے مالک نے کہا۔

"روبیل! روبیل! ابو جبیلہ اپنے لشکر کے ساتھ یہاں پہنچ گیا ہے۔ اس نے وادیٔ ذی حرض میں اپنے چھ ہزار لشکر کے ساتھ پڑاؤ کیا ہے اور باقی لشکر کو اس نے جبل احد کے تنگ و تاریک دروں کے اندر چھپا دیا ہے۔ سنو روبیل! آج رات ہی وہ وادیٔ ذی حرض کے ایک کھلے میدان کی صفائی کرائے گا اور کل وہاں یہودیوں کی دعوت کرے گا۔ بس اس دعوت میں ہی وہ ان کا کام تمام کر دے گا اور جو مسلح یہودی شہر میں رہ گئے ان سے میں اور تم دونوں نمٹ لیں گے"۔

روبیل نے غصے کی حالت میں کہا۔ "اب وقت آ گیا ہے کہ ہم تہذیب کے کھردرے ہاتھ بن کر یہود کے چہروں کو چرمرا دیں اور نوچ لیں۔ کل جب ہم ان کے تصورات کے بت توڑ دیں گے تو انہیں وقت کے دامن میں پھیلی اپنی ستم کی داستانوں کا صدیوں تک کا حساب دینا ہوگا۔ میری قوم کے چہرے پر ان کی ستم ظریفیوں کے باعث ماضی کی جو الم ناک داستانیں ثبت ہیں انہیں ہم یہودیوں کے خون سے ہی دھو کر صاف کریں گے۔ دشتِ عرب میں یہودی حنظل اور اندرائن کی کڑوی بیل ہیں اور اب اس بیل کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنے کا وقت آ گیا ہے"۔

روبیل جب خاموش ہوا تو مالک بن عجلان نے کہا۔ "میں اب گھر جاتا ہوں، تھوڑی دیر آرام کروں گا پھر کل اوس و خزرج کے اپنے لشکر کو منظم اور تیار کرنے کے بعد ابو جبیلہ کے پاس جائیں گے تاکہ اس کے ساتھ جنگ کے طریقہ کار پر

گفتگو کریں۔"

مالک بن عجلان نے روبیل سے مصافحہ کیا اور اپنے گھوڑے کی باگ تھامے وہ حویلی سے باہر نکل گیا۔ روبیل اور راحیل دونوں کمرے میں واپس آئے۔ روبیل بیحد خوش اور پُرسکون تھا۔ اس نے راحیل کے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ "راحیل! راحیل! اس سے قبل مجھے کچھ ہوش نہ تھا۔ میں ایک طرح سے بکھر گیا تھا اور تمہارے باپ کے مرنے تک کا تم سے کوئی افسوس نہ کر سکا تھا۔"

راحیل آگے بڑھی اور پُرسکون انداز میں اس نے اپنا سر روبیل کی چھاتی پر رکھتے ہوئے کہا۔ "آپ کو ہوش کیسے رہتا۔ میرا تو اکیلا باپ مرا ہے جب کہ آپ کی ماں، بہن اور بھائی موت کے گھاٹ اتر گئے۔"

روبیل مغموم اور افسردہ ہو کر گہری سوچوں میں کھو گیا تھا۔ راحیل نے پیار سے اس کی گردن پر اپنا نازک اور گداز ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ "آپ میرے لیے طمانیت کی گود اور میری زندگی کا حسین ترین ورق ہیں۔"

راحیل رُکی پھر اس نے عجیب سی میٹھی تڑپ اور ایک انوکھی ملائم و مدھر بھری آواز میں کہا۔ "آپ مجھے مل گئے ہیں تو میں سمجھوں گی میں نے کچھ نہیں کھویا۔" روبیل نے انتہائی رقت میں کہا۔ "کاش میری ماں، بہن اور بھائی زندہ ہوتے اور تمہارے اس گھر میں آنے سے وہ ایک انمٹ سکون اور ابدی راحت دیکھتے اور ——"

اس سے آگے روبیل کچھ نہ کہہ سکا اور اس کی زبان غوطہ کھا گئی تھی۔ راحیل نے روبیل کا ہاتھ تھامتے ہوئے کہا

"آپ کو آرام کی ضرورت ہے۔ آپ سو جائیں۔" روبیل نے فوراً اپنے آپ کو سنبھال لیا اور مسکرا کر اس نے کہا۔ "آج مالک بن عجلان میرے لیے ایسی خوشخبری لایا ہے جس کا برسوں سے مجھے انتظار تھا۔ آج میں بہت خوش ہوں، مجھے نیند نہیں آئے گی۔ آؤ فرش پر بھی اس چٹائی پر بیٹھ جائیں اور اپنے ماضی کے حالات ایک دوسرے کو سنا کر سحر کا انتظار کریں۔"

راحیل کے حسین چہرے پر بھی مسکراہٹ بکھر گئی تھی۔ پھر وہ دونوں چٹائی پر بیٹھ کر اپنے گزرے وقتوں کی داستانیں ایک دوسرے سے کہہ رہے تھے اور رات سحر کی تلاش میں تیزی سے بھاگ رہی تھی۔

دوسرے روز ابوجبیلہ کے آدمیوں کے علاوہ مالک اور روبیل کے کہنے پر اوس خزرج کے لوگوں نے یثرب شہر میں یہ خبر پھیلا دی تھی کہ نبوغسان کا بادشاہ ابوجبیلہ عربوں اور یہودیوں میں صلح کرانے کے علاوہ تبان کے اس محل کی زیارت کرنے آیا ہے جو آنے والے نبیؐ کے بنایا گیا ہے۔

یہودی مطمئن ہو گئے کیونکہ ان کے سامنے ابوجبیلہ کے لشکری یثرب کے بازاروں میں خرید و فروخت کر رہے تھے اور یہودیوں کے ساتھ ان کا رویہ نہایت مہربان اور نرم تھا۔ لہٰذا انہیں کسی قسم کا شک اور وہم نہ گزرا تھا۔

روبیل اور مالک اس دوران ابوجبیلہ کے پاس گئے۔ وہ اس وقت اپنے خیمے میں بیٹھا اپنے چند سالاروں کے ساتھ گفتگو کر رہا تھا۔ روبیل اور مالک کے آنے پر اس نے اپنے سالاروں کو چلے جانے کا اشارہ کیا اور اُٹھ کر اس نے روبیل اور مالک کے ساتھ مصافحہ کیا۔ پھر وہ تینوں آمنے سامنے خیمے کے اندر بچھی ہوئی کھجور کے پتوں کی چٹائی پر بیٹھ گئے اور ابوجبیلہ نے کہا۔ اچھا ہوا تم آ گئے۔ ورنہ میں خود تم دونوں کو بلانے والا تھا۔ میں آج ہی یہودیوں سے نمٹ لینا چاہتا ہوں۔ اس معاملے میں تم دونوں میں سے کسی کو کوئی اعتراض ہے۔

مالک نے کہا۔ "ہمیں کیا اعتراض ہے۔ ہم تو چاہتے ہیں ابھی اور اسی وقت اس ظالم اور بے وفا قوم کا قتل عام شروع کر دیں۔"

ابوجبیلہ نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ "تو پھر سنو! آج رات میں اُن کے سرکردہ لوگوں کی دعوت کروں گا۔ ان کی تعداد کم از کم ایک ہزار ہو گی۔ ان کے لیے کسی کھانے کا بندوبست نہ کیا جائے بلکہ میرے لشکر کے لیے جو کھانا تیار ہو گا اسی سے انہیں حکمہ دیا جائے گا کہ اُن کی دعوت ہے۔ جب وہ سارے یہاں کھانے کے لیے جمع ہو جائیں

گے تو میں ان سب کو اپنے اس لشکر کے ہاتھوں قتل کر دوں گا جو ابھی میرے ساتھ ہے اب تم دونوں کا کام باقی ہے ۔ روبیل میرے اس لشکر کا سالار اعلیٰ ہو گا ۔ جو اس وقت جبلِ اُحد کے دروں میں چھپا ہوا ہے ایسا اس لیے کیا جا رہا ہے کہ روبیل یہودیوں کے قلعوں اور ان مضبوط ٹھکانوں سے واقف ہے جہاں یہودی چھپ کر پناہ لے سکتے ہیں اور ہمارے مقصد کو ناکام بنا سکتے ہیں ۔

مالک ! تمہارے ساتھ اوس و خزرج کے جوانوں کا لشکر ہو گا ۔ تم شہر کے جنوب کی طرف حملہ آور ہونا جب کہ روبیل میرے لشکر کے ساتھ شمال کی طرف سے اپنے حملے کی ابتدا کرے گا ۔ تم دونوں شہر کے اندر مسلح اور سرکش یہودیوں کو چُن چُن کر قتل کر دینا ۔ اگر ایسا کرنے میں تم کامیاب ہو گئے تو آنے والے دور میں صدیوں تک یہودی تمہارے سامنے دب کر رہیں گے ۔ ابھی میرا ایک سالار روبیل کو ساتھ لے کر جائے گا اور انہیں مطلع کرے گا کہ جنگ میں روبیل ان کا سالار ہو گا تاکہ وہ روبیل کو دیکھ لیں اور اس کا اتباع کریں ۔ تم دونوں کے آنے سے قبل میں اپنے سالاروں کے ساتھ اسی موضوع پر گفتگو کر رہا تھا ۔

ابو جبیلہ نے کسی کو آواز دی اور جواب میں ایک عرب بھاگتا ہوا خیمے میں داخل ہوا ۔ ابو جبیلہ نے روبیل کی طرف اشارہ کر کے کہا " یہ روبیل بن حماد ہے ۔ جس کا ذکر میں تم سے کر چکا ہوں ۔ اسے جبل اُحد کے اندر اپنے لشکر میں لے جاؤ اور انہیں بتاؤ کہ آنے والی شام کو جس جنگ کی ابتداء ہو گی اس میں یہی روبیل بن حماد ان کا سالار اعلیٰ ہو گا "

روبیل اپنی جگہ سے اُٹھا اور اپنے گھوڑے پر سوار ہو کر اس جوان کے ساتھ جبل اُحد کی طرف چلا گیا تھا ۔ ابو جبیلہ اور مالک وہیں بیٹھ کر جنگ کے موضوع پر گفتگو کر رہے تھے ۔

دوپہر کے قریب ابو جبیلہ نے یہودیوں کے ایک ہزار کے لگ بھگ رؤسا اور زعماء کو شام کے کھانے کی دعوت دی جسے انہوں نے بخوشی قبول کر لیا ۔ جب شام ہوئی تو وہ یہودی جن کی دعوت کی گئی تھی وادیٔ ذی حرض میں ابو جبیلہ کے پاس جمع ہو گئے ۔ اس وقت تک کھانا تیار ہو چکا تھا جو ابو جبیلہ کے لشکر کے لیے تھا ۔

دوسری طرف روبیل بھی جبل اُحد کے اندر ابو جبیلہ کے لشکر میں جا چکا تھا اور مالک بن عجلان نے اوس و خزرج کو چند حویلیوں میں جمع کر کے منظم کر لیا تھا ۔ جب دعوت میں حصہ لینے والے یہودی کھانا کھانے کے لیے لمبی لمبی قطاروں میں بیٹھ گئے تو اچانک ابو جبیلہ نے اپنے لشکر کے ساتھ ان پر حملہ کر کے ان کا قتل عام شروع کر دیا تھا ۔

اسی وقت جنوب کی طرف مالک بن عجلان اور شمال کی طرف روبیل نے حملہ کر دیا تھا ۔ دونوں نے ایسی خونخواری سے حملہ کیا تھا کہ یہودیوں کے بڑے بڑے جنگ آزما ان کے آگے آگے صحرائی لومڑیوں کی طرح بھاگ رہے تھے ۔ وہ دونوں برفانی بھیڑیوں اور درندوں کی طرح دھاڑتی آندھیوں جیسا شور کرتے ہوئے یہودیوں کے قلعوں میں گھس گئے تھے اور ان سب یہودیوں کا قتل عام شروع کر دیا تھا جو جنگ میں حصہ لینے کے قابل تھے ۔

بھاگتے ہوئے یہودی کھوکھلی آوازوں میں ایک دوسرے کو مدد کے لیے پکار رہے تھے لیکن کوئی کسی کی مدد کو نہ آیا اور روبیل و مالک نے یہودیوں کے اعضائے بدن کاٹنے کا خوفناک عمل جاری رکھا ۔ یہاں تک کہ یثرب کے اندر انہوں نے ہر سرکش اور باغی طبع یہودی کو قتل کر دیا تھا ۔

اس وقت تک ابو جبیلہ بھی دعوت میں حصہ لینے کو قتل کر کے انہیں آگ لگا چکا تھا ۔ روبیل اور مالک نے بھی شہر کے اندر پھیلی ہوئی یہودیوں کی لاشوں کو وادیٔ ذی حرض میں جمع کیا اور انہیں جلا کر راکھ کر دیا تھا ۔

جب وہ فارغ ہوئے تو ابو جبیلہ ان دونوں کے پاس آیا اور کہا " میں نے جو وعدہ کیا تھا وہ پورا کر دیا ہے ۔ میں اب ابھی اور اسی وقت یہاں سے کوچ کروں گا لیکن روانگی سے قبل میں ایک کام کرنا چاہتا ہوں ۔ مالک ! تم نے

بدنور کی رانی

اسلم راہی ایم اے

کہا تھا کہ یہودیوں نے روبیل کی ہونے والی بیوی کے باپ کو مار دیا تھا، وہ لڑکی کون ا
کہاں ہے میں خود اُن دونوں کی شادی کر کے یثرب میں اس امر کی ابتدا کرنا چا
ہوں کہ اب یثرب میں عربوں کی بیٹیاں شادی کے بعد کسی فطیون کی خواب گا
بجائے سیدھی اپنے شوہروں کے پاس جائیں گی۔ جب تک میں اس شادی سے نمٹ
لوں اس وقت تک میرا لشکر کھانا کھا کر کوچ کی تیاری کر لے گا۔" مالک بن عجلان نے
کہا۔ "اس لڑکی کا نام راحیل ہے۔ باپ کی موت کے بعد وہ اکیلی رہ گئی ہے اور اب روبیل
کے ساتھ اس کی حویلی میں ہی رہتی ہے۔" جبیلہ نے کہا۔ "چلو مجھے وہاں لے کر چلو۔"

ابو جبیلہ، روبیل اور مالک شہر کی طرف بڑھ گئے۔ جب وہ روبیل کی حویلی میں
داخل ہوئے تو انہوں نے دیکھا صحن میں راحیل بکریوں کا دودھ نکال رہی تھی۔ مالک بن عجلان
نے کہا۔ "یہ لڑکی جو بکریوں کا دودھ نکال رہی ہے یہی راحیل ہے۔" ابو جبیلہ آگے بڑھ کر
راحیل کے قریب ہوا اور بڑی شفقت اور پیار سے کہا۔ "اے بیٹی! تو دودھ نکالنا بند کر
کہ ابھی تیری شادی روبیل سے ہوگی۔" راحیل بے چاری ایسی بوکھلائی کہ اس کے ہاتھ سے
دودھ کا برتن گرتے گرتے بچا اور وہ کمرے کی طرف بھاگ گئی۔ ابو جبیلہ بھی روبیل اور
مالک کے ساتھ اس کمرے میں گیا اور وہاں اس نے روبیل اور راحیل کا نکاح پڑھا۔

تھوڑی دیر تک وہ وہاں بیٹھا رہا پھر روبیل اور مالک کے ساتھ وہ اپنے
لشکر میں آیا۔ اس کا لشکر کھانا کھا کر تیار ہو چکا تھا اور ابو جبیلہ نے روبیل اور مالک کے
ساتھ مصافحہ کرنے کے بعد کوچ کا حکم دے دیا تھا۔ روبیل اور مالک اپنے گھوڑوں پر
سوار جبیلہ کے لشکر کو کوچ کرتا ہوا دیکھتے رہے۔ جب چاند کی چاندنی میں ابو جبیلہ اپنے
لشکر کے ساتھ جبل احد کے دامن میں ان کی نظروں سے اوجھل ہو گیا تو انہوں نے اپنے
گھوڑوں کو موڑ کر مہمیز لگائی اور وادیٔ ذی حرض کے اندر وہ اپنے گھوڑوں کو سرپٹ
دوڑاتے ہوئے شہر کی طرف جا رہے تھے۔

سورج شام کے اندھے کنوئیں میں جھک رہا تھا۔ پرندے آشیانوں کو اور مویشی اپنی بستیوں کو کوچ کر رہے تھے۔ ریوڑوں کے گزرنے کے غبار نے فضا کو دھواں دھار بنا دیا تھا۔ ایسے میں ایک سوار اپنے سفید رنگ کے گھوڑے کو بھگاتا ہوا سرنگاپٹم کے میسوری دروازے سے نکلا۔ شہر کے گرد اس نے مختصر سا ایک کاواکاٹ پھر وہ دریائے کاویری کے سیاہ پوش کنارے کے ساتھ ساتھ اپنے گھوڑے کو شمال کی طرف سرپٹ دوڑا رہا تھا۔

دمکتی شفق نے دریائے کاویری کے پانی کو سنہرا کر دیا تھا اور اس کے اوپر اڑتی پھرتی بے آشیانہ ابابیلیں وہاں سے ہٹنا شروع ہو گئی تھیں۔ شام کے بے نور سناٹوں میں وہ سوار کچھ دیر تک اپنے گھوڑے کو شمال کی طرف بھگاتا رہا۔ پھر اپنے گھوڑے کو بائیں طرف موڑتے ہوئے وہ دریائے کاویری کو پار کر رہا تھا۔

کوہستان کری کٹہ کے شمالی کناروں کے ساتھ ساتھ وہ گادل اور ارگڑا کے

مواضعات کے پاس سے گزرتا ہُوا بالائی جنگل میں داخل ہوگیا تھا۔ مایوسی کی نقاب، سناٹے کی چھاؤں اور ظلمتوں کی زنجیروں میں جکڑی رات گناہ گار کے اعمال نامے کی طرح ایسی سیاہ ہوگئی تھی کہ لگتا تھا آسمان کی اونچائی اور زمین کی گہرائی آپس میں مل گئے ہوں۔ سرما کی جنوبی ہوائیں جنوں خیز ہوکر جسم پر کوڑے برسا رہی تھیں۔ سنسان راستے کے دونوں جانب جنگل میں درخت کسی قدیم بوڑھے بُت کی طرح خاموش اور چُپ کھڑے تھے اور اس سوار کا گھوڑا جنگل میں صدیوں تک پھیلی ہوئی زمانے کی چُپ میں اپنے گھونسلے سے بھٹکے ہوئے کسی طائر کی مانند اُڑا جا رہا تھا۔

اندھیری گپھاؤں کی طرح سُونی رات گزرتی رہی، سوار سفر کرتا رہا حتیٰ کہ اندھیرے کی پاتال سے صبح کے بادبان نمودار ہوئے وہ سوار اب جنگل سے نکل کر ہڑور کے کوہستانی سلسلے میں داخل ہو چکا تھا۔ ایک کوہی ندی کے پاس اس نے اپنے گھوڑے کو روکا۔ دھانہ نکال کر اس نے گھوڑے کو چرنے کے لیے چھوڑ دیا خود وہ وضو کر کے فجر کی نماز ادا کرنے لگا تھا۔ شاید گھوڑے کو آرام دینے کی خاطر نماز سے فارغ ہو کر کچھ دیر وہ ایک پتھر پر بیٹھ کر چھوٹے چھوٹے کنکر اُٹھا کر ندی کے شفاف پانی میں پھینکنے لگا تھا۔ پھر وہ اُٹھا اپنے گھوڑے کی خرجین سے اپنا زادِ راہ نکال کر اس نے ناشتہ کیا۔ گھوڑے کو دھار پڑھایا اور دوبارہ وہ اپنے سفر پر روانہ ہوگیا تھا۔

دوپہر کے قریب جب کہ وہ کوہستانِ ہڑور کے اندر اپنے گھوڑے کو سرپٹ دوڑا رہا تھا۔ راستے کے بائیں طرف گھوڑے کی ٹاپوں کی آواز پر اَن گنت گدھ اپنے پَر پھڑپھڑاتے ہوئے اُٹھے اور فضا میں بلند ہونے لگے۔ اس سوار نے اپنے گھوڑے کی لگام ایسی سختی سے کھینچ کر ایسے انداز میں روک لیا تھا۔ گویا فطرت کے گمنام عناصر اور قدرت کے فعال گماشتوں نے وقت کی طناب میں پکڑ کر کھینچ لی ہوں۔

اس سوار نے اپنے گھوڑے کی زین سے لٹکتی ہوئی ڈھال سنبھال کر اپنی تلوار کھینچ لی تھی اور گھوڑے کو اس نے اس ٹیلے کی طرف بڑھا دیا تھا جس کے پیچھے سے گدھ اُڑے تھے۔ جب وہ اس ٹیلے کے پیچھے گیا تو اس نے دیکھا وہاں گدھوں کے ہاتھوں

آدھی اُدھڑی ہوئی ایک لاش پڑی تھی۔ جس کا چہرہ پہچانے جانے کے قابل نہ رہا تھا۔

وہ سوار نیچے اُترا۔ آہستہ آہستہ وہ اس لاش کی طرف بڑھا۔ وہاں کھڑے ہو کر اس نے کچھ سوچا پھر کوئی فیصلہ کرنے کے بعد اس نے زمین سے کلہاڑا اُٹھایا۔ اس کی مدد سے اس نے ایک گڑھا کھود کر لاش کو اس میں دفن کر دیا۔

جونہی وہ وہاں سے پیچھے ہٹنے لگا ایک دم چونک کر رُک گیا۔ وہاں چند قدموں کے نشانات تھے جو ٹیلے کے گرد گھومتے ہوئے اس راستے کی طرف چلے گئے تھے جس پر وہ سفر کر رہا تھا۔ اس نے دوبارہ اپنی تلوار بے نیام کر لی اس کی تلوار کے مزین دستے پر نمایاں حروف میں نصرالدین کندہ کیا ہُوا تھا۔ شاید یہ اس کا نام تھا۔

جب قدموں کے وہ نشانات راستے میں جا کر شامل ہوگئے تو وہ دوبارہ مُڑا اپنے گھوڑے پر وہ سوار اور دوبارہ وہ اس راستے پر سفر کرنے لگا تھا لیکن اب اس کی رفتار پہلے کی نسبت سُست تھی اس لیے کہ وہ پاؤں کے ان نشانات کو دیکھتا جا رہا تھا۔ چند ہی قدم آگے بڑھ کر اس نے گھوڑے کو پھر روک لیا اور نیچے اُتر گیا وہاں پاؤں کے نشانات ختم ہوگئے تھے اور ان کی جگہ گھوڑوں کے سموں کے کئی نشانات تھے جو واضح طور پر دیکھے جا سکتے تھے۔

سوار نے جس کا نام نصرالدین تھا ان سموں کا جائزہ لیا۔ چند لمحوں تک اس کی گردن جُھکی رہی اور دوبارہ وہ ان سموں کے نشانات دیکھتا ہُوا آگے بڑھنے لگا تھا شاید وہ کوہستانوں کے اندر بے بسی کی موت مرنے والے کے قاتلوں کو تلاش کرنے کا فیصلہ کر چکا تھا۔ اس نے اپنے گھوڑے کو نہمیز لگائی اور گھوڑا شمال مغرب کے رُخ پر سرپٹ دوڑ رہا تھا۔

ان طاعون زدہ اُجڑی راہوں پر نصرالدین اپنا گھوڑا سرپٹ دوڑا رہا تھا۔ پانچ کوس کا فاصلہ طے کرنے کے بعد اس نے ایک بار پھر گھوڑے کی باگیں ایک جھٹکے سے کھینچ کر اسے روک لیا تھا۔ اس نے دیکھا سامنے ایک کوہستانی ندی آگئی تھی۔ جس کے اندر ایک ٹیڑھی میڑھی لکیر کی شکل میں پانی بہہ رہا تھا اور وہاں پانی کے

کنارے چھ آدمی بیٹھے ہوئے تھے ۔جب کہ ان کے گھوڑے ندی سے باہر گھاس چر رہے تھے ۔

نصر الدین نے اپنے گھوڑے کو دوبارہ ایڑ لگائی اور اُسے دائیں طرف موڑ کر وہ اُن کی طرف بڑھا ۔قریب جا کر اس نے دیکھا ۔ان میں سے چار جو علیحدہ ہو کر بیٹھے ہوئے تھے مرہٹہ ہندو تھے اور اُن کے قریب ہی جو دو اور جوان تھے ان کے ہاتھ ان کی پشت پر بندھے ہوئے تھے اور ان کے پاؤں بھی جکڑے ہوئے تھے ۔ان میں سے ایک ہندو تھا اور دوسرا مسلمان جسے دیکھ کر نصر الدین کے چہرے پر مسکراہٹ کھیل گئی تھی شاید وہ اُسے پہچان گیا تھا ۔نصر الدین کو دیکھ کر رسیوں میں بندھے ہوئے اس مسلمان کے چہرے پر بھی اطمینان اور سکون کی لہریں بکھر گئی تھیں ۔

چاروں مرہٹے نصر الدین کو دیکھ کر کھڑے ہو گئے پھر اُن میں سے ایک نے نصر الدین کو مخاطب کرتے ہوئے کڑکتی آواز میں پوچھا ۔"تم کون ہو اور اپنی اصل راہ کو چھوڑ کر ہماری طرف کیا لینے آئے ہو ؟"

نصر الدین اپنے گھوڑے سے نیچے اُتر گیا وہ شاہ بلوط کے درخت کی طرح دراز قد اور کڑیل جسم کا جوان تھا ۔اس کے بازو خوب سڈول، سینہ چوڑا اور بھرے بھرے ڈنٹر تھے ۔اس نے اس مرہٹے کے سوال کا کوئی جواب نہ دیا ۔چند لمحوں تک وہ ان چاروں مرہٹوں کو غور سے دیکھتا رہا ۔پھر اس کی نگاہیں ان دونوں پر جم گئیں جو رسیوں میں جکڑے ہوئے تھے ۔

چند لمحوں تک فضاؤں میں مہیب خاموشی طاری رہی پھر دوبارہ اسی مرہٹے نے اپنی تلوار بے نیام کرتے ہوئے اپنی کھولتی آواز میں پوچھا "ہمارے ہاتھوں گمنامی کی موت مارے جانے سے قبل بتا کون ہے تو اور ادھر کیا لینے آیا ہے ؟"

نصر الدین جو کسی دیو مالا کے بوڑھے اور تناور درخت کی طرح ابھی تک چپ اور خاموش کھڑا تھا چونکا، اس نے فوراً اپنی تلوار اور ڈھال سنبھال لی پھر اس کی ایسی بھیانک آواز بلند ہوئی گویا پرانے کھنڈرات میں موت کسی کو پکار رہی ہو ۔اس نے مرہٹے کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا تھا "تم چاروں کون ہو، ان دونوں کو تم نے کیوں رسیوں

میں جکڑ رکھا ہے اور انہیں تم کہاں لے کر جاؤ گے ؟"

اسی مرہٹے نے طنز کرتے ہوئے کہا ۔جب ہم چاروں کی تلواریں تم پر برسیں گی تو تمہاری رگوں میں جوانی کا اُڑتا کف از خود ختم ہو جائے گا اور تم جان جاؤ گے کہ ہم کون ہیں اور ہماری منزل کدھر ہے ۔سیدھی طرح بتاؤ تم کون ہو ؟ ورنہ اس وادی میں ہم تمہاری ساری شرارت اور کجروی دُور کر دیں گے ۔

نصر الدین کے ذہن کا مدوجزر بھی بڑھنے لگا تھا ۔لگتا تھا اس کے جگر میں التہاب اور دل میں ایک کریدنی بھر دی گئی ہو، اس نے کسی ماہی گیر کے ترسول کی طرح اپنی تلوار فضا میں بلند کرتے اور لہروں کی طرح پیچ و تاب کھاتے ہوئے کہا "اے راندہ و مردود انسانو ! میں تم سب کو ایک ساتھ مقابلے کی دعوت دیتا ہوں ۔"

اسی مرہٹے نے سانپ کی طرح پھنکارتے اور شکار کے طالب ریچھ کی طرح غراتے ہوئے کہا ۔"تو نے ہم سب کو مقابلے کی دعوت دے دی ہے سو دیکھ ہم تجھے کیسے ہلاک کرتے ہیں" ۔اس مرہٹے نے غصے میں لال بھبھوکا ہوتے ہوئے اپنے ساتھیوں سے کہا "آؤ مل کر اس کا خاتمہ کر کے اپنی منزل کی طرف روانہ ہو جائیں ۔"

چاروں مرہٹے اپنی تلواریں سونتتے اور ڈھالیں سنبھالے نصر الدین کی طرف بڑھے ۔نصر الدین نے اپنی تلوار اور ڈھال اپنے سامنے کر لی تھی اور اسی مرہٹے کو مخاطب کرتے ہوئے اس نے کسی ساحر و جذاب کے سے شعبدہ و رنگ میں کہا "تمہارے اس قلق سے کیا فائدہ اس اضطراب سے کیا حاصل جس رفتار سے تم میری طرف بڑھ رہے ہو اس سے کہیں زیادہ تیز رفتاری کے ساتھ میں تم سب کو موت کی اترائی میں دھکیل دوں گا ۔لکھ رکھو ! اس وادی میں تمہیں میں ایسے زخم دوں گا جو شفا کی دسترس سے باہر ہوں گے ۔"

چاروں مرہٹے آگے بڑھ رہے تھے ۔نصر الدین کے چہرے پر ایک انوکھی سرخوشی و سکون اور ایک عجیب انتظار و اُمید کا سماں تھا ۔اس کے تیور زمان و مکان کی ہر قید اور دسترس سے آزاد و مبرا تھے ۔شاید وہ کوئی اہم فیصلہ کر چکا تھا مرہٹے

جب قریب ہوئے تو نصرالدین حرکت میں آیا۔ اس نے مرہٹوں کو پہلے حملہ کرنے کا موقع ہی نہ دیا اور خود سیلابی پانی کے شور جیسی سختی کے ساتھ وہ ان پر ٹوٹ پڑا تو اپنے پہلے ہی حملے میں اس نے ان میں سے ایک کا خاتمہ کر دیا اور پھر پینترا بدل کر پیچھے ہٹ گیا تھا۔

اپنے ایک ساتھی کو مرتے دیکھ کر مرہٹے اور زیادہ بپھر گئے تھے اور دیوار وار آگے بڑھتے ہوئے وہ بھوکے کرگسوں اور طمع کے مارے زاغوں کی طرح نصرالدین پر حملہ آور ہو گئے تھے۔ رسیوں میں جکڑے ہوئے دونوں جوان یہ مقابلہ حیرت اور پریشانی سے دیکھ رہے تھے۔

نصرالدین ان تینوں مرہٹوں کے سامنے چند ثانیوں تک اپنے دفاع تک محدود رہا۔ پھر آہستہ آہستہ اُس کی حالت بدلنے لگی، اس کی نگاہوں کی تنویر دل کا رے فراز بڑھتا رہا اور اس کے حملوں کی آہنگی و توازن میں وحشت و بربریت کا رنگ غالب آنے لگا تھا۔ دفعتاً نصرالدین بپھر گیا اور دفاع سے نکل کر وہ جارحیت پر اُتر آیا تھا۔ مرہٹے جو تھوڑی دیر قبل تک بڑے پُرسکون ہو کر حملہ آور ہو رہے تھے اب اپنے سامنے نصرالدین کو لحظہ بہ لحظہ آفت اور طوفان کی شکل اختیار کرتے دیکھ رہے تھے۔ وہ محسوس کر رہے تھے کہ اونٹ کٹارے اور کانٹوں سے بھری ہوئی اس وادی میں وہ کسی انسان کی بجائے ہولناک اور مہیب عفریت کا سامنا کر رہے ہوں۔

انہوں نے نصرالدین کو گھیر کر ختم کرنا چاہا تھا لیکن اس کے تابڑتوڑ اور دھواں دھار حملوں نے ان کی ہر کوشش کو ناکام اور ان کی ہر اُمید کو یاس میں بدل دیا تھا۔ نصرالدین کی آتشی تلوار کے تیز حملوں نے ان تینوں مرہٹوں کو سراسیمہ اور وحشت زدہ کر دیا تھا۔

دریاؤں کے خروش کی طرح نصرالدین نے اللہ اکبر کی صدا بلند کی اور اپنی تلوار کو حیرت انگیز سرعت کے ساتھ اس نے دائیں طرف گھما کر گراتے ہوئے ان میں ایک اور مرہٹے کو ڈھیر کر کے رکھ دیا تھا۔ دوسرے دو ابھی اپنے ساتھی کی اس اچانک موت پر وحشت زدہ اور پریشان کن حالت میں دیکھ رہے تھے کہ نصرالدین نے اُنہیں سنبھلنے کا موقع دیئے بغیر اپنے پورے قہر اور عذاب کے ساتھ ان پر نزول کر دیا تھا۔ اپنے تیز اور پُرجوش حملوں میں اب وہ ان دونوں کو دھکیلتا ہوا دور تک لے گیا تھا۔ دفعتاً اس نے ان میں سے ایک کے مُنہ پر اپنی ڈھال دے ماری اور جب وہ اپنا توازن کھو کر لڑکھڑایا تو نصرالدین نے اس کی گردن بھی کاٹ کر رکھ دی تھی۔ اب مقابلے پر وہی مرہٹہ اکیلا اور تنہا رہ گیا تھا جو شروع میں بہت بڑھ بڑھ کر نصرالدین سے گفتگو کر رہا تھا۔

نصرالدین نے اس پر ایک قہر آلود نگاہ دوڑاتے ہوئے کہا۔ ”میں نے تمہیں کہا نہ تھا کہ میں تم سب کو موت کی اترائی میں دھکیل دوں گا، سو دیکھ میں نے اپنا عہد پورا کر دکھایا۔ تُو حیران و پریشان اور حواس باختہ کیوں کھڑا ہے۔ کچھ بول کوئی جواب دے۔ ورنہ میں تجھے بھی اوکھلی میں ڈال کر موصلی سے کوٹ دوں گا۔

اس ویرانے میں آخری مرہٹہ نصرالدین کے سامنے کسی بے فصیل شہر کی مانند اُداس اور افسردہ کھڑا تھا۔ سردی کے باوجود اس کا چہرہ پسینے سے تر، اس کی ٹانگوں میں کپکپاہٹ اور اس کی آنکھوں میں وحشت و ہراس تھا۔ نصرالدین اپنی تلوار لہراتا ہوا اس پر حملہ آور ہونے کے لیے جب آگے بڑھا تو اچانک وہ مرہٹہ واپس مڑا اور بھاگ کھڑا ہوا۔ شاید وہ ایسے خطرناک اور پُرہول دشمن سے مقابلہ کرنا نہ چاہتا تھا لہٰذا جان بچانے کی خاطر وہ اس طرف بھاگا جس طرف ان کے گھوڑے چر رہے تھے۔

نصرالدین بھاگ کر اپنے گھوڑے کے پاس آیا فوراً اس نے زین سے لٹکتی کمان سنبھالی اور چلّہ میں تیر چڑھا کر اس نے اپنی بپھرتی آواز میں کہا۔ ”رک جاؤ۔ اس طرح بھاگ کر تم اپنی جان نہ بچا سکو گے۔ یاد رکھو میرے تیر زہریلے اور میرا نشانہ بے خطا ہے۔

مرہٹے نے نصرالدین کی تنبیہہ کو نظر انداز کر دیا اور اپنے گھوڑوں کی طرف بھاگتا رہا۔ نصرالدین نے فوراً تیر چلا دیا اور سنسناتا ہوا اس کا تیر پشت کی طرف سے

اس مرہٹے کا دل چیرتا ہوا نکل گیا تھا۔ اس پُراسرار اور ویران وادی میں مرہٹے کی دل خراش چیخ بلند ہوئی پھر وہ زمین پر گر کر دم توڑ گیا تھا۔ نصرالدین بھاگ کر ا کی طرف بڑھا۔ اس نے دیکھا وہ ختم ہو گیا تھا۔ اس نے مرہٹے کے جسم سے اپنا کھینچ لیا تھا۔ پہلے وہ اِن دونوں کے پاس آیا جو ابھی تک رسیوں میں جکڑے ہو تھے اپنا خنجر نکال کر نصرالدین نے اِن دونوں کی رسیاں کاٹ دیں اور پانی کی ن دھار کی طرف جاتے ہوئے اس نے کہا۔ "مَیں اپنی تلوار اور تیر صاف کر لوں پھ مَیں تم دونوں کی طرف آتا ہوں۔ وہ آگے بڑھا اور بہتے پانی کے کنارے خشک ریت پر بیٹھ کر اپنی خون آلود تلوار اور تیر صاف کرنے لگا تھا۔

رسّیوں سے آزاد ہونے والوں میں سے ایک ہندو اور ایک مُسلمان تھا ہندو نے مُسلمان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "اسمٰعیل! اسمٰعیل! یہ سوار کیسا زبردا اور شیر دِل ہے۔ اگر مَیں کسی علاقے کی سلطنت کا حکمران ہوتا تو ایسے آہن شکن جوان کو اپنا سالارِ اعلیٰ بناتا۔ کیا تم اسے جانتے ہو"۔

مُسلمان جس کا نام اسمٰعیل تھا اس نے اس ہندو کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "اسے مَیں ہی نہیں سرنگاپٹم کا ہر طبقہ جانتا ہے۔ یہ ترک ہے اور اس کا خاندان ترکوں کے شہر خیوا سے ہجرت کر کے یہاں سرنگاپٹم میں آباد ہو گیا تھا۔ اس کا نام نصرالدین ہے۔ یہ ان جوانوں میں سے ایک ہے جسے سلطان حیدر علی عزیز و محبوب رکھتے ہیں۔ اس کے علاوہ یہ سلطان کے محافظ دستے کا سالار ہونے کے علاوہ جنگوں میں اس کے ہراول دستوں کا کمانڈر بھی ہوتا ہے۔ اس کی شجاعت بے عیب اور اس کا حوصلہ قابل شکن ہے۔ ستیہ جیت! اس کے مقابلے پر تو صرف چار مرہٹے تھے اگر وہ دس بھی ہوتے تو بھی یہ انہیں خزاں کے پتّوں کی طرح روند ڈالتا ——

وہ ہندو نوجوان جس کا نام ستیہ جیت تھا اسمٰعیل سے کچھ کہنا چاہتا تھا خاموش ہو گیا۔ کیونکہ نصرالدین اپنی تلوار اور تیر صاف کرنے کے بعد دوبارہ ان دو کی طرف آ رہا تھا۔ قریب آ کر نصرالدین نے پوچھا۔ "اسمٰعیل! اسمٰعیل! تمہارے ساتھ تمہارے دو اور ساتھی بھی تھے جن میں سے ایک تو سلطان حیدر علی کے پاس پہنچ چکا ہے، تمہارا دوسرا ساتھی کہاں ہے؟"

اسمٰعیل نے سوگوار سی آواز میں کہا۔ "اپنے دوسرے ساتھی کا مجھے کچھ علم نہیں کہ وہ کہاں ہے۔ ہم بدنور شہر میں ایک دوسرے سے بچھڑ گئے تھے"۔

نصرالدین نے پھر پوچھا۔ "کیا تم نے بدنور کے اس ہندو نوجوان سے ملنے کی کوشش کی تھی جس کا تعلق بدنور کے قدیم حکمران طبقے سے ہے اور جو بدنور کے تخت کا دعوے دار بھی ہے"۔ اسمٰعیل نے ستیہ جیت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"یہ نوجوان وہی ہے اس کا نام ستیہ جیت ہے"۔ نصرالدین نے ہاتھ آگے بڑھا کر ستیہ جیت سے مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔ "مجھے خوشی ہوئی کہ بدنور پہنچنے سے قبل ہی میری تم سے ملاقات ہو گئی"۔

ستیہ جیت نے ہکلاتے ہوئے کہا۔ "بدنور کی رانی سرگتی کو علم ہو گیا تھا کہ مَیں سلطان حیدر علی کے ساتھ مِل کر اُسے تخت سے محروم کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ میرے خیر خواہوں نے مجھے پہلے ہی اس کی خبر کر دی۔ لہٰذا ہم رات کے وقت وہاں سے بھاگ نکلے اور ہماری بدقسمتی یہ کہ ہم ایک دوسرے سے بچھڑ گئے میں، اسمٰعیل اور میرا ایک ساتھی چیتل درگ کی طرف بھاگے تھے۔ اس شہر میں میرا ماموں ہے اور اس شہر کا پالیکار (حاکم) خود مختار ہے"۔

ستیہ جیت ذرا رُکا پھر وہ کہہ رہا تھا۔ "رانی کے سپاہیوں نے ہمارا تعاقب کیا اور ہماری بدقسمتی کہ انہوں نے ہمیں گرفتار کر لیا۔ وہ ہمیں بدنور واپس لے جا رہے تھے کہ یہاں سے کوئی پانچ کوس پیچھے میرے ساتھی نے بھاگنے کی کوشش کی اور رانی کے ان آدمیوں نے جو آپ کے ہاتھوں مارے گئے ہیں اُسے قتل کر دیا"۔

نصرالدین نے بیچ میں بولتے ہوئے کہا۔ "راستے میں تمہارے دوست کی لاش مَیں نے دیکھی تھی اسے گِدھ نوچ رہے تھے۔ مَیں نے اسے دفن کر

دیا تھا"۔ نصرالدین نے اب اسماعیل کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"تمہارا ساتھی جو بھاگ کر سلطان کے پاس گیا تھا اس نے سلطان کو اطلاع دی ہے کہ رانی ظالم اور فاحشہ ہے"۔ اسمٰعیل نے تائید کرتے ہوئے کہا۔ "اس نے ٹھیک اطلاع دی ہے۔ رانی کا شوہر جس کا نام شوم شنکر تھا مر چکا تھا۔ رانی انتہا کی عیاش اور فاحشہ ہے اس نے اپنے ایک کرناٹکی غلام کو جو ذات کا شودر ہے شوہر کا درجہ دے رکھا ہے اس نے دوسری شادی نہیں کی اور ہر وقت اپنے لیے عیش و عشرت کی بساط بچھائے رکھتی ہے۔ اب تو اس شودر غلام کے ساتھ اس کی رنگ رلیاں عام لوگوں میں بھی مشہور ہو گئی ہیں۔ رانی کی ان عیاشیوں کی وجہ سے یہاں کی خانہ نشین عورتیں بھی بے حیائی کی طرف مائل ہوتی جا رہی ہیں اور بازاروں میں سرِعام شہر کی عورتیں ایسی ایسی قبیح اور گھناؤنی حرکات کرنے لگی ہیں جنہیں ایک غیرت مند انسان کبھی برداشت نہیں کر سکتا"۔

"رانی نے بدنور شہر سے پانچ کوس کے فاصلے پر گوبی درگ کے جنگل میں پہاڑ کے اُوپر ایک مضبوط قلعہ بنا رکھا ہے اور جو بھی اس کے خلاف آواز بلند کرتا ہے وہ اسے اس قلعے میں بند کر دیتی ہے۔ وہ ہر وقت مردانہ لباس پہن کر رکھتی ہے اور بلا کی ہوشیار، دلیر اور جرأت مند ہے"۔

نصرالدین نے کچھ سوچتے ہوئے پوچھا "تمہارا کیا خیال ہے تمہارا دوسرا ساتھی کہاں ہے"۔

اسمٰعیل نے پریشانی میں کہا "مجھے اندیشہ ہے کہیں وہ پکڑا نہ گیا ہو"۔

نصرالدین نے فیصلہ کُن انداز میں کہا "میں یہاں تم دونوں سے جُدا ہوتا ہوں۔ تم دونوں چیتل درگ چلے جاؤ میں بدنور روانہ ہوں گا مجھے سُلطان حیدر علی نے اس لیے روانہ کیا ہے کہ میں سلطان کو بدنور کی رانی کے اطوار، وہاں کے طرزِ حکمرانی، نظم و نسق اور رانی کی فوجی قوت اور تعداد کے متعلق تازہ اطلاعات فراہم کروں اور اس کے لیے میرا بدنور جانا ضروری ہے۔ بدنور کے اَن گنت

ہندوؤں نے رانی کی عیاشی اور مظالم سے تنگ آ کر سلطان حیدر علی کو حملہ آور ہونے کی دعوت دی اور میرا بدنور جانا اس سلسلے کی پہلی کڑی ہے۔

ستیہ جیت نے نصرالدین کی طرف دیکھتے ہوئے بڑی آس اور اُمید میں کہا۔ "میں نے بدنور سے بھاگتے وقت اپنی چھوٹی بہن کے متعلق کچھ نہ سوچا تھا۔ ظالم رانی نے اس کے ساتھ نہ جانے کیا سلوک کیا ہوگا۔ کاش میں اسے وہاں سے پہلے ہی بھگا چکا ہوتا"۔

نصرالدین نے اُسے تسلی دیتے ہوئے کہا "تم فکرمند نہ ہو۔ میں وہاں تمہاری بہن کا پتہ کرنے کی کوشش بھی کروں گا"۔ ستیہ جیت نے آگے بڑھ کر نصرالدین کے دونوں ہاتھ تھامتے ہوئے کہا۔ "بھگوان آپ کا بھلا کرے گا۔ بدنور میں داخل ہو کر آپ سیدھے ہماری حویلی میں جائیں۔ شہر کے شمالی حصّے میں شہر کا سب سے بڑا مندر ہے۔ اس مندر کے کلس سونے کے ہیں اور اس مندر کے عین سامنے ہماری حویلی ہے۔ ہماری حویلی کی نشانی یہ ہے کہ اس کا پھاٹک بہت بڑا ہے۔ کبھی اس پھاٹک سے ہاتھی اندر داخل ہُوا کرتے تھے اس کے علاوہ حویلی کی دیواروں پر اندر کی طرف رات کی رانی کے پودے پھیلے ہوئے ہیں۔ مندر کا صدر دروازہ عین ہماری حویلی کے دروازے کے سامنے ہے"۔

ستیہ جیت نے ذرا رُک کر کہا۔ "میری بہن کا نام سمیتا ہے۔ اگر وہ حویلی سے بھاگ گئی ہو تو مجھے اُمید ہے کوئی اسے گرفتار نہ کر سکے گا۔ کیونکہ آج تک وہ کبھی اپنی حویلی سے باہر نہ نکلی تھی۔ اپنے بائیں طرف کے ہمسایوں کے علاوہ کوئی اسے نہیں پہچانتا۔ بھگوان کرے وہ بھاگ گئی ہو یا اس نے حویلی چھوڑ کر ان ہمسایوں کے ہاں پناہ لے لی ہو جو اسے جانتے ہیں۔ اگر وہ رانی کے ہاتھ چڑھ گئی تو وہ اسے قتل کرا دے گی"۔

نصرالدین نے ستیہ جیت کی پیٹھ تھپتھپاتے ہوئے کہا۔ "تم کوئی فکر کوئی اندیشہ نہ کرو اگر میرے بس میں ہوا تو میں تمہاری بہن کی جان بچانے کی بھی کوشش کروں گا۔ میں بدنور میں چند یوم رُک کر ضروری اطلاعات حاصل کروں گا اس کے بعد میں واپس

لوٹ جاؤں گا۔ اگر مجھے تمہاری بہن مل گئی تو میں اسے کہاں پہنچاؤں"۔

ستیہ جیت نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔" اگر وہ آپ کو مل جائے تو آپ چتیل درگ میں لے آئیں۔ وہاں مشکیزہ گروں کے بازار میں میرے ماموں کی حویلی ہے آپ کو یہ حویلی تلاش نہ کرنا پڑے گی اس لیے کہ میری بہن سمیتا اسے اچھی طرح جانتی ہے اگر وہ آپ کو اپنی حویلی کے اندر نہ ملے تو ہمارے حویلی کے بائیں طرف بدنور کے ایک ساہوکار مادھو راؤ کی حویلی ہے اس کے ساتھ ہمارے خاندان کے پرانے مراسم ہیں۔ وہ آپ کو بتا سکے گا کہ میری بہن کہاں ہے۔ میں خود آپ کے ساتھ چلتا لیکن ان حالات میں میرا بدنور جانا آگ میں کودنے کے مترادف ہے۔ کیا میں اُمید رکھوں آپ وہاں میری بہن کی حفاظت کریں گے"۔

نصرالدین نے ستیہ جیت کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے پیار سے کہا۔ "ستیہ جیت! ستیہ جیت! تم اگر ہمارے ساتھ اس قدر تعاون کر رہے ہو تو یاد رکھو، تمہاری بہن اگر کسی مصیبت میں بھی گرفتار ہوگئی ہوئی تو بھی میں اسے ضرور تمہارے پاس لے کر آؤں گا۔

ستیہ جیت نے اپنا لباس ٹٹولا پھر اس نے ایک چور جیب سے ایک قیمتی انگوٹھی نکالی اور اسے نصرالدین کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔" آپ یہ انگوٹھی اپنے پاس رکھ لیں۔ میری بہن بہت محتاط اور ڈرپوک ہے، ہوسکتا ہے وہ آپ کو حویلی میں نہ گھسنے دے ایسی صورت میں یہ انگوٹھی اس کے اطمینان اور اعتماد کے لیے کافی ہو گی۔ یہ انگوٹھی ہمارے خاندان میں اس وقت سے چلی آتی ہے جب ہمارا خاندان بدنور پر حکومت کرتا تھا۔ یہ انگوٹھی دیکھ کر وہ بلا جھجک آپ کے ساتھ سفر کرنے پر آمادہ ہو جائے گی"۔

نصرالدین نے انگوٹھی لے کر اپنی جیب میں ڈال لی تھی۔ اس بار اسمٰعیل نے نصرالدین کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ کیا آپ کے پاس کھانے کو کچھ ہے۔ آپ کے ہاتھوں ان مرنے والوں نے ہمیں کچھ نہیں کھانے دیا بلکہ ہمارے پاس جو کھانے کا سامان تھا وہ بھی یہ چھین کر کھا گئے ہیں"۔

ستیہ جیت نے اعتراض کرتے ہوئے کہا۔" نہیں اسمٰعیل! ان سے کھانے کا سامان نہیں لینا چاہیئے۔ ان کی منزل ابھی دُور ہے۔ انہیں کافی مسافت طے کرنی ہے۔ ان مرنے والوں کے گھوڑے وہ چور رہے ہیں پہلے انہیں پکڑتے ہیں ان کی زینوں کے ساتھ لٹکتی خرجینوں میں کھانے کا کافی سامان ہے"۔

نصرالدین نے بڑی انکساری سے کہا۔" میرے پاس کافی زادِ راہ ہے اسے تم لے لو میں راستے میں کسی سرائے یا بھٹیارے سے اور انتظام کر لوں گا"۔

اسمٰعیل نے آگے بڑھ کر نصرالدین کے ہاتھ تھامتے ہوئے کہا۔" اے میرے سالار! ستیہ جیت ٹھیک کہتا ہے۔ مجھ سے غلطی ہوئی پہلے ہمیں ان گھوڑوں کو پکڑنا چاہیئے، ان میں ہمارے اپنے تین گھوڑے بھی تو شامل ہیں۔ تیسرا گھوڑا ہمارے مرنے والے ساتھی کا ہے"۔

اسمٰعیل اور ستیہ جیت ان گھوڑوں کی طرف چل پڑے۔ نصرالدین بھی ان کے ساتھ ہو لیا تھا۔ تینوں نے مل کر گھوڑوں کو پکڑ لیا اور جب انہوں نے مرنے والوں کی خرجینوں کی تلاشی لی تو ان میں سے اس قدر کھانے کی اشیاء نکلیں جو اُن سب کے لیے تین روز تک کے لیے کافی تھیں۔ ندی کے کنارے بیٹھ کر پہلے ان تینوں نے کھانا کھایا، پھر نصرالدین نے اسمٰعیل اور ستیہ جیت سے کہا۔" تم دونوں یہ سارے گھوڑے اپنے ساتھ لے جاؤ۔ وہاں جا کر جو ضرورت سے زیادہ ہوں انہیں بیچ دینا۔ اس طرح حاصل ہونیوالی رقم تمہارے کام آئے گی"۔

اسمٰعیل اور ستیہ جیت نے سب گھوڑوں کو ایک دوسرے سے باندھ دیا اور جب وہ وہاں سے کوچ کرنے لگے تو نصرالدین نے اسمٰعیل کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔" اسمٰعیل! اسمٰعیل! جس طرح تم نے اس وقت ایک ہندو کشتری کا بھیس بدل رکھا ہے ستیہ جیت کے ساتھ چتیل درگ میں اسی حلیے اور بھیس میں رہنا۔ ایک مسلمان کی حیثیت میں تمہارے لیے وہاں کئی خطرات اُٹھ کھڑے ہوں گے۔ میں خود ایک کشتری کے بھیس میں بدنور شہر میں داخل ہوں گا اور سنو! چتیل درگ میں ستیہ جیت کی حفاظت کرنا۔ اسے یہ احساس نہ ہو

کہ یہ وہاں غریب الوطن ہے۔ گو وہ شہر خود تمہارے لیے بھی اجنبی اور پرایا ہے پھر بھی ستیہ جیت کی حفاظت تم پر فرض ہے کیونکہ یہ سلطان حیدر علی کو بدنور پر حملہ کرنے کی دعوت دے چکا ہے اس لیے بدنور پر حملہ کرنے سے قبل سلطان ضرور ستیہ جیت سے ملنا پسند کریں گے۔"

نصرالدین نے ذرا رُک کر کہا۔ "گو جن اطلاعات کی غرض سے میں بدنور جا رہا ہوں، اُن میں سے بہت کچھ مجھے ستیہ جیت سے بھی حاصل ہو سکتا ہے لیکن میرا بدنور جانا اب اور ضروری ہو گیا ہے۔ ایک تو میں ستیہ جیت کی بہن کو وہاں ڈھونڈنے کے علاوہ تمہارے دوسرے ساتھی کو بھی تلاش کروں گا۔ اس کے علاوہ میں چند یوم وہاں رہ کر جنگی نقطہ نظر کی اطلاعات حاصل کروں گا۔ اب آؤ یہاں سے کوچ کریں۔"

تینوں اپنے گھوڑوں پر سوار ہوئے اور ایک دوسرے سے بندھے ہوئے گھوڑوں کو اپنے آگے آگے ہانکنے لگے تھے۔ تین میل آگے جا کر وہ ایک دوراہے پر رُک گئے وہاں سے اسمٰعیل اور ستیہ جیت فالتو گھوڑوں کے ساتھ بائیں ہاتھ اس شاہراہ پر چڑھ گئے تھے جو جیتل درگ کی طرف جاتی تھی جب کہ نصرالدین سامنے جانے والی اس شاہراہ پر اپنے گھوڑے کو ایڑ لگا کر سرپٹ دوڑا چکا تھا جو بدنور کی طرف جاتی تھی۔

عشاء کے قریب نصرالدین بدنور شہر میں داخل ہو رہا تھا۔ اس شہر کا دوسرا نام نگر بھی تھا۔ وہ ہندو کھشتریوں کے بھیس میں تھا اور اپنے گھوڑے پر سوار وہ بے دھڑک شہر میں داخل ہو گیا تھا۔ وہ سیدھا شہر کے شمالی حصّے کی طرف گیا اور سنہری کلس والے اس بڑے مندر کی تلاش کرنے لگا جس کی نشاندہی اسے ستیہ جیت نے کی تھی۔ تھوڑی دیر کی تلاش کے بعد وہ اس مندر کو ڈھونڈنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔

مندر کے اندر خوب روشنی ہو رہی تھی اور اس کے اندر کچھ لوگوں کے باتیں کرنے کی آواز بھی سنائی دے رہی تھی۔ نصرالدین نے گھوڑے پر بیٹھے ہی بیٹھے مندر سے سامنے والی حویلی کی طرف دیکھا وہ پوری طرح اندھیرے اور تاریکی میں ڈوبی ہوئی

تھی۔ وہ حویلی کو پہچاننے کی کوشش کرنے لگا تھا۔ حویلی کا پھاٹک واقعی بہت بڑا تھا اور دیواروں کے اندر کی جانب رات کی رانی کے پودے بھی تھے۔

نصرالدین گھوڑے سے اُترا، احتیاط کے طور پر اس نے زین سے لٹکتی ہوئی اپنی ڈھال سنبھال لی تھی۔ گھوڑے کو اس نے ایک تاریک کونے میں کھڑا کر دیا اور اپنے سر پہ اپنا آہنی خود درست کرتا ہوا پھاٹک کی طرف بڑھا اس نے اپنے لباس کے نیچے بہترین زرہ پہن رکھی تھی۔ بازوؤں پر آہنی جوشن اور کندھوں پر لوہے کے خول تھے۔ پہلے اس نے وسیع اور کھلی گلی میں اِدھر اُدھر دیکھا کوئی بھی نہیں تھا۔ اِرد گرد اُجاڑ غاروں کی سی ویرانی اور گہری تاریکی میں ٹوٹے ہوئے چراغ جیسی افسردگی اور بے رونقی تھی۔ صرف مندر کے اندر سے کچھ آدمیوں کے باتیں کرنے کی آوازیں سُنائی دے رہی تھیں۔

نصرالدین نے آگے بڑھ کر پھاٹک پر دستک دی۔ اپنا ہاتھ احتیاطاً وہ اپنی تلوار کے دستے پر لے گیا تھا۔ تھوڑی دیر بعد دروازہ کھلا۔ دروازہ کھولنے والا ایک دراز قد جوان تھا اس نے نصرالدین سے سرگوشی کرتے ہوئے کہا۔ "اندر آ جائیے۔ آپ کا یوں باہر کھڑے رہنا کئی اوہام اور شبہے کھڑے کر دے گا۔ آج کل اس حویلی پر سرکار کی گہری نظر ہے۔ نصرالدین فوراً اندر چلا گیا اور اس کے پیچھے اس جوان نے دروازہ بند کر دیا تھا۔ صحن کے اندر نصرالدین چند قدم ہی آگے بڑھا تھا کہ وہ چونک کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے دیکھا چاروں طرف سے چھ مسلح جوانوں نے اسے اپنے گھیرے میں لے لیا۔ نصرالدین سارے معاملے کو فوراً بھانپ گیا تھا اس نے محسوس کر لیا تھا کہ اس کے چاروں طرف موت اپنا شکنجہ بُری طرح کس چکی تھی۔

ایک جھٹکے کے ساتھ اس نے اپنی تلوار بے نیام کی اور اپنے دائیں طرف کے دو جوانوں پر ایسی پھرتی، ایسے غضب اور ایسے قہر سے وہ حملہ آور ہُوا تھا کہ پلک جھپکنے میں وہ برق کے ایک کوندے کی مانند ان پر حملہ آور ہُوا اور ان دونوں کو ڈھیر کر کے رکھ دیا۔ دوبارہ وہ اپنی اسی جگہ آ کھڑا ہُوا تھا جہاں سے اس نے اپنے حملے

کی ابتدا کی تھی ۔

جس جوان نے دروازہ کھولا تھا اس نے ایک بھیانک قہقہہ لگاتے ہوئے نصرالدین سے کہا ۔ "تو کیا ہمارے دو ساتھیوں کو ختم کرنے کے بعد تم یہ سمجھنے لگے ہو کہ تم اپنے آپ کو محفوظ کر چکے ہو ابھی تم پر برسنے کے لیے ہماری پاس چار چمکیلی اور آب دار تلواریں ہیں ۔ اس کے ساتھ ہی وہ چاروں ایک طرف جمع ہو گئے تھے ۔

نصرالدین نے اپنی خون آلود تلوار ان کے سامنے لہراتے ہوئے کہا ۔ بدکرداریا کی نسلو! مکاروں کی اولادو! تم سب آگے بڑھ کر تو دیکھو میں لوہے کا عصا بن کر تم پر برسوں گا اور کمہار کے برتن کی طرح چکنا چور کر دوں گا ۔ یاد رکھو! میں کسی کا بخت، کسی کی تقدیر بن کر اس حویلی میں داخل ہوا تھا ۔ یہ بھی جان رکھو! میرے پاس حوصلے کی کمی نہ ہمت کا قحط ہے تم سب کے غصے کی جو دیگ جوش مار رہی ہے میں اسے بہت جلد ٹھنڈا کر کے تم سب کو ورطۂ ہلاکت میں جھونک دوں گا رہا نہ مردودو! چاروں ایک ساتھ آگے بڑھ کر مجھ پر حملہ کرو پھر دیکھو میں تمہاری کیا حالت اور کیسی درگت بناتا ہوں ۔ اس اندھیری رات میں تم سب کے دل کے آبگینے پاش پاش کر کے اور تم پر لدی ساری بدی کو اتار کر میں اپنی منزل کی طرف روانہ ہو جاؤں گا ۔

وہ ابھی سوچ ہی رہے تھے کہ کس پہلو سے نصرالدین پر حملہ آور ہوں کہ وہ پہلے ہی حرکت میں آ گیا اور چنگارتی برہنہ بجلیوں کی طرح وہ ان چاروں پر حملہ آور ہو گیا تھا ۔ اس کی تلوار اور ڈھال باری باری جچے تلے انداز میں ابھرنے اور ڈوبنے لگی تھی یوں لگتا تھا اندھیری رات میں ذات کا وہ ترک اور سرفروش مجاہد زمین کی ساری درزوں کو کھولنے اور کسی ورقِ ناخواندہ کی ابتدا کرنے کا عزم کر چکا ہو ۔ اپنے حملوں میں وہ المیوں کے سارے مراحل طے اور پرانی داستانوں کے سب ابواب بند کر رہا تھا ۔ جلد ہی دو اور اس مجاہد کی تلوار کا شکار ہو کر زمین پر گر گئے تھے ۔ ان مرنے والوں کی چیخیں باہر دور تک سنائی دی تھیں ۔

کچھ لوگ باہر گلی میں دروازہ پیٹ پیٹ کر اسے کھولنے کو کہہ رہے تھے

نصرالدین نے اسے اپنے لیے ایک اور ابھرتا ہوا خطرہ جانا ۔ باقی دو بچنے والوں میں سے اچانک ایک کے منہ پر ڈھال اور دوسرے کے سر پر تلوار دے ماری تھی ۔ وہ دونوں اس کے سامنے زمین پر گر گئے تھے ۔ نصرالدین نے نیچے جھک کر ان دونوں کی گردنیں کاٹ دیں اور خود وہ بھاگ کر رات کی رانی کے پودوں کی اوٹ میں ہو گیا تھا ۔ اتنے میں باہر سے کسی نے کسی کو مخاطب کر کے کہا ۔

" دیوار پھاند کر اندر جاؤ اور دیکھو اندر کون لڑ رہا ہے ۔ ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے جنگ بند ہو گئی ہو کیونکہ تلواروں اور ڈھالوں کے ٹکرانے کی آوازیں بند ہو گئی ہیں اور حویلی میں خاموشی چھا گئی ہے ۔"

نصرالدین اوٹ میں چھپا رہا ۔ اتنے میں ایک آدمی دیوار پھاند کر اندر آیا اور حویلی کا بڑا پھاٹک کھولنے لگا تھا ۔ نصرالدین فوراً حرکت میں آیا ایک لمبی زقند کے ساتھ وہ دیوار پر چڑھنے کے بعد اس پر پیٹ کے بل لیٹ گیا اور باہر کھڑے لوگوں پر نگاہ رکھنے لگا ۔ اندھیرے میں وہ انہیں صحیح طرح گن نہ سکا تھا تاہم وہ تعداد میں پانچ سات کے قریب تھے اور سبھی غیر مسلح تھے ۔

جب دروازہ کھلا اور باہر کھڑے سب آدمی حویلی کے اندر چلے گئے، تو نصرالدین باہر پھلانگ گیا وہ بھاگ کر ادھر گیا جہاں اس نے اپنا گھوڑا کھڑا کیا تھا لیکن وہ یہ دیکھ کر دنگ رہ گیا کہ اس تاریک کونے میں اس کا گھوڑا نہیں تھا ۔ نہ جانے وہ کہاں چلا گیا تھا ۔ وہ ابھی سوچوں میں پریشان کھڑا تھا کہ بائیں طرف والے مکان سے ایک بوڑھا بھاگتا ہوا نکلا اس نے فوراً نصرالدین کا بازو پکڑ لیا اور جس مکان سے وہ نکلا تھا نصرالدین کو اس طرف کھینچتے ہوئے اس نے کہا ۔ "میرے ساتھ آؤ یہاں ہر لمحہ تمہارے لیے خطرناک ہے ۔ یاد رکھو! میں تمہارا دشمن نہیں دوست ہوں ۔" نصرالدین اس بوڑھے کے ساتھ بھاگ کر اس کے مکان میں داخل ہو گیا تھا ۔

اس بوڑھے نے نصرالدین کو ایک کمرے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے

کہا۔ "تم اِدھر بیٹھو، میں ابھی آتا ہوں"۔ نصرالدین بلا جھجک اس کمرے میں داخل ہو گیا۔ بوڑھے نے فوراً دروازہ بند کر کے باہر سے زنجیر لگا دی۔ اس بوڑھے کے باہر سے دروازہ بند کرنے پر نصرالدین چونک اُٹھا تھا۔ اسے شک ہو گیا تھا کہ بوڑھا اس کے ساتھ دھوکہ اور فریب کرے گا۔ وہ بھاگ کر دروازے پر آیا اور اُسے کھینچ کر دیکھا۔ دروازہ باہر سے بند تھا۔

نصرالدین پریشان سا ہو گیا تاہم کسی متوقع خطرے سے نمٹنے کی خاطر اس نے دروازے کو اندر سے زنجیر لگا لی اور کمرے کے ایک طرف بچھی نشستوں میں سے ایک پر بیٹھ گیا۔ اس نے کمرے میں جلتی کافوری شمع کی روشنی میں دیکھا وہ ایک خاصا بڑا کمرہ تھا جسے بڑی محنت سے سجایا گیا تھا اور پھر اس کی صفائی اور ستھرائی نے اس کی جاذبیت اور سکون میں اور اضافہ کر دیا تھا۔ اپنی تلوار بے نیام کر کے نصرالدین نے اپنے پہلو کی نشست پر رکھ لی اور اپنے آپ کو اس نے حالات کے سپرد کر دیا تھا۔

وہاں بیٹھے بیٹھے نصرالدین کو تھوڑی ہی دیر ہوئی تھی کہ اسے محسوس ہوا باہر سے کوئی دروازے کی زنجیر کھول رہا ہو۔ نصرالدین اُٹھ کر کھڑا ہوا اور اپنی تلوار ڈھال سنبھال کر وہ مستعد ہو گیا تھا اتنے میں باہر سے اسے اسی بوڑھے کی آواز سنائی دی۔ "دروازہ کھولو! تم نے اندر سے زنجیر کیوں لگا لی۔ یہاں تمہیں کوئی خطرہ نہیں ہے بیٹے!" نصرالدین آگے بڑھا اور دروازہ اس نے کھول دیا۔ وہی بوڑھا کمرے میں داخل ہوا اس کے پیچھے پیچھے دو جوان لڑکیاں بھی اندر آ گئی تھیں۔

کافوری شمع کی غبار آلود روشنی میں نصرالدین نے دیکھا ان میں سے ایک لڑکی عام سی شکل کی تھی لیکن دوسری کا حسن و خوبصورتی الامان والحفیظ، وہ یوں لگی تھی گویا تصوّر کی رعنائی کا طلسم یا بے خواب و بے چاند راتوں میں کوئی جگنو، وہ سپنوں کے نیلے دھندلکوں اور برکھا رُت کی دھنک جیسی حسین اور پُرکشش تھی اس کے شہابی ہونٹ آدھے کُھلے ہوئے تھے اور ان کے بیچ بیچ اس کے گہر تاب سفید دانت تانک جھانک کر رہے تھے۔

نصرالدین نے دیکھا اس کے ننگے بازو مکھن کی طرح چکنے اور اس کا چہرہ تازہ دودھ کی جھاگ جیسا پُرکشش تھا۔ نصرالدین نے یہ بھی دیکھا وہ بُتِ شنگرف، لالہ صحرا اور معدوم جنگلی پھول جیسی لڑکی نیچی شرمیلی آنکھوں کے ساتھ سکڑی سمٹتی ندی کی طرح اس بوڑھے کے پیچھے پیچھے کمرے میں داخل ہوئی تھی۔ جب وہ نصرالدین کے قریب کمرے میں آ کر کھڑی ہو گئی تو اسے یوں لگا گویا مخمل و کمخواب کا کوئی ڈھیر، جمالِ وحدت کی رعنائی اور سنبل کا کوئی بُت اس کے سامنے لا کر کھڑا کر دیا گیا ہو۔

نصرالدین اس وقت سنبھلا جب اس بوڑھے نے اسے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "اے اجنبی تو کون ہے اور تُو کس غرض سے ساتھ والی حویلی میں داخل ہوا تھا؟" نصرالدین نے اپنی ڈھال پشت پر لٹکانے اور تلوار نیام میں کرتے ہوئے کہا۔ "اگر میں غلطی پر نہیں تو آپ کا نام مادھو راؤ ہے اور آپ بدنور کے ساہوکار ہیں"۔

بوڑھے نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "اے نوجوان تیرا اندازہ درست ہے"۔ نصرالدین نے اس بار اس حسین لڑکی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "اگر میرے حواس درست کام کر رہے ہیں تو یہ لڑکی ستیہ جیت کی بہن ہے اور اس کا نام سمیتا ہے"۔

لڑکی نے چونک کر اس کی طرف دیکھا اس سمے نصرالدین کو یوں لگا کہ اس لڑکی کی آنکھیں نہیں بلکہ دو ستارے ہیں جن کا رُخ اس کے چہرے کی طرف کر دیا گیا ہو۔ پھر اس لڑکی نے اپنے تازہ برگِ زیتون جیسے شہابی ہونٹ کھولے اور اپنی نغموں کی جلترنگ جیسی آواز میں اس نے نصرالدین کو مخاطب کر کے پوچھا۔ "آپ کو میرے اور میرے بھائی کے متعلق کیسے خبر ہوئی؟"

نصرالدین نے لڑکی کی طرف سے نگاہیں ہٹا کر اس بوڑھے مادھو راؤ کی طرف اطمینان اور اعتماد کی خاطر دیکھا اور جواب میں مادھو راؤ کہہ رہا تھا۔ "تم شک نہ کرو۔ بلا جھجک کہہ دو جو تم کہنا چاہتے ہو، تمہارے سارے اندازے درست ہیں۔ یہ لڑکی سمیتا ہی ہے اور دوسری میری بیٹی سرسوتی ہے"۔

سمیتا نے بیچ میں بولتے ہوئے اپنی زمزمۂ سوز ناک جیسی آواز میں پھر پوچھا "آپ نے ابھی تک یہ نہیں بتایا کہ آپ مجھے اور میرے بھائی کو کیسے جانتے ہیں"۔ نصرالدین کچھ کہنے والا تھا کہ مادھوراؤ نے دروازہ اندر سے بند کرتے ہوئے کہا۔ "بیٹھ جاؤ پھر باتیں کرتے ہیں"۔ نصرالدین دوبارہ اپنی نشست پر بیٹھ گیا۔ سمیتا، مادھوراؤ اور سروتی اس کے سامنے والی نشست پر بیٹھ گئے تھے۔ پھر نصرالدین ان تینوں کو سمیتا کے بھائی ستیہ جیت سے ملاقات اس کے ساتھی کے مارے جانے اور چتیل درگ کی طرف اس کی روانگی کی ساری داستان سنا رہا تھا۔ جب وہ خاموش ہوا تو سمیتا نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"میں آپ کی ممنون ہوں کہ آپ نے میرے بھائی کو قید سے چھڑایا اور اس کی جان بچائی۔ ہم عمر بھر آپ کا یہ احسان نہ بھول سکیں گے۔ اس دنیا میں میرا صرف ایک بھائی ہی ہے۔ میرے ماں باپ پہلے ہی فوت ہو چکے ہیں۔ اب میرا بھائی ہی میرے ماں باپ کے خاندان کی واحد نشانی ہے"۔

سمیتا جب خاموش ہوئی تو نصرالدین نے مادھوراؤ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "ایک واقعہ میرے لیے پریشان کن ہے سمیتا کی حویلی میں داخل ہونے سے پہلے میں نے باہر گلی میں ایک تاریک کونے کے اندر اپنے گھوڑے کو کھڑا کیا تھا لیکن نہ جانے وہاں سے میرا گھوڑا کون لے گیا ہے۔ مادھوراؤ نے ہلکے ہلکے مسکراتے ہوئے کہا۔ "تم فکرمند نہ ہو تمہارا گھوڑا یہیں ہے۔ میں اسے پکڑ کر اپنی حویلی میں لے آیا تھا۔ میں نے اسے اصطبل میں باندھ دیا ہے اور اس کی زین اتار کر اسے دانہ چارہ ملا کر ڈال دیا ہے۔ تم نے جب سمیتا کی حویلی پر دستک دی تھی تو ہم تینوں اپنے بیرونی دروازے پر آ کھڑے ہوئے تھے۔ پہلے ہمیں شک گزرا تھا کہ ستیہ جیت آ گیا ہے لیکن تم قدکاٹھ میں خوب لمبے اور جسمانی ساخت میں بھرپور ہو، ستیہ جیت کچھ کمزور ہے۔ ہم تمہیں روکنا چاہتے تھے کہ اتنی دیر تک حویلی کا دروازہ کھل گیا اور تم اندر چلے گئے۔

مجھے شک گزر گیا تھا کہ تم ضرور ستیہ جیت کی طرف سے آئے ہو لہٰذا میں احتیاطاً تمہارا گھوڑا گلی سے پکڑ کر اندر لے آیا تھا"۔ مادھوراؤ رکا پھر دوبارہ اس نے نصرالدین سے کہا۔ "ایک معاملہ میری سمجھ میں نہیں آیا اس کی میں تم سے وضاحت چاہتا ہوں۔

نصرالدین نے غور سے مادھوراؤ کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ "کس بات کی وضاحت چاہتے ہیں آپ"؟ مادھوراؤ نے تحسین آمیز انداز میں نصرالدین کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "جب سے ستیہ جیت یہاں سے بھاگا ہے میں سمیتا کو اپنے گھر لے آیا تھا اسی روز سے رانی نے ان کی حویلی میں چھ آدمیوں کا پہرہ لگا دیا تھا ان کا ارادہ تھا کہ ستیہ جیت جب لوٹ کر اپنی حویلی میں آئے تو اسے گرفتار کر لیا جائے۔ میری سمجھ میں یہ معاملہ نہیں آیا کہ تم نے ان چھ سپاہیوں پر قابو کیسے پا لیا اور کس طرح تم اکیلے ان کو موت کے گھاٹ اتارنے میں کامیاب ہو گئے؟"

نصرالدین نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "میں نے اس نیت سے حویلی کے دروازے پر دستک دی تھی کہ اندر سمیتا ہو گی اور میں اسے اس کے بھائی کی سلامتی سے آگاہ کر کے چند روز کسی سرائے میں قیام کرنے کے بعد ضروری اطلاع حاصل کر کے سمیتا کو اس کے بھائی کے پاس چتیل درگ پہنچا دوں گا لیکن جونہی میں حویلی میں داخل ہوا انہوں نے دروازہ بند کر کے مجھے گھیر لیا۔ میں اسی وقت سمجھ لیا تھا کہ سمیتا یہاں نہیں ہے اور یہ کہ ان سپاہیوں کا تعلق رانی سے ہے، وہاں میری زندگی اور موت کا سوال اٹھ کھڑا ہوا تھا اور پھر یہ تو صرف چھ تھے اس موقع پر اگر ان کی تعداد دس بارہ بھی ہوتی تو بھی میں ان سے مقابلے پر جم جاتا وہ چھ میرے سامنے زیادہ دیر نہ ٹھہر سکے تھے اور میں نے ان سب کو موت کے گھاٹ اتار دیا تھا۔

مادھوراؤ نے تسلی دینے کے انداز میں کہا۔ "ان کے قتل ہونے پر اب تمہیں فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں۔ تمہارے ساتھ ان کی لڑائی کے دوران تلواروں اور ڈھالوں کے ٹکرانے اور پھر مرنے والوں کی جو چیخیں بلند ہوئی تھیں انہیں سن کر مندر سے کچھ آدمی ادھر آ گئے تھے۔ تمہیں یہاں چھوڑنے کے بعد میں ان کے پاس گیا تھا کہ وہ سپاہی آپس میں ہی لڑ کر مر گئے ہیں۔ میں نے انہیں یقین دلانے کی کوشش کی تھی کہ سحر شام ہی کسی بات

پر ان سپاہیوں میں تکرار ہو رہی تھی جو آہستہ آہستہ بڑھتے ہوئے جنگ اور لڑائی کی شکل اختیار کر گئی تھی۔ تم نے اچھا کیا جو تم دیوار پھاند کر باہر آ گئے کیونکہ میں انہیں یہ کہنے میں کامیاب ہو گیا تھا کہ اگر ان پر کسی نے حملہ کیا ہوتا تو حملہ آور بھی ان کے اندر مرا پڑا ہوتا۔ چونکہ ایسا نہیں ہے لہذا یہ آپس میں ہی لڑ کر مر گئے ہیں۔

ان لوگوں نے میری بات کا اعتبار کر لیا اور وہ سب وہاں سے چلے گئے ہیں۔ جاتی دفعہ وہ ان چھ سپاہیوں کی لاشیں اٹھا کر بھی اپنے ساتھ لے گئے ہیں۔ اب ان مرنے والوں کی طرف سے کسی قسم کا خدشہ اور اندیشہ نہیں ہے۔ اب تم اپنے متعلق کہو تمہارا نام کیا ہے اور سلطان حیدر علی کے لشکر میں تمہاری کیا حیثیت ہے۔

نصرالدین نے اپنا آہنی خود سر سے اتار کر نشست پر رکھتے ہوئے کہا۔ "میرا نام نصرالدین ہے، میں ترک ہوں اور سلطان حیدر علی کے ہراول دستوں کے علاوہ ان کے محافظ دستوں کا بھی سالار اعلیٰ ہوں"۔ اس کے ساتھ ہی نصرالدین نے اپنے لباس کے اندر سے ستیہ جیت کی دی ہوئی انگوٹھی نکالی اور اسے سمیتا کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ "کیا تم اس انگوٹھی کو پہچانتی ہو"۔

سمیتا نے انگوٹھی لے لی اور غور سے اسے دیکھتے ہوئے کہا "ہاں یہ ہماری خاندانی انگوٹھی ہے اور یہ میرے بھائی کے پاس تھی آپ کے ہاتھ یہ کیسے لگ گئی"۔

نصرالدین نے کہا۔ "یہ انگوٹھی مجھے تمہارے بھائی نے دی تھی اس نے کہا تھا، "میری بہن شاید تمہیں اجنبی جان کر تمہارے ساتھ بدنور سے چتیل درگ تک کا سفر کرنے پر آمادہ نہ ہو۔ یہ انگوٹھی دکھانے پر اس کا اعتماد بحال ہو جائے گا"۔

سمیتا نے انگوٹھی واپس نصرالدین کی گود میں رکھتے ہوئے کہا۔ اسے اپنے پاس رکھیئے آپ بہتر طور پر اس کی حفاظت کر سکتے ہیں۔ یہ میرے بھائی کی غلط فہمی تھی آپ پر اعتماد نہ کرنا اپنے آپ کو دھوکہ دینا ہے۔ میں اس انگوٹھی کے بغیر بھی آپ کے ساتھ سفر کرنے کو تیار ہوں، آپ مطمئن رہیئے میری طرف سے آپ پر کسی بد اعتمادی کا اظہار نہ ہو گا"۔

سمیتا جب خاموش ہوئی تو مادھو راؤ نے کہا۔ شاید یہ خبر تمہارے لیے نئی ہو کہ تمہارا ایک ساتھی بھی یہاں قید ہے۔ اسمٰعیل کے ساتھ اس کے دو ساتھی تھے، ان میں سے ایک تو بھاگنے میں کامیاب ہو گیا، دوسرا رانی کے سپاہیوں کے ہاتھوں گرفتار ہو گیا اور وہ یہاں قید ہے اس کا نام شہباز ہے"۔

نصرالدین نے تعجب اور خوشی سے تقریباً اچھلتے ہوئے کہا۔ "کیا تم لوگ بتا سکتے ہو کہ شہباز کہاں ہے؟"

مادھو راؤ نے کہا۔ "یہاں سے پانچ کوس کے فاصلے پر رانی نے گولی درگ کے جنگل میں ایک پہاڑ کے اوپر ایک اور قلعہ بنا رکھا ہے۔ یہ قلعہ اس کی عشرت گاہ بھی ہے اور یہاں وہ اپنے ان دشمنوں کو بھی قید کرتی ہے جن سے اسے اپنی ذات کے لیے خطرے کا خدشہ ہو۔ شہباز بھی اسی قلعے میں قید ہے۔ رانی کے سپاہیوں میں سے ایک ہمارا اچھا جاننے والا ہے، اسی نے ہمیں یہ خبر دی تھی۔

نصرالدین نے مادھو راؤ کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ "کیا آپ گھر کے صرف دو افراد ہی ہیں"۔ مادھو راؤ نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "نہیں میرے دو جوان بیٹے بھی ہیں جو پچھلے کئی ہفتوں سے تجارت کی غرض سے ساؤنور کی طرف گئے ہوئے ہیں۔ تمہارے لیے شاید یہ خبر بھی نئی ہو کہ ساؤنور کا مسلمان حکمران عبدالحکیم خان بھی رانی کے چاہنے والوں میں شامل ہے اور وہ رانی کے ہر اشارۂ ابرو کی تعمیل اپنا فرض جانتا ہے"۔

نصرالدین نے اپنا خود اٹھا کر اپنے سر پر رکھا پھر وہ کھڑا ہوتا ہوا بولا۔ "میں آپ لوگوں کا مشکور ہوں، مجھے آپ سے بہت کچھ حاصل ہوا۔ اب مجھے اجازت دیں میں جاتا ہوں، میں تین چار یوم تک یہاں کسی سرائے میں قیام کر کے اپنی مطلوبہ اطلاعات حاصل کروں گا اس کے بعد سمیتا کو لے کر چتیل درگ کی طرف کوچ کر جاؤں گا"۔

مادھو راؤ نے اس کا بازو پکڑ کر دوبارہ بٹھاتے ہوئے کہا۔ "تم حد سے زیادہ تکلف برت رہے ہو، تم یہیں قیام کرو گے اور یہیں سے سمیتا کے ساتھ روانہ ہو گے"۔

سمیتا نے بھی بولتے ہوئے کہا "آپ ہمارے محسن ہیں، آپ کا سرائے میں قیام ہمارے لیے

باعثِ عار ہے، اس گھر کو آپ اپنا گھر سمجھ کر قیام کریں۔"

نصرالدین دوبارہ وہاں بیٹھ گیا۔ مادھوراؤ کے کہنے پر سمیتا اور سرسوتی کھانا لے آئیں۔ سب نے مل کر کھانا کھایا۔ اس کے تھوڑی دیر بعد نصرالدین اسی کمرے میں گہری نیند سو رہا تھا۔

بدنور میں تین دن قیام کر کے نصرالدین نے وہاں سے بہت کچھ حاصل کر لیا تھا۔ چوتھے روز شام کے قریب کہیں جانے کے لیے وہ اصطبل میں اپنے گھوڑے پر زین ڈال رہا تھا کہ مادھوراؤ وہاں آیا اور پریشانی کی حالت میں پوچھا "آج شام کے وقت تم کہاں جانے کی تیاری کر رہے ہو؟"

صحن کے ایک طرف مٹی کے چولہے پر سمیتا اور سرسوتی کھانا تیار کر رہی تھیں نصرالدین کو تیار ہوتا دیکھ کر سمیتا وہاں سے اٹھی اور اصطبل میں مادھوراؤ کے پاس آ کھڑی ہوئی۔ مادھوراؤ نے پھر اپنا سوال دہرایا "تم نے بتایا نہیں کہ تم اس بے وقت کہاں جا رہے ہو؟"

نصرالدین نے گھوڑے کا تنگ کسنے کے بعد کمر سیدھی کرتے ہوئے کہا "میں ی درگ کے اس قلعے کی طرف جاؤں گا۔ جہاں رانی اپنے مخالفین کو قید میں رکھتی ہے میں وہاں سے اپنے ساتھی شہباز کو رہا کرانے کی کوشش کروں گا"۔

مادھوراؤ نے فکرمندی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ "تم اکیلے اسے کیونکر رہا کرا سکو گے۔ ایسا کر کے تم اپنے ساتھی کے ساتھ ساتھ اپنے آپ کو بھی خطرات میں ڈال دو گے اور اگر تم وہاں پکڑے گئے تو یہاں تین روز کی محنت کے بعد تم نے جو اطلاعات حاصل کی ہیں انہیں کون سلطان حیدر علی کے پاس پہنچائے گا اور پھر کون اس رانی

پر حملہ کر کے یہاں کے لوگوں کو اس کے مظالم کی سنگین چکی سے نجات دلائے گا"۔

نصرالدین نے ایک عزم کے ساتھ کھنکدار آواز میں کہا "میرا گولی درگ کے جنگل میں جانا ضروری ہے۔ میں اپنے ساتھی کو کیسے اور کیونکر قید و بند میں چھوڑ کر یہاں سے کوچ کر سکتا ہوں۔ یہ خلوص اور میرے سپاہ گری کے پیشے کے منافی ہے"۔

سمیتا اپنے روپ کے پورے سہانے پن کے ساتھ وہاں خاموش کھڑی ہوئی نصرالدین کو دیکھے جا رہی تھی۔ وہ کچھ کہنا چاہ رہی تھی۔ شاید مادھوراؤ کی موجودگی یا شرم کے باعث وہ کہہ نہ پا رہی تھی۔ اس کی نشتر دزجاج جیسی آنکھیں نصرالدین کے چہرے کے آتار چڑھاؤ پر جمی ہوئی تھیں۔ زین سے لٹکتے اپنے جنگی ہتھیاروں کا جائزہ لینے کے بعد نصرالدین نے جب اپنا آہنی خود اپنے سر پر رکھا اور گھوڑے کی لگام پکڑ لی تو مادھوراؤ نے فکرمند ہو کر پھر پوچھا۔

"شام ہو رہی ہے، کھانا تو کھا کر جاؤ"۔ نصرالدین نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"ہاں! آپ کی یہ بات میں مان لیتا ہوں، مجھے بھوک بھی ہے اور مجھے کھانا کھا کر بھی جانا چاہیے، کیا خبر وہاں مجھے کچھ وقت لگ جائے"۔ مادھوراؤ نے اس کی بات کو مکمل کرتے ہوئے کہا "کیا خبر تم اپنے کام کی تکمیل کیے بغیر واپس لوٹ آؤ"۔

نصرالدین نے اپنے گھوڑے کی پیٹھ تھپتھپاتے ہوئے کہا "ناکامی اور کامرانی صبح اور شام کی طرح انسانی زندگی میں داخل ہوتی ہیں۔ میں اپنی کامیابی پر کبھی پھولا اور اپنی ناکامی پر کبھی متاسف نہیں ہوا لیکن اس مہم میں اگر مجھے ناکامی کا سامنا کرنا پڑا تو مجھے ضرور افسوس ہو گا"۔

مادھوراؤ نے پاس کھڑی سمیتا کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "نصرالدین کو کھانا دو بیٹی!" سمیتا نے نصرالدین کو مخاطب کر کے کہا۔ "آپ اپنے کمرے میں چلیں میں وہیں کھانا لے کر آتی ہوں"۔

نصرالدین اس کمرے کی طرف چلا گیا جس میں وہ رات بسر کرتا تھا۔ سمیتا اور مادھوراؤ صحن کے اس حصے کی طرف جا رہے تھے جہاں سرسوتی بیٹھی کھانا پکا

رہی تھی ۔ نصرالدین کمرے میں آیا اور دائیں طرف کی نشست پر بیٹھتے ہوئے اس نے اپنے سر سے خود اُتار کر ساتھ والی نشست پر رکھ لیا تھا ۔

تھوڑی دیر بعد سمیتا کھانے کے برتن اُٹھائے اندر آئی ۔ ایک بڑا سا پیتل کا تھال تھا جس میں اس نے کھانے کے برتن بڑے قرینے اور سلیقے کے ساتھ جمار رکھے تھے وہ تھال خاموشی سے اس نے نصرالدین کے سامنے رکھ دیا اور اس اُمید پر وہاں کچھ دیر کھڑی رہی کہ شاید نصرالدین اسے کچھ کہے لیکن نصرالدین نے آنکھ اُٹھا کر بھی اس کی طرف نہ دیکھا تھا ۔ وہ خاموشی سے کھانا کھانے لگا ۔

سمیتا چند لمحوں تک کمرے میں رکھی دیوی دیوتاؤں کے بُتوں اور اوتاروں کی مورتیاں دیکھتی رہی پھر وہ اندیشوں اور عواقب میں ڈوبے ذہن کے ساتھ کمرے سے باہر نکل گئی تھی ۔

تھوڑی دیر تک سمیتا پھر کمرے میں آئی اور اس کے ہاتھ میں جلتی ہوئی ایک چھوٹی سی مشعل تھی جس سے اس نے کمرے کی کافوری شمع کو روشن کر دیا تھا ۔ اس وقت تک نصرالدین کھانا کھا چکا تھا ۔ ہاتھ میں پکڑی ہوئی مشعل باہر رکھ کر سمیتا پھر اندر آئی اور نصرالدین کے سامنے نیچے جھک کر اس نے برتن اُٹھاتے ہوئے کہا ۔ "کیا اس وقت آپ کا گولی درگ کے جنگل کی طرف جانا ضروری ہے ۔"

نصرالدین کھڑا ہوتا ہوا بولا ۔ "ضروری ہے تبھی تو جا رہا ہوں ۔ میں اپنے ساتھی کو دشمن کے رحم و کرم پر چھوڑ کر کس طرح سکون کے ساتھ یہاں سے رخصت ہو سکتا ہوں ۔ اس کی مدد اس کی رہائی میرے فرائض کا اوّلین حصّہ ہے ۔" نصرالدین کمرے سے باہر نکل کر اصطبل کی طرف چلا گیا ۔ سمیتا بھی کمرے سے باہر نکل کر کھڑی ہو گئی تھی ۔ وہ بڑے غور اور انہماک سے نصرالدین کو دیکھ رہی تھی ۔ اس کے دیکھتے دیکھتے نصرالدین جب اپنے گھوڑے پر سوار ہو کر باہر چلا گیا تو وہ ٹوٹے ہوئے برتن کی مانند اُداس اور بکھرے خواب کی دھجیوں جیسی افسردہ ہو گئی تھی پھر آپ سے آپ اس کی گردن جھک گئی اور وہ اس طرف جا رہی تھی جہاں صحن کے ایک طرف مادھو راؤ

اور سرسوتی چولھے کے پاس بیٹھے تھے ۔

وہ ایک ٹیڑھی اور بَل کھاتی ہوئی پگ ڈنڈی جس پر نصرالدین اپنا گھوڑا سرپٹ دوڑا رہا تھا ، یہ لہریے کھاتی ہوئی پگ ڈنڈی گولی درگ کے گھنے جنگل میں سے گزرتی ہوئی اس کوہستانی قلعے کی طرف جاتی تھی جس میں بدنور کی رانی اپنے لیے خطرناک قیدیوں کو رکھتی تھی اور جس کے اندر اس کا ایک عشرت کدہ بھی تھا ۔

رات کسی بے ضمیر منافق کی طرح دھرتی پر اپنی سیاہ چادر بچھا چکی تھی ۔ جنگل کے سوکھے پیڑوں کے نیچے ، مالتی کی جھاڑیوں کے بیچوں بیچ پت جھڑ کے خشک پتوں کو روندتا ہوا نصرالدین کا گھوڑا اس مڑتی تڑتی پگ ڈنڈی پر ہواؤں کے دوش پر اُڑتے ہوئے ہیولے کی طرح بھاگ رہا تھا ۔ سنسان جنگل میں ایک خاموشی تھی ، ایک سوالیہ کیفیت اور پُراسرار سکوت چھایا ہوا تھا ۔ بڑی تیزی سے نصرالدین کا گھوڑا اس کوہستانی قلعے کی طرف فاصلوں کو سمیٹتا جا رہا تھا ۔

جس پہاڑ کے اُوپر قلعہ تھا اس کی چڑھائی شروع ہونے سے ایک فرلانگ دُور ہی نصرالدین نے اپنے گھوڑے کو روک لیا ۔ اس احتیاط کے ساتھ کہ بھاگتے گھوڑے کی ٹاپوں کی آواز کسی کے کان تک نہ پہنچے وہ اپنے گھوڑے کی باگ پکڑ کر پیدل چلتا ہوا آگے بڑھنے لگا تھا ۔

جہاں سے اس کوہستان کی چڑھائی شروع ہوتی تھی وہاں نصرالدین رُک گیا ایک بہت بڑی ، بلند اور سیاہ چٹان کی اوٹ میں اس نے اپنے گھوڑے کو باندھ دیا ۔ گھوڑے کی زین سے لٹکتی ہوئی ڈھال اور کمند اس نے اتاری اور پہاڑ کے اُوپر چڑھتے ہوئے وہ قلعے کی فصیل کی طرف بڑھنے لگا تھا ۔ جب قلعے کی فصیل چند گز کے فاصلے پر رہ گئی تو وہ زمین پر لیٹ گیا اور رینگ رینگ کر آگے بڑھنے لگا تھا ۔

قلعہ کسی ملحد کے دِل کی طرح تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا ۔ قلعے کے بُرج بھی اندھیرے میں ڈوبے ہوئے تھے اور وہاں کوئی روشنی نہ ہو رہی تھی جب کہ فصیل پر مسلح پہریدار

اِدھر اُدھر ٹہلتے ہوئے پہرہ دے رہے تھے۔ نصرالدین دو برجوں کے درمیانی حصّے میں آیا اور جب وہاں پہرہ دینے والا محافظ دائیں طرف برج کی طرف بڑھ گیا تو اس نے فصیل پر اپنی کمند پھینکی اور وہ بڑی تیزی سے فصیل پر چڑھ رہا تھا۔

اُوپر جاکر وہ فوراً پیٹ کے بل لیٹ گیا اور اس حصّے کے پہریدار کا انتظار کرنے لگا جو برج کی طرف گیا ہُوا تھا۔ تھوڑی دیر بعد وہ محافظ واپس آتا دکھائی دیا۔ نصرالدین نے دَم سادھ لیا تاہم وہ مستعد ہو گیا تھا اور اپنی تلوار اور ڈھال اس نے فصیل کے اُوپر رکھ دی تھی۔ جونہی وہ محافظ قریب آیا نصرالدین طوفان کی طرح اُٹھا اور اس پر جھپٹ پڑا۔ ایک ہاتھ اس نے اس کے مُنہ پر رکھا اور دوسرا ہاتھ اس کی شہ رگ پر جا پہنچا تھا۔

جب اس نے محسوس کیا کہ محافظ کا دم گھُٹ گیا ہے اور وہ مر چکا ہے، تو نصرالدین نے لاش کو فصیل کے اُوپر لٹکا دیا۔ پہلے اس نے اپنی ڈھال اُٹھا کر اپنی پُشت پر لٹکائی۔ تلوار کو میان میں ڈالا اور لاش کو اپنے کندھوں پر لاد کر وہ دوبارہ اپنی کمند کے ذریعے فصیل سے نیچے اُترنے لگا۔ زمین پر پاؤں جمانے کے بعد لاش کو اس نے نیچے رکھا۔ اس کے کپڑے اُتار کر اپنے کپڑوں کے اُوپر ہی اُنہیں پہن لیا اور ننگی لاش کو اس نے فصیل کے بالکل ساتھ اندھیرے میں ڈال دیا تھا۔ دوبارہ وہ کمند کے ذریعے فصیل کے اُوپر چڑھا۔

تھوڑی دیر تک وہ دو بُرجوں کے درمیان اسی طرح ٹہلتا رہا جس طرح مرنے والا محافظ ٹہل رہا تھا۔ اپنے چاروں طرف سے اطمینان کر لینے کے بعد اس نے کمند کھینچ کر اندر پھینکی پھر اُس کی مدد سے وہ قلعے کے اندر اُتر گیا تھا۔

قلعے کے اندر کی جانب نیچے اُترنے کے بعد وہ تھوڑی دیر تک فصیل سے ٹیک لگا کر اپنے اِردگرد کا جائزہ لیتا رہا پھر وہ شکار پر جھپٹنے والے چیتے کی طرح دبے پاؤں آگے بڑھنے لگا تھا۔ قلعے کے محافظوں کی رہائش کے لیے جو عمارتیں بنی ہوئی تھیں اُن سے دُور دُور رہتے ہوئے وہ ان کوٹھڑیوں کی طرف بڑھ رہا تھا جن کے اندر قیدیوں کو رکھا جاتا تھا۔ ان کوٹھڑیوں کی پُشت پر پہاڑ کی ایک بلند چوٹی کے اُوپر رانی کا عشرت کدہ

تھا جو اس وقت اندھیرے اور تاریکی میں ڈوبا ہُوا تھا۔ چاروں طرف خاموشی پھیلی ہوئی تھی۔ آسمان پر گہرے بادل چھائے ہوئے تھے اور بارش ہونے کا بھی اندیشہ تھا۔ لہٰذا وہ جلد از جلد اس کام سے فارغ ہو جانا چاہتا تھا۔

قیدیوں کی ان کوٹھڑیوں کی طرف بڑھتے ہوئے وہ اچانک رُک گیا کیوں کہ کوٹھڑیوں کے عین سامنے ایک پتھر پر اس کی طرف پُشت کیے ایک پہریدار بیٹھا ہُوا تھا۔ نصرالدین زمین پر لیٹ گیا اور بے آواز رینگتا ہُوا وہ آگے بڑھنے لگا تھا۔ اس پہریدار کے قریب جاکر نصرالدین یوں اٹھا جیسے خطرے کے وقت سانپ اپنا پھن کھڑا کر لیتا ہے۔ اس نے اپنا بایاں ہاتھ اس کے مُنہ پر رکھ کر اسے دبوچ لیا اور دائیں ہاتھ سے اپنا خنجر نکال کر اس کے پیٹ میں چبھوتے ہوئے اس نے اپنی قہر برساتی آواز میں کہا "اگر تم نے مزاحمت کر کے آواز نکالنے کی کوشش کی تو جان رکھو میرا یہ خنجر تمہارے دِل میں اُتر جائے گا۔ تمہاری آواز پر تمہارے ساتھی تمہاری مدد کو ضرور یہاں آجائیں گے لیکن تمہیں کیا فائدہ، اس لیے کہ اس وقت تک تم میرے ہاتھوں مارے جا چکے ہو گے۔ تمہارے شور کرنے سے مجھ پر کیا بیتے گی اس میں بھی تیری کوئی منفعت نہیں ہے اس لیے کہ ایسی صورت میں تیری موت تم پر غالب آچکی ہو گی۔

نصرالدین اُسے گھسیٹتا ہُوا ایک دُور افتادہ اور قدرے گہرے تاریک کونے میں لے گیا اور اپنا ہاتھ تھوڑا سا اس کے مُنہ سے ہٹاتے ہوئے پوچھا "قیدیوں کی ان کوٹھڑیوں کی چابیاں کس کے پاس ہیں؟" اس پہرے دار نے ہکلاتے ہوئے کہا "میرے پاس ہیں"۔

نصرالدین نے اس بار اپنے خنجر کی نوک اور تیزی کے ساتھ چبھوتے ہوئے پوچھا "کیا تم اس مسلمان قیدی کو جانتے ہو جسے ستیہ جیت کے ساتھی کی حیثیت میں گرفتار کر کے قید کیا گیا ہے"۔

اس نے پھر کپکپاتی آواز میں کہا "ہاں! مَیں اُسے جانتا ہوں۔ اس کی کوٹھڑی دائیں طرف سے ساتویں نمبر پر ہے"۔ نصرالدین اسے اپنے آگے آگے دھکیلتا ہُوا بولا

"میرے آگے آگے چلو اور اس کی کوٹھڑی کا دروازہ کھولو۔"

ایک کوٹھڑی کے سامنے وہ پہریدار رُک گیا اور نصرالدین سے کہا "واپسی کوٹھڑی میں بند ہے"۔ نصرالدین نے اس پنجرہ نما کوٹھڑی کے آہنی جنگلے کے ساتھ زور لگاتے ہوئے پکارا۔ "شہباز! شہباز!" کمرے کی تاریکی سے نکل کر ایک جوان نصرالدین کے سامنے آ کھڑا ہوا۔ نصرالدین نے پہریدار سے کہا "فی الفور دروازہ کھول دو، یہی ہمارا ساتھی ہے"۔ پہریدار نے اپنا لباس ٹٹول کر چابیاں نکالیں اور ان میں سے ایک چابی علیحدہ کر کے اس نے وہ دروازہ کھول دیا تھا۔ پہریدار کو لے کر نصرالدین اس تاریک کوٹھڑی میں داخل ہوا۔ وہ جوان جسے شہباز کہہ کر پکارا گیا تھا، نصرالدین کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

"اے امیر! آپ کب آئے اور میری یہاں موجودگی کا علم آپ کو کیسے ہو گیا؟"

نصرالدین نے سرگوشی کرتے ہوئے کہا۔ "یہ وقت ایسے سوالوں کا نہیں ہے، میں بدنور آیا مجھے تمہاری گرفتاری اور قید کا علم ہوا پھر میں بھلا تمہیں اسیری کی حالت میں چھوڑ کر کیسے اور کیونکر واپس چلا جاتا۔ تمہارے پاس اس کوٹھڑی میں کوئی رسّی ہے"۔

شہباز نے بھی سرگوشی کرتے ہوئے کہا۔ "اے امیر! میرے پاس رسّی ہے"۔

نصرالدین نے تحکمانہ لہجے میں کہا "اس کے ہاتھ پاؤں باندھ کر اس کے منہ میں کپڑا ٹھونس دو"۔

شہباز فوراً حرکت میں آیا۔ کوٹھڑی کے ایک کونے سے اس نے ایک لمبی رسّی اُٹھائی اور اس سے اس نے پہریدار کے ہاتھ پاؤں باندھ دیئے پھر اس نے قید خانے کی چادر کا ایک پلو پھاڑا اور وہ کپڑا اس نے پہریدار کے منہ میں ٹھونس دیا۔

نصرالدین نے پہریدار کو فرش پر لٹا دیا اور اس سے چابیوں کا گچھا لے لیا۔ شہباز کے ساتھ وہ باہر آیا اور کوٹھڑی کا دروازہ مقفل کر کے چابیوں کا گچھا اس نے دور پھینکتے ہوئے کہا۔ "شہباز! شہباز! میرے ساتھ آؤ"۔

شہباز اس کے ساتھ ہو لیا۔ دونوں جھک کر چلتے ہوئے فصیل کے پاس آئے اور وہاں لٹکتی ہوئی کمند کے ذریعے باری باری وہ فصیل کے اُوپر چڑھ گئے تھے۔ نصرالدین نے

کمند لپیٹ کر فصیل سے باہر پھینکی اور شہباز کو پہلے نیچے جانے کو کہا۔ شہباز کمند کے ذریعے نیچے اتر گیا اور اس کے پیچھے پیچھے نصرالدین بھی فصیل سے اُتر کر شہباز کے پاس آ گیا تھا۔ نصرالدین فوراً زمین پر لیٹ گیا اور رینگ رینگ کر اس سمت بڑھنے لگا تھا، جس طرف وہ اپنے گھوڑے کو باندھ کر آیا تھا۔ شہباز بھی اس کے پیچھے پیچھے زمین پر رینگ رہا تھا۔

دونوں اس جگہ آئے جہاں چٹانوں کی اوٹ میں گھوڑا کھڑا تھا۔ نصرالدین نے پتھروں سے بندھی ہوئی اپنے گھوڑے کی لگام کھولی اور واپس چل دیا۔ تھوڑی دُور تک وہ اس خیال سے پیدل چلتے رہے کہ گھوڑے کی ٹاپوں سے قلعہ والے شک میں نہ پڑ جائیں اس کے بعد وہ دونوں گھوڑے پر سوار ہوئے اور گھوڑا دونوں کو لے کر مالتی کی جھاڑیوں سے گھری اس ٹیڑھی پگڈنڈی پر سرپٹ بھاگے جا رہا تھا جو گولی درگ کے اس جنگل سے ہو کر بدنور کی طرف جاتی تھی۔

جنگل کے اندر نصرالدین کا گھوڑا کسی طوفانی جھونکے کی طرح اُڑا جا رہا تھا۔ کہ راستے کے بائیں جانب کی مالتی کی جھاڑیوں کے اندر سے کسی نے زور زور سے پکارا۔ "نصرالدین! نصرالدین! رُک جاؤ"۔ نصرالدین نے فوراً اپنے گھوڑے کو روک لیا۔ وہ اس ویرانے میں گونجنے والی آواز کو پہچان گیا تھا۔ آواز سمیتا کی تھی۔

نصرالدین گھوڑے سے کود گیا اور جس طرف سے آواز آئی تھی اُدھر منہ کر کے اس نے بلند آواز میں کہا۔ "سمیتا! سمیتا! تم کہاں ہو سامنے آؤ"۔ جھاڑیوں کے اندر سے سمیتا ہانپتی اور کانپتی ہوئی نکلی اور نصرالدین کے سامنے آ کھڑی ہوئی۔ نصرالدین نے پریشانی اور فکرمندی میں پوچھا "تم یہاں اس جنگل میں اکیلی کیسے اور کیوں پہنچ گئی ہو"۔ سمیتا نے ہکلاتے ہوئے کہا۔ "آپ کی وہاں روانگی سے تھوڑی دیر بعد بدنور کی رانی کا وہ شوہر غلام جسے اس نے اپنے شوہر کا درجہ دے رکھا ہے مادھو راؤ کے گھر آ گیا۔ اس نے شک کرتے ہوئے مادھو راؤ سے کہا کہ ہماری حویلی میں پہرہ دینے والے سپاہی آپس میں لڑ کر نہیں مرے، انہیں کسی نے قتل کیا ہے۔ تھوڑی دیر تک رانی کا وہ کرناٹکی غلام

اپنے چار ساتھیوں کے ساتھ مادھوراؤ سے پوچھ گچھ کرتا رہا جب وہ مسلسل انکار کرتا رہا، تو اُن ظالموں نے مادھوراؤ کو قتل کر دیا۔ سرسوتی نے اپنے باپ کو بچانا چاہا پر اُنہوں نے اُسے بھی مار ڈالا۔ انہیں شک ہو گیا تھا کہ سپاہیوں کے قتل میں مادھوراؤ کا ہاتھ ہے۔ میں کسی طرح اصطبل سے گھوڑا لے کر پچھواڑے کے راستے وہاں سے بھاگ نکلی لیکن میری بدقسمتی کہ اس غلام نے مجھے بھاگتے ہوئے دیکھ لیا اور اس نے میرا پیچھا کیا۔ وہ یہاں اس جنگل تک میرا پیچھا کرتا آیا ہے لیکن جنگل کے اندر ایک موڑ کاٹنے کے بعد میں اسے جُل دینے میں کامیاب ہو گئی اور اپنے گھوڑے سے اُتر کر ان جھاڑیوں میں چھُپ گئی۔ مجھے اُمید تھی کہ آپ اسی راستے سے ——"

سمیتا اپنی بات مکمل نہ کر پائی تھی کہ فضا میں ہولناک قہقہہ بلند ہوا پھر دائیں جانب سے ایک گھوڑ سوار اپنا گھوڑا دوڑاتا ہوا جھاڑیوں کے اندر سے نکلا اور اپنی قہر آلود آواز میں اس نے کہا۔

"نارائن کو جُل دینا اتنا آسان نہیں ہے۔ مجھے پتہ تھا تم ان ہی جھاڑیوں میں کہیں چھُپی بیٹھی ہو لہٰذا میں بھی تمہیں یہیں تلاش کر رہا تھا۔ مجھے یہ بھی خبر ہو گئی ہے تم ستیہ جیت کی بہن ہو۔ مادھوراؤ کے قتل کے بعد اب تم نے قربانی کے لیے یہ کون سا خصم تلاش کر لیا ہے۔ اس جنگل میں جن دو آدمیوں کا تم سہارا لے رہی ہو میں انہیں ریت کی دیوار جان کر گرا دوں گا اور تمہیں اپنے ساتھ رانی کے پاس لیکر جاؤں گا۔ وہ تیرا فیصلہ اور انصاف کرے گی اس لیے کہ ——"

اس غلام نارائن کو رُک جانا پڑا کیونکہ نصرالدین نے ایک جھٹکے کے ساتھ اپنی تلوار بے نیام کرتے ہوئے غضب ناک ہو کر کہا۔ "غدار، حرامی، کتے اپنے منہ اور زبان کی نگہبانی کر، ایک لڑکی کے ساتھ تمہارا مخاطب ہونے کا لہجہ کیسا غلیظ اور گھٹیا ہے۔ میں جانتا ہوں بدکار رانی نے تیرے دِل میں فحش کا مرکز اور ضمیر میں جنسی عصیان کا طوفان کھڑا کر رکھا ہے پھر بھی میں یہاں اس جنگل میں تجھے اپنی حدود سے تجاوز نہ کرنے دوں گا، جا واپس لوٹ جا کہ تیری میرے ساتھ کوئی دشمنی کوئی عناد نہیں ہے یاد رکھ! اگر تم نے میرے راستے اور میرے عزائم میں دیوار بننے کی کوشش کی تو اس سُنسان جنگل میں تیرے دِل کی لوح اور تیرے اندھے ضمیر کے تمام صحیفوں پر تیرے ہی خون کی مُہر لگا کر تیرے سارے گھمنڈ، تیری شیخی اور تیرے اخلاق کے انحطاط کو ختم کر دوں گا۔ جا لوٹ جاؤ کہ اسی میں تمہاری بہتری ہے۔

وہ غلام نیچے اُتر گیا اور اپنی ڈھال سنبھال کر تلوار کھینچتے ہوئے کہا۔ "میں تم دونوں کو ایک ساتھ مقابلے کی دعوت دیتا ہوں۔ ہو سکے تو لڑکی کو بھی اپنے ساتھ مِلا لو۔"

شہباز نے بھاگ کر نصرالدین کے گھوڑے کی زین سے لٹکتا ہوا اس کا جنگی کلہاڑا اُتار لیا اور اس غلام کی طرف دیکھتے ہوئے اُس نے درندوں کے خروش جیسی آواز میں کہا۔ "اے بے وقعت انسان! تیری یہ ہمت کہ تُو میرے امیر کے ساتھ ایسا غلیظ مخاطب اور ایسا گھٹیا لہجہ استعمال کرے۔"

نصرالدین نے فوراً شہباز کو پکڑ کر روکتے ہوئے کہا۔ "شہباز! شہباز! تم یہیں کھڑے ہو کر اس کی بے بسی اور بد دہنی کا تماشہ دیکھو۔" نصرالدین کے کہنے پر شہباز رُک گیا۔ نصرالدین ایک وقار اور ایک عزم کے ساتھ نارائن کی طرف بڑھا۔ نارائن بھی آگے بڑھا تھا۔ قریب آ کر وہ ایک دوسرے پر کسی جنگلی عفریت کی طرح ٹوٹ پڑے تھے۔ رات کے سرد سناٹے میں تلواروں کے ٹکراؤ نے دُور دُور تک ارتعاش پیدا کر دیا تھا۔

تھوڑی دیر تک دونوں جم کر لڑتے رہے پھر نارائن کی حالت ایسی ہونے لگی جیسے دُم بُریدہ سانپ بَل کھاتا ہے کیونکہ اسے اُمید تھی کہ وہ چند ثانیوں میں ہی نصرالدین کو ڈھیر کر دے گا لیکن وہاں تو اُلٹا نصرالدین اس کی جان کا عذاب بنتا جا رہا تھا نصرالدین اب اسے اپنے آگے آگے دُور تک بھگانے لگا تھا۔

نارائن اپنے سارے جنگی عزائم بھُول کر ہراساں و پریشان ہو کر اشتداد و اندیشوں میں کھو گیا تھا۔ اس موقع پر نصرالدین نے گرج کر کہا۔ "اے فحش کے مرکز میں تیرے صنم پرست دِل کو توڑنے لگا ہوں اگر تجھ میں ہمت ہو تو روک لے۔ اب تُو

خاموش دُچپ اور ناشاد دسوگوار کیوں ہے جب کہ تھوڑی دیر قبل تک تیری باتیں شہزادی کا شاخسانہ بن کر میرے کانوں سے ٹکراتی تھیں"۔

اِسی لمحہ اپنی تلوار لہرا کر نصرالدین نے نارائن کے دائیں پہلو کو نشانہ بناتے ہوئے حملہ کرنا چاہا۔ نارائن فوراً دفاع کی خاطر اپنی ڈھال کو دائیں جانب لایا لیکن پلک جھپکنے میں نصرالدین نے رُخ موڑ کر اپنی تلوار کو نارائن کے بائیں پہلو پر گرا دیا۔ جس سرعت سے نصرالدین نے اپنے حملے میں تبدیلی کی تھی اسی سُرعت سے نارائن اپنا دفاع نہ کر سکا اور نصرالدین کی تلوار اس کے بائیں پہلو پر گرنے کے بعد اسے دو حصوں میں کاٹتی ہوئی نکل گئی تھی۔

تاریک رات کے گہرے سناٹے میں نارائن کی کرب ناک آواز ایک گہری بازگشت کے ساتھ بلند ہوئی اور فضاؤں کی بے کنار خاموشی میں ڈوب کر رہ گئی تھی۔ نصرالدین نے اس کے کپڑوں سے اپنی تلوار صاف کی اور سمیتا کے پاس آکر اس نے کہا "ہمیں فوراً یہاں سے کُوچ کر جانا چاہیے۔ اگر اس غلام کے پیچھے اس کے ساتھی بھی آگئے تو ہمارے لیے خطرات بڑھ جائیں گے"۔

سمیتا چند لمحوں تک میٹھی میٹھی نگاہوں سے نصرالدین کو دیکھتی رہی پھر اس نے نصرالدین کو مخاطب کر کے ایسے رس دار لہجے میں کہا جیسے اندھیرے غاروں میں کوئی جھرنا پتھروں پر گرتا ہے۔

"میں آپ کی شجاعت، آپ کی دلیری اور حوصلہ مندی کو سلام کرتی ہوں۔ نارائن طاقت اور شہ زوری میں بدنور کا ستون سمجھا جاتا تھا۔ آج آپ نے اس ستون کو ذلیل و رسوا کر کے گرا دیا ہے جس وقت آپ نارائن سے مقابلہ کرنے لگے تھے اس وقت میں اپنی اور آپ دونوں کی زندگیوں سے مایوس ہوگئی تھی لیکن آپ نے نارائن کو ختم کر کے میری ہذیانی کیفیت کو دُور کر دیا ہے اور میری ہڈیوں میں تازگی بھر دی ہے"۔ سمیتا کے جواب میں نصرالدین صرف مسکرا کر رہ گیا۔ پھر اس نے شہباز کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "شہباز! شہباز! تم نارائن کے گھوڑے کو پکڑ لو اور یہاں

سے بھاگ چلیں"۔

شہباز نارائن کے گھوڑے کی طرف بڑھ گیا۔ نصرالدین نے اس بار سمیتا کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ "تمہارا گھوڑا کہاں ہے؟" سمیتا نے بڑے میٹھے لہجے میں کہا۔ "آپ میرے ساتھ آئیے، میرا گھوڑا ان جھاڑیوں کی اوٹ میں کھڑا ہے"۔

نصرالدین سمیتا کے ساتھ ہو لیا۔ تھوڑی دور جا کر اس نے دیکھا وہاں سمیتا کا گھوڑا کھڑا تھا۔ نصرالدین نے اسے پچکار کر پکڑ لیا۔ اِتنی دیر میں سمیتا نے ایک قریبی جھاڑی کے نیچے سے ایک تھیلی اُٹھائی اور نزدیک آکر وہ تھیلی نصرالدین کی طرف بڑھاتے ہوئے اس نے کہا۔ "اس تھیلی میں کچھ نقدی، زیورات اور ہمارے پرانے حکمران خاندان کے کچھ جواہرات بھی ہیں انہیں آپ اپنے پاس رکھ لیں"۔

نصرالدین نے گھوڑے کی باگ پکڑ کر واپس جاتے ہوئے کہا۔ "یہ اپنے پاس ہی رکھو۔ تم ان کی حفاظت کرو اور میں تمہاری حفاظت کرتا رہوں گا۔ مجھے ان سے کوئی دلچسپی نہیں"۔ سمیتا مایوس اور افسردہ سی ہو کر نصرالدین کے پیچھے پیچھے چلنے لگی تھی۔ دونوں اس جگہ آئے جہاں نصرالدین کا گھوڑا کھڑا تھا۔ اتنی دیر تک شہباز بھی رانی کے مرنے والے غلام نارائن کا گھوڑا پکڑ کر لے آیا تھا۔

فضاؤں میں اب سرما کی تیز ہوا کے ساتھ کہیں کہیں اکی دکی بوند بھی پڑنے لگی تھی۔ نصرالدین نے آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "موسم بگڑ رہا ہے ہمیں فوراً یہاں سے کوچ کر جانا چاہیے۔ آنے والی صبح تک ہمیں بدنور کی حدود سے نکل جانا چاہیے"۔ اس کے ساتھ ہی نصرالدین نے سمیتا کو اس گھوڑے پر سوار کرا دیا جس پر وہ آئی تھی۔ نارائن کے گھوڑے پر شہباز بیٹھ گیا۔ آخر میں ایک زہریلی جست کے ساتھ نصرالدین اپنے گھوڑے پر بیٹھا اور تینوں وہاں سے چیتل ورگ کی طرف کوچ کر رہے تھے۔

صبح تک بڑی تیز رفتاری سے سفر کرتے ہوئے وہ بدنور کی حدود سے نکل گئے تھے۔ اس وقت وہ ایک کوہستانی سلسلے کے اندر سے گزر رہے تھے۔ اندھیرا چھٹ گیا۔ ہوا تھم گئی تھی، آسمان پر بادل گھل مل گئے تھے اور بارش تیز ہوگئی تھی۔ آن

کے سارے کپڑے بھیگ گئے تھے لیکن وہ اپنا سفر جاری رکھے ہوئے تھے کیونکہ پہاڑوں کے اندر اپنے لیے وہ کوئی پناہ گاہ تلاش نہ کر سکے تھے۔ ایک دم شہباز کی طرف اشارہ کرتے ہوئے نصرالدین نے کہا۔

"شہباز! شہباز! ادھر دیکھو، وہ سامنے پہاڑ کے اُوپر۔" شہباز اور سمیتا دونوں نے چونک کر اس طرف دیکھا وہاں پہاڑ کے اُوپر ایک جنگلی بکری کھڑی تھی۔ نصرالدین کے لبوں پر مسکراہٹ بکھر گئی اور اس نے دوبارہ شہباز کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "ہمارے پاس کھانے کی کوئی چیز نہیں۔ قدرت ہماری اس ضرورت کا سامان کر رہی ہے۔ تم سمیتا کو لے کر آگے بڑھتے رہو، میں اس جنگلی بکری کا شکار کر کے تمہارے پیچھے آتا ہوں"۔ شہباز نے بھی چونکتے ہوئے ایک طرف ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "تو پھر ادھر دیکھئے قدرت ہماری پناہ گاہ کا انتظام بھی کر چکی ہے۔"

نصرالدین نے دیکھا وہ ایک بہت بڑی اور سیاہ چٹان تھی جس کا اُوپری حصّہ چھجے کی صُورت میں خوب آگے بڑھا ہُوا تھا اور جس کے نیچے بیٹھ کر وہ ہوا سے نہیں تو کم از کم بارش سے محفوظ رہ سکتے تھے۔

شہباز نے نصرالدین کے قریب آتے ہوئے کہا۔ "مجھے اپنا جنگی کلہاڑا دے دیں۔ جتنی دیر تک آپ شکار کرتے ہیں اُتنی دیر تک میں لکڑیاں اور گھاس پھوس کاٹ کر وہاں اس اُبھری ہوئی چٹان کے نیچے ڈھیر کرتا ہوں"۔ نصرالدین نے اسے کلہاڑا دے دیا اور اپنے گھوڑے کو ایڑ لگا کر دائیں طرف اس پہاڑی کی جانب بھگا دیا جس پر وہ جنگلی بکری کھڑی ہوئی تھی۔

شہباز سمیتا کو لے کر اس چٹان کے نیچے آیا، وہاں زمین کا ایک بڑا اور ہموار ٹکڑا بارش سے محفوظ اور خشک تھا کیوں کہ اس پر چٹان چھت کا کام دے رہی تھی دونوں گھوڑوں کو اس نے چٹان کے نیچے باندھ دیا، خود اس نے سمیتا کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "میری بہن! تم یہاں بیٹھو، میں امیر کے شکار کرنے تک لکڑی کاٹ کر یہاں ڈھیر کرتا ہوں پھر ہم آگ کا الاؤ روشن کر کے اپنے بھیگے کپڑے خشک کر لیں گے۔"

سمیتا نے بڑے خلوص سے کہا "میرے لیے یہ باعثِ شرم ہے کہ آپ دونوں کام کریں اور میں یہاں بارش سے محفوظ بیٹھی رہوں۔ جب تک آپ لکڑیاں کاٹتے ہیں میں یہاں گھاس پھوس جمع کر کے ڈھیر کرتی ہوں، وہ آگ روشن کرنے میں ہمارے کام آئے گا۔"

شہباز متاثر کُن لہجے میں بولا۔ "نہیں، تم یہیں بیٹھو! امیر کو جب خبر ہوئی کہ میں نے آپ سے کام لیا ہے تو وہ مجھ پر خفا ہوں گے۔" سمیتا نے بڑی جستجو سے پوچھا۔ "کیا تمہارے امیر سخت طبیعت کے ہیں؟" شہباز نے چونک کر کہا۔ "نہیں وہ بڑے نرم اور نیک خُو ہیں، میں نے اس لیے کہا کہ وہ عورتوں کا بہت احترام کرتے ہیں۔ کہیں وہ یہ نہ سمجھ لیں کہ میں نے تمہیں کام پر لگایا ہے۔"

سمیتا نے تسلّی دیتے ہوئے کہا۔ "تم فکرمند نہ ہو میرے بھائی! میں انہیں کہوں گی۔ میں نے یہ کام از خود کیا ہے، اس طرح وہ تم پر خفا نہ ہوں گے۔"

شہباز مطمئن سا ہو گیا۔ جب وہ پیچھے ہٹنے لگا تو سمیتا نے اسے کریدنے کے انداز میں پھر پُوچھا۔ "اے بھائی! تم اپنے امیر کو کب سے جانتے ہو اور یہ کہاں کے رہنے والے ہیں"۔ شہباز نے بڑی عقیدت مندی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ "میں اپنے امیر کو اس وقت سے جانتا ہوں جب سے یہ سلطان حیدر علی کے لشکر میں آئے ہیں۔ آج کل یہ سرنگاپٹن میں ہی رہتے ہیں۔ پہلے ان کی رہائش بالا پور میں تھی وہاں ان کا باپ اور ان کا ایک بڑا بھائی سُلطان حیدر علی کے چچا فتح محمد شہید کے لشکر میں دس اور پانچ ہزاری جرنیل تھے۔ بالا پور کی جنگ میں جو مرہٹوں کے ساتھ ہوئی تھی، سلطان حیدر علی کے چچا فتح محمد کے علاوہ امیر کا باپ اور بڑا بھائی بھی شہید ہو گئے تھے۔ یہ ذات کے ترک ہیں اور ان کا خاندان ایک عرصے سے سلطان حیدر علی کے خاندان کی خدمت کرتا چلا آ رہا ہے۔ ان کی ماں نابینا ہے۔

جب بالا پور میں ان کا باپ اور بھائی شہید ہوئے تو حیدر علی نے انہیں اپنے پاس بُلا لیا اس وقت یہ نوعمر تھے لیکن جرأت و ہمّت کا یہ عالم تھا کہ

سے بڑا سورما بھی جنگ میں ان کا سامنا کرتے ہوئے کتراتا تھا۔ ان کو باقاعدہ طور پر اپنے لشکر میں شامل کرنے کے بعد حیدر علی نے اپنے محلسرائے سے ایک لونڈی انہیں مہیا کی جو ان کی نابینا ماں کی دیکھ بھال کرتی ہے، وہ لونڈی بھی بڑی عمر کی ہے اور انہیں بیٹوں کی طرح چاہتی ہے۔"

سمیتا نے دُکھ اور تکلیف دہ احساس میں پوچھا۔" کیا ان کا کوئی اور رشتہ دار نہیں ہے۔" شہباز نے گردن جُھکاتے ہوئے کہا۔" نہیں اس دُنیا میں نابینا ماں کے علاوہ امیر کا کوئی رشتہ دار نہیں ہے۔ ویسے سُلطان حیدر علی انہیں اپنے بیٹوں کی طرح چاہتے ہیں۔ وہ اُن کے محافظ دستے اور ہراول لشکر کے سالارِ اعلیٰ ہیں۔ ابھی تک کوئی سورما پیدا نہیں ہُوا جو جنگ میں اُنہیں زیر کر سکے۔ مرہٹے جن کے ساتھ سلطان حیدر علی کی اکثر جنگیں ہوتی رہی ہیں وہ سلطان حیدر علی کے صرف دو جرنیلوں سے گھبراتے ہیں۔ ایک امیر نصرالدین اور دوسرے امیر محمد علی کمندان۔ جنگوں میں مرہٹے اپنا سارا زور اس طرف رکھتے ہیں جس طرف یہ دونوں جرنیل ہوں۔"

سلطان حیدر علی اکثر کہتے ہیں نصرالدین اور محمد علی کمندان میرے ترکش کے دو ایسے تیر ہیں جو ہمیشہ اپنے حدف پر ٹھیک بیٹھتے ہیں۔

امیر محمد علی کمندان بڑی عمر کے ہیں لیکن اس کے باوجود ان کا بہت احترام کرتے ہیں۔ جب یہ بالاپور سے سرنگاپٹن آئے تھے تو گھر سے باہر نہ نکلتے تھے ہر وقت اپنی نابینا ماں کے پاس رہ کر اس کی خدمت کرتے تھے اور سلطان حیدر علی ان کے اخراجات پورے کرتے تھے۔ جب سلطان حیدر علی نے انہیں لشکر میں شامل ہونے کی باقاعدہ پیش کش کی تو اُنہوں نے انکار کر دیا کیونکہ ان کی ماں نابینا اور اکیلی تھی کوئی اسے سنبھالنے والا اور خدمت کرنے والا نہ تھا۔ جب سلطان کی طرف سے لونڈی مہیا کی گئی تو ان کی ماں نے انہیں لشکر میں شامل ہونے کی اجازت دے دی تب اُنہوں نے حامی بھری اور لشکر میں شامل ہو گئے۔

شہباز نے ذرا رُک کر کہا۔ میں اُن کے ہاں اکثر جاتا رہا ہوں۔ جب یہ اپنی

نابینا ماں سے ملتے ہیں تو رونا آتا ہے۔ یہ گھٹنوں کے بَل ماں کے پاس بیٹھ جاتے ہیں۔ پہلے اپنی ماں کے پاؤں چُومتے ہیں پھر اپنا سَر ان کی گود میں رکھتے ہیں اور پھر وہ بہادر ماں ٹٹول کر اپنے شیر دل بیٹے کا چہرہ اپنے دونوں ہاتھوں میں تھامتی ہے اور ان کی پیشانی چومتی ہے۔ وہ انہیں پاؤں چومنے سے منع کرتی ہیں لیکن اب تو یہ ان کی عادت بن چکی ہے کہتے ہیں جب امیر کی ماں ابھی بچّوں کی ماں نہ تھی تو وہ اپنے شوہر کے ساتھ مرہٹوں کے ساتھ جنگوں میں حصّہ لیا کرتی تھیں۔ بڑے مضبوط اعضاء اور اعلیٰ شخصیّت کی عورت ہیں اور امیر کو وہ اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز رکھتی ہیں۔ یہ بھی سُنا گیا ہے کہ امیر کی ماں کا تعلق سلجوقی ترکوں کے حکمران طبقہ سے ہے۔" شہباز کے خاموش ہونے پر سمیتا بے چاری گہری سوچوں میں کھو گئی۔

شہباز وہاں سے ہٹ گیا اور قریب ہی کلہاڑے سے وہ چھوٹے چھوٹے درخت کاٹنے لگا تھا۔ سمیتا بھی حرکت میں آئی چھجے دار غار سے نکل کر وہ گیلا گھاس پھوس جمع کر کے اس چھجے تلے جمع کرنے لگی تھی۔

بارش تیزی سے جاری تھی۔ نصرالدین اپنا گھوڑا دوڑاتا ہُوا اس جنگلی بکری کی طرف بڑھا تھا جو پہاڑ کے اُوپر کھڑی تھی۔ جونہی بکری نے بھاگتے گھوڑے کو اپنی طرف آتے دیکھا وہ خوفزدہ ہو کر پہاڑ کے دُوسری جانب اُتر گئی وہاں ریوڑ کی شکل میں آن گنت بکریاں چر رہی تھیں۔

پہاڑ پہ کھڑی بکری جب بھاگ کر دوسری بکریوں کی طرف گئی تو بکریوں کا وہ سارا ریوڑ ہی خطرے کی بُو پا کر خوفزدہ ہو گیا تھا اور ساری بکریاں اندھا دھند اور زیادہ نشیب کی طرف بھاگ کھڑی ہوئی تھیں۔ نصرالدین نے بھی اپنے گھوڑے کو ایڑ لگا کر اس کی رفتار تیز کر دی تھی جب وہ پہاڑ کے اُوپر آیا تو اس نے دیکھا بکریاں دور نشیب میں اُتر چکی تھیں۔ نصرالدین نے گھوڑے کو ان کے پیچھے لگا دیا۔

نشیب میں جا کر سامنے ایک برساتی نالہ آ گیا تھا جو بارش کی وجہ سے کناروں

تک بہہ رہا تھا۔ اس نالے کے کنارے جا کر بکریاں رُک گئیں لیکن جب اُنھوں نے دیکھا کہ نصرالدین اپنا گھوڑا دوڑاتا ہُوا ان کے قریب آ گیا ہے تو وہ نالے کے کنارے کنارے بائیں طرف بھاگ کھڑی ہوئی تھیں۔

نالے کے کنارے آ کر نصرالدین کے گھوڑے کی رفتار پہلے کی نسبت اور تیز ہو گئی تھی کیونکہ وہاں زمین ہموار تھی۔ بکریوں کا تعاقب کرتے ہوئے نصرالدین نے جب یہ محسوس کیا کہ ان کے درمیان ایک تیر کی مسافت رہ گئی ہے تو اس نے زین سے لٹکتی ہوئی اپنی کمان سنبھالی اور ترکش سے تیر نکال کر اس نے چلّہ پر چڑھا لیا۔ سرپٹ بھاگتے گھوڑے پر ایک ہاتھ کمان پر اور دوسرا تیر کی پُشت پر رکھنے کے بعد اس نے چلّہ کھینچ کر ایک بکری کا نشانہ لیا اور تیر چلا دیا۔ سنسناتا ہُوا تیر اس بکری کی ٹانگ میں جا گھُسا اور بکری بُری طرح لنگڑانے لگی اب وہ ریوڑ کے پیچھے رہ گئی تھی۔

نصرالدین نے ترکش سے ایک اور تیر نکال کر چلا دیا اور وہ تیر بکری کی دوسری پچھلی ٹانگ میں جا پیوست ہُوا۔ بکری ایک بار لڑکھڑا کر گر گئی۔ دوبارہ اٹھی اور بھاگنے کے بجائے وہ سُست رفتاری سے لنگڑا لنگڑا کر چلنے لگی تھی۔ اتنی دیر تک نصرالدین اس کے سر پر پہنچ گیا۔ گھوڑے سے نیچے اُتر کر اس نے بکری کو پکڑ لیا۔ وہیں لٹا کر اس نے بکری کو ذبح کر دیا۔ کسی ماہر قصاب کی طرح اس نے بکری کی کھال اُتاری اور اس کا پیٹ خالی کر کے اس نے بہتے نالے سے خون آلود گوشت دھو کر اپنی زین سے باندھ لیا۔ دوبارہ وہ نالے کے کنارے آیا۔ پہلے خنجر صاف کر کے نیام میں کیا۔ پھر اس نے مُنہ ہاتھ دھویا اور گھوڑے پر سوار ہو کر وہ اسے واپس بھگا رہا تھا۔

اس ابھری ہوئی سیان چٹان کے قریب اچانک اس نے اپنے گھوڑے کو روک لیا۔ وہاں چھوٹا سا ایک جوہڑ تھا جس کے اندر موٹے موٹے ڈنٹھل والی گھاس پانی سے باہر اُبھر رہی تھی۔ اس کے کچھ سوچا پھر وہ گھوڑے کو ایڑ لگا کر آگے بڑھ گیا۔ چٹان کے نیچے آ کر اس نے دیکھا ذرا فاصلے پر شہباز اور سمیتا اپنے اپنے کام میں مصروف تھے۔ اس نے گوشت اُتار کر ایک طرف رکھا۔ پہلے اپنے گھوڑے سے زین اُتاری پھر اس نے شہباز اور سمیتا کے گھوڑوں کی بھی زینیں کھول دیں اور دھانے نکال دیئے۔ ان دونوں کے گھوڑوں کو اس نے اپنے آگے آگے ہانکا اور اپنے گھوڑے کو ایالوں سے پکڑ کر وہ ان کے پیچھے پیچھے چلنے لگا تھا وہ اس جگہ آیا جہاں تالاب میں اس نے گھاس دیکھی تھی۔

نصرالدین نے اپنے گھوڑے کو پانی کے اندر ڈالا اور بھوکا گھوڑے تیزی سے مُنہ مارتا ہُوا گھاس چرنے لگا تھا اس کی دیکھا دیکھی دوسرے دونوں گھوڑے بھی پانی میں گھُس کر گھاس چرنے لگے تھے۔

نصرالدین تالاب سے ہٹ کر پھر چٹان کے نیچے آیا۔ چند ثانیوں تک وہ شہباز اور سمیتا دونوں کو کام میں مصروف دیکھتا رہا۔ پھر وہ تیز تیز قدم اٹھاتا ہُوا شہباز کی طرف مُڑا۔ سمیتا نے اسے دیکھ لیا تھا لہٰذا وہ بھی اس کے پیچھے پیچھے ہولی تھی۔ قریب آ کر نصرالدین نے جواب طلب انداز میں شہباز سے کہا۔ کیا اس لڑکی کو کام پر تم نے لگایا ہے۔ سنو شہباز! وہ ہماری پناہ میں کسی کی امانت ہے۔ اگر تم نے ایسا کیا ہے تو بُرا کیا ہے۔ شہباز نے ہکلاتے ہوئے کہا۔ "یا امیر!

وہ اس قدر ہی کہہ پایا تھا کہ پیچھے سے سمیتا نے کہا۔ آپ اس سے کوئی جواب طلبی نہ کیجئے، اس نے مجھے کام پر نہیں لگا، میں سفر میں آپ کی ساتھی ہوں اور ساتھی وہی اچھے ہوتے ہیں جو مِل جُل کر کام کریں۔ میں اپنی مرضی سے گھاس پھوس جمع کر رہی ہوں۔" شہباز نے تو مجھے منع کرنے کے علاوہ یہ بھی کہا تھا کہ امیر ناراض ہوں گے لیکن میں نے اسے تسلّی دی تھی کہ آپ ناراض نہیں ہوں گے۔ نصرالدین خاموش رہا۔ اس نے دیکھا اس کے سامنے شہباز گردن جھکائے کھڑا تھا۔

نصرالدین آگے بڑھا اور پیار سے شہباز کے شانے پر ہاتھ مارتے ہوئے اس نے ہمدردی اور شفقت میں کہا۔ "شہباز! شہباز! میں اپنے رویے پر نادم ہوں تم شرمندہ کیوں ہو رہے ہو، گردن سیدھی کر کے کھڑے رہو، میں اپنے الفاظ واپس لیتا

ہوں۔ شہباز نے فوراً اپنی گردن سیدھی کرلی اور چونک اُٹھنے کے انداز میں اس نے کہا۔ "اے امیر! پہلے نہیں لیکن اب آپ مجھے شرمندہ کر رہے ہیں۔ آپ میرے سالار ہیں۔ اس معاملہ میں آپ کو مجھ سے ضرور باز پُرس کرنی چاہیئے تھی میں آپ کے رویّے پر خوش ہوں۔"

نصرالدین نے شہباز سے اپنا کلہاڑا واپس لیتے ہوئے کہا۔ "میں دیکھتا ہوں تم نے کافی لکڑیاں کاٹ کر تین بڑے بڑے ڈھیر لگا دیئے ہیں۔ اس کے علاوہ سمیتا نے بھی گھاس پھوس کے دو خاصے بڑے ڈھیر جمع کر دیئے ہیں۔ آؤ پہلے ان کٹی ہوئی لکڑیوں اور گھاس کو چٹان کے نیچے پہنچائیں۔ گو یہ دونوں چیزیں گیلی ہیں لیکن ہم ان سے آگ کا الاؤ روشن کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ میں بکری کا شکار کر کے اور اس کے گوشت کو صاف کر کے چٹان کے نیچے رکھ آیا ہوں۔ تمہیں بھوک بھی لگی ہوگی لہٰذا آؤ میں تمہارے لیے کھانے کا بندوبست کروں۔"

پھر نصرالدین مڑا اور سمیتا کی طرف دیکھتے ہوئے اس نے کہا۔ "سمیتا! سمیتا! تم چٹان کے نیچے چلی جاؤ۔ ٹھنڈک بڑھ گئی ہے۔ ہم دونوں ایسے موسموں کے عادی ہیں اگر تمہیں ٹھنڈ لگ گئی تو ہمارے لیے اس سفر کو جاری رکھنا دشوار ہو جائے گا۔"

سمیتا نے غور سے نصرالدین کی طرف دیکھتے ہوئے۔ "آپ میری اتنی فکر نہ کریں، میں اتنی کمزور اور نازک نہیں جتنی آپ سمجھ رہے ہیں۔ میں ہر موسم میں آپ کا ساتھ دینے کی ہمت رکھتی ہوں، میں فارغ نہیں بیٹھوں گی۔ آپ دونوں کٹی ہوئی لکڑیوں کو اُٹھا کر چٹان کے نیچے لے جائیں اور اس دوران گھاس کے ڈھیر میں خود اُٹھا کر چٹان کے نیچے لے جاؤں گی۔ اگر آپ نے مجھے کام نہ کرنے دیا تو میں سمجھوں گی کہ آپ میرے اور اپنے درمیان نفرت اور اجنبیت کی دیوار کھڑی کرنا چاہتے ہیں۔

نصرالدین خاموش رہا اور جواب میں اس نے کچھ نہ کہا تھا۔ سمیتا پیچھے ہٹ کر گھاس کے ایک ڈھیر کی طرف چلی گئی تھی۔ نصرالدین اور شہباز لکڑیاں اُٹھا اُٹھا کر چٹان کے نیچے رکھنے لگے تھے جب کہ سمیتا نے ساری گھاس اُٹھا کر وہاں جمع کر دی

تھی جب وہ تینوں چٹان کے نیچے اکٹھے ہوئے تو شہباز نے فکرمندی سے پوچھا۔ "گھوڑے کدھر گئے۔" نصرالدین نے تالاب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "وہ سامنے دیکھو۔ وہاں ایک تالاب ہے میں تینوں گھوڑوں کو وہاں چھوڑ آیا ہوں۔ اس تالاب میں پانی کی گھاس ہے جسے چر کر گھوڑے اپنا پیٹ بھر لیں گے۔"

شہباز مطمئن ہو گیا۔ نصرالدین نے ایک گھوڑے کی خرجین سے مرہم پٹی میں کام آنے والی روئی میں سے تھوڑی سی روئی نکال کر اس سے آگ روشن کی اور اس آگ کے اُوپر اس نے تھوڑی تھوڑی گھاس رکھنا شروع کر دی تھی۔ آگ پر خشک ہونے کے بعد گھاس آہستہ آہستہ آگ پکڑتی گئی اور یوں کافی آگ روشن ہو گئی تھی۔

تھوڑی دیر تک وہ گھاس جلاتے رہے جب کافی آگ جمع ہو گئی تو نصرالدین نے چھوٹی لکڑیاں اور بڑی لکڑیوں کا چھلکا اُتار کر اس میں ڈالنا شروع کر دیا تھا تھوڑی دیر بعد لکڑیوں کی آگ خوب بھڑک اُٹھی۔ اب نصرالدین نے بڑی بڑی لکڑیاں اس میں ڈال دیں۔ چند ثانیوں بعد آگ کا الاؤ خوب بھڑک اُٹھا تھا۔

ذبح کی ہوئی بکری کے درمیان میں سے نصرالدین نے ایک لکڑی گزاری پھر اس کا ایک سرا نصرالدین نے اور ایک شہباز نے پکڑ لیا تھا۔ اس طرح وہ گوشت بھوننے کے علاوہ اپنے کپڑے بھی خشک کرنے لگے تھے۔ سمیتا بھی ان کے پہلو میں کھڑی ہو کر اپنے کپڑے خشک کر رہی تھی۔

سمیتا کے کپڑے جب خشک ہو گئے تو اس نے نصرالدین کے گھوڑے کی زین سے بندھا ہوا بستر کھولا وہ سارا بارش سے بھیگ کر نچڑ رہا تھا۔ سارا بستر اور اس کے اندر سے کمبل نکال کر سمیتا نے نچوڑے اور انہیں آگ کے الاؤ کے قریب پھیلا دیا بارش اب اور زیادہ تیز ہو گئی تھی۔ ہر طرف پانی ہی پانی ہو گیا تھا۔ پہاڑوں سے اُتر کر پانی کے چھوٹے چھوٹے نالے میدان میں جل تھل کر گئے تھے۔

نصرالدین اور شہباز نے مل کر گوشت کو بھون لیا تھا۔ اتنی دیر تک نصرالدین کے بستر سے نکلنے والے تین کمبل اور دو چادروں کو سمیتا آگ کے سامنے پھیلا پھیلا کر

خشک کر چکی تھی۔ بُھنا ہُوا گوشت نصرالدین نے شہباز کو تھمایا۔ خود اس نے سمیتا سے ایک کمبل لے کر خشک زمین پر بچھایا۔ اس کے اُوپر اپنی زین سے چمڑے کی خرجین علیحدہ کر کے رکھی اور اس زین پر اس نے بُھنی ہوئی پوری بکری کو رکھ دیا۔ پھر اس نے شہباز اور سمیتا سے کہا۔ آؤ مل کر کھانا کھائیں۔ یہ بارش نہیں تھمنے کی شاید ہمیں یہاں زیادہ انتظار کرنا پڑے۔

تینوں اس کمبل پہ بیٹھ گئے۔ نصرالدین نے اپنے خنجر سے گوشت کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کاٹ کر پھیلا دیئے تھے اور جب وہ ٹھنڈے ہو گئے تو تینوں مل کر کھانے لگے تھے۔

بارش ابھی تک اسی طرح جاری تھی۔ تینوں گھوڑے تالاب کے موٹے اور لمبے گھاس سے پیٹ بھر رہے تھے۔ کھانا کھانے کے بعد وہ اسی طرح آگ کے پاس پر بیٹھ کر اپنے آپ کو گرم رکھنے لگے تھے۔ اچانک وہ تینوں چونک اُٹھے۔ تینوں گھوڑے بُری طرح ہنہناتے ہوئے اور بھاگتے ہوئے ان کی طرف آئے تھے۔

سمیتا اور شہباز کی پریشانی میں اس وقت اضافہ ہو گیا جب نصرالدین اپنی جگہ سے اُٹھا۔ اس نے اپنی تلوار کھینچ لی تھی اور زین کے قریب پڑی ہوئی اپنی ڈھال بھی سنبھال لی تھی۔ شہباز بھی فوراً اُٹھا اور اس نے نارائن کی قبضہ کی ہوئی تلوار کھینچ لی تھی۔

شہباز نے بدحواسی میں پوچھا۔ ”یا امیر! یہ کیا ہوا ہے؟ اتنے میں تینوں گھوڑے چٹان کے نیچے آ گئے تھے ان میں سب سے آگے آگے نصرالدین کا گھوڑا تھا۔ سمیتا بھی خوفزدہ سی ہو کر کھڑی ہو گئی تھی۔ نصرالدین نے اس جوہڑ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”گھوڑوں کا یوں بھاگ کر اِدھر آنا خالی از علت نہیں ہے۔ ضرور انہوں نے کوئی درندہ دیکھا ہو گا۔ تم دونوں یہیں ٹھہرو، میں اس جوہڑ کی طرف جا کر دیکھتا ہوں جس میں گھوڑے چر رہے تھے۔ اگر بارش نہ ہوئی ہوتی اور گھوڑے بھاگ کر آتے تو کوئی اتنی بات نہ تھی میں یہی سمجھ لیتا کہ کوئی درندہ تالاب سے پانی پینے آیا ہو گا جس سے گھوڑے بدک گئے لیکن اس اندھی بارش اور زور دار مینہ میں جس درندے کو دیکھ کر یہ گھوڑے بھاگے ہیں وہ ضرور بھوکا ہو گا۔ اگر وہ ہمیں دیکھ کر گھوڑوں کے پیچھے نہ آیا اب بھی وہ اِدھر اُدھر منڈلائے گا اور موقع پا کر ہم پہ یا گھوڑوں پر حملہ آور ہو گا۔

نصرالدین جب چٹان کے نیچے سے نکل کر اس جوہڑ کی طرف جانے لگا تو سمیتا نے فوراً سامنے آ کر اس کا راستہ روکتے ہوئے کہا ادھر تالاب کی طرف جانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ آپ کا اکیلے جانا خطرناک ہے۔ آپ یہیں رہیئے، جو بھی درندہ ہے اسے اِدھر ہی آنے دیجئے۔ یہاں ہم تینوں مل کر اپنا بہتر دفاع کر سکتے ہیں۔ یہاں آگ کا الاؤ بھی روشن ہے اور کوئی بھی درندہ اِدھر آتے ہوئے ضرور خوفزدہ ہو گا——

سمیتا کہتے کہتے خاموش ہو گئی کیونکہ تالاب کی طرف سے سیاہ رنگ کا ایک بڑا ریچھ نمودار ہُوا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ آ رہا تھا۔ شاید گھوڑے اسے دُور سے دیکھ کر ہی بھاگ آئے تھے۔

نصرالدین نے اطمینان کا سانس لیتے ہوئے کہا۔ اس کی خیر ہے پر اسے ذرا دُور ہی روکنا چاہیئے اگر یہ چٹان کے پاس آ گیا تو گھوڑے بدک جائیں گے اور اِدھر اُدھر بھاگ کر طوفان کھڑا کر دیں گے۔ تم دونوں یہیں رکو اور دیکھو میں اس کا کیا حشر کرتا ہوں“۔ سمیتا پھر اسے روکنا چاہتی تھی پر نصرالدین پہلے ہی تلوار سونت کر باہر نکل گیا۔ نصرالدین کو قریب آتا دیکھ کر ریچھ ذرا رکا پھر تیزی سے اس کی طرف بھاگا۔ اتنی دیر تک شہباز بھی اپنی تلوار لہراتا ہُوا نصرالدین کے پیچھے ہو لیا۔ سمیتا بھی فوراً حرکت میں آئی الاؤ کے اندر سے اس نے جلتی ہوئی ایک لکڑی اُٹھائی اور شہباز کے ساتھ ہو لی۔

نصرالدین نے ان دونوں کو اپنے پہلو میں دیکھ کر کہا ”تم دونوں کپڑے بھگونے کے لیے کیوں آ گئے ہو۔ ریچھ کا سامنا کوئی اتنا اہم تو نہیں ہے۔ ابھی تو میرے پاس تلوار اور ڈھال ہے۔ میں خالی ہاتھ بھی ہوتا تو بھی میں اس کا گلا گھونٹ کر مار دیتا۔

ریچھ قریب آتے ہی حملہ آور ہُوا۔ اس نے نصرالدین کی ران پر مُنہ مارنا چاہا نصرالدین نے اس کے مُنہ کے سامنے ڈھال کر لی اور اسی لمحہ اس کی آتشیں تلوار بلند ہو کر سنسناتی ہوئی ریچھ کی کمر پہ گری اور اسے دو حصوں میں کاٹتی ہوئی نکل گئی تھی۔

سمیتا نے خوش ہوتے اور مسکراتے ہوئے کہا۔ آپ نے ہمیں تو کچھ کرنے کا موقع ہی نہیں دیا ورنہ میں اس کے منہ پر مارنے کے لیے الاؤ سے جلتی ہوئی لکڑی نکال کر لائی تھی۔

نصرالدین نے اپنی تلوار صاف کر کے نیام میں کر لی۔ دوبارہ وہ تینوں چٹان کے نیچے آئے۔ نصرالدین اور شہباز دوبارہ آگ کے پاس کھڑے ہو کر اپنا لباس خشک کرنے لگے تھے جب کہ سمیتا بچھا ہوا کمبل تہ کرنے لگی تھی۔ نصرالدین نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "یہ تم کیا کر رہی ہو، آجاؤ اپنے کپڑے خشک کر لو۔"

سمیتا نے کمبل تہ کر کے بستر میں باندھتے ہوئے کہا۔ "اب ہم یہاں نہیں ٹھہریں گے اپنے گھوڑوں پر زینیں ڈالیے اور یہاں سے کوچ کریں۔ یہاں کسی کوئی اور درندہ بھی نمودار ہو سکتا ہے اور ان میں سے اگر کوئی ہمیں غافل پا کر ہم پر آور ہو گیا تو ہمارا کیا حشر ہو گا۔"

نصرالدین نے آگ پر ہاتھ پھیلاتے ہوئے کہا لیکن ابھی تو تیز بارش ہو رہی ہے۔" سمیتا نے بستر زین سے باندھتے ہوئے کہا۔ بارش میں سفر کرنا منظور ہے لیکن اب ہم اس خطرناک جنگل میں نہیں ٹھہریں گے۔ آپ کھڑے کیوں ہیں گھوڑوں پر زینیں ڈالیں نہیں تو میں خود ڈالتی ہوں۔"

نصرالدین اور شہباز نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا پھر انہوں نے خاموش نگاہوں میں ہی کوئی فیصلہ کیا۔ اس کے بعد وہ دونوں آگ کے پاس سے ہٹ گئے اور گھوڑوں پر زینیں ڈالنے لگے تھے۔ سمیتا کے لال گلابی ہونٹوں پر خوش کن مسکراہٹ بکھر گئی تھی اور اس نے بچا ہوا گوشت نصرالدین کے گھوڑے کی چرمی خرجین میں ڈال دیا تھا۔ ایک بار پھر وہ اپنے گھوڑوں پر سوار ہوئے اور تیز بارش میں وہ تینوں چیتل ورگ کی طرف کوچ کر رہے تھے۔

دوپہر کے قریب بارش تھم گئی تھی، آسمان صاف ہو گیا تھا اور دھوپ نکل آئی تھی۔ نصرالدین، سمیتا اور شہباز چیتل ورگ میں داخل ہو رہے تھے۔ سمیتا ان دونوں

کے آگے آگے تھی اور ان کی راہنمائی کرتی جا رہی تھی۔ مشکیزہ گروں کے محلے میں سمیتا رک گئی اور ایک حویلی کے دروازے پر اس نے دستک دی۔ تھوڑی دیر بعد ایک بوڑھے ہندو نے دروازہ کھولا۔ سمیتا نے اپنے گھوڑے کی باگ چھوڑ دی اور بھاگ کر اس بوڑھے سے لپٹ گئی۔

نصرالدین اور شہباز اپنے گھوڑوں کی باگیں پکڑے باہر کھڑے تھے۔ اس بوڑھے سے علیحدہ ہو کر سمیتا نے نصرالدین کو مخاطب کر کے کہا۔ "یہ میرے نندراج ہیں۔" پھر اس نے اپنے ماموں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "ماموں! یہ نصرالدین اور شہباز ہیں شاید بھائی آپ کو ان کے متعلق بتا چکے ہوں گے۔"

قبل اس کے نندراج جواب میں کچھ کہتا دروازے پر ستیہ جیت اور اسمٰعیل نمودار ہوئے۔ اپنی بہن کو دیکھ کر ستیہ جیت کے چہرے پر مسکراہٹ کھیل گئی تھی وہ دونوں آگے بڑھے اور نصرالدین اور شہباز سے گلے ملنے لگے تھے۔ علیحدہ ہو کر ستیہ جیت جب نصرالدین کے ہاتھ سے اس کے گھوڑے کی باگ پکڑنا چاہی تو نصرالدین نے اپنا وہ ہاتھ جس میں اس نے باگ پکڑ رکھی تھی پیچھے ہٹاتے ہوئے کہا۔

"نہیں ستیہ جیت! میں یہاں رکوں گا نہیں۔ تم شہباز کو اندر لے جاؤ۔ میں اسمٰعیل اور شہباز دونوں کو تمہارے پاس چھوڑے جا رہا ہوں یہ دونوں تمہارا خیال رکھیں گے کیونکہ جب سلطان حیدر علی ادھر کا رخ کریں گے تو وہ تم سے ضرور ملنا پسند کریں گے۔"

ستیہ جیت نے تشویش آمیز نگاہوں سے نصرالدین کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "اور آپ اس وقت کہاں جائیں گے۔" نصرالدین نے اپنے گھوڑے کی گردن پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ "میں ابھی اور اسی وقت یہاں سے روانہ ہوں گا۔ میری منزل سرنگا پٹن ہو گی۔ میں وقت ضائع کیے بغیر سلطان کو اپنی کارگزاری سے آگاہ کرنا چاہتا ہوں۔"

ستیہ جیت نے احتجاج کرتے ہوئے کہا۔ "یہ کیونکر ہو سکتا ہے۔ آپ تھکے ہوئے ہیں، آپ کو آرام کی ضرورت ہے میں ابھی آپ کو روانہ نہ ہونے دوں گا۔"

نصرالدین کی روانگی کا سُن کر سمیتا کے چہرے پر ہوائیاں اُڑ گئی تھیں۔ وہ
اُداس ہو گئی تھی۔ کسی آب جو میں تنہا کنول اور کسی دشت میں کھڑے اکیلے زیتو
کے درخت کی طرح۔ وہ افسردہ ہو گئی تھی۔ دھواں چھوڑتے بجھے ہوئے چراغ
پچھلے پہر کے تاروں کی لمحہ بہ لمحہ ڈوبتی پرچھائیوں کی طرح۔ پھر اس نے بڑی مشکل سے ا
آپ کو مجتمع کیا اور سوگوار آواز میں نصرالدین کی طرف دیکھتے ہوئے اس نے کہا۔
"آپ گھر سے باہر ہی باہر کیونکر لوٹ جائیں گے۔" پھر سمیتا نے اپنے
ستیہ جیت کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "یہ لگاتار بارش میں سفر کرتے ہوئے تھکے ہ
ہیں۔ اس کے علاوہ پچھلی شب ہی انہوں نے شہباز کو گولی ورگ کے قیدخانے سے
رہا کرانے کے علاوہ مجھے بدنور کی رانی کے غلام نارائن سے بچایا اور اس سے جنگ
کر کے اس کو قتل کر دیا۔ پھر راستے میں انہوں نے ایک ریچھ کو مار کر بھی میری اور
شہباز کی جان بچائی تھی۔ آپ انہیں اس وقت روانہ نہ ہونے دیجیئے۔ انہیں آر
کی ضرورت ہے۔" سمیتا کی آواز میں کپکپاہٹ اور لہجہ میں یاس تھی۔

نصرالدین نے کچھ سوچا پھر وہ ستیہ جیت کے کچھ کہنے سے قبل ہی ح
میں داخل ہو گیا تھا۔ اس کے ہاتھ سے گھوڑے کی باگ ستیہ جیت نے لے لی
جب کہ شہباز کا گھوڑا اسمٰعیل نے پکڑ لیا تھا اور وہ انہیں اصطبل کی طرف لے
رہے تھے۔ اتنے میں حویلی کے زنان خانے کی طرف سے سمیتا کی ممانی اور اس
ماموں زاد بہنیں باہر نکل آئیں۔ وہ سمیتا کو گلے لگا کر ملیں اور اسے زنان خانے
طرف لے جا رہی تھیں۔ ممانی اور اس کی دونوں بیٹیاں سمیتا کو زنان خانے
ایک آراستہ کمرے میں لائیں۔ انہوں نے سمیتا کو ایک گدّے دار چوکی پر اپنے
بٹھایا پھر وہ اس سے بدنور میں تنہائی کے دن گزارنے اور نصرالدین کے سا
بدنور سے چیتل درگ کے سفر کی داستان سُن رہی تھیں۔

اصطبل میں آ کر نصرالدین نے ستیہ جیت کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔
"ستیہ جیت! ستیہ جیت! مجھے غور سے سنو! میں تمہاری بہن

دل نہ توڑنا چاہتا تھا۔ وہ مجھے اپنا محسن خیال کرتی ہے اس کا دِل رکھنے کی خاطر مَیں حویلی کے
اندر آ گیا ہوں۔ اب جب کہ وہ مطمئن ہو کر زنان خانے کی طرف چلی گئی ہے مجھے رخصت
ہونے کی اجازت دو۔ یاد رکھو! میرے کام کی نوعیت میرے آرام سے کہیں زیادہ اہم
ہے۔ سلطان حیدر علی میرا انتظار کر رہے ہوں گے۔ مَیں یہاں رُک کر اپنا وقت ضائع
نہیں کرنا چاہتا۔ مَیں اور میرا گھوڑا اس سے بھی زیادہ تکلیف دہ سفر کے عادی ہیں اور
پھر اسمٰعیل اور شہباز جانتے ہیں میرا فیصلہ اٹل اور قائم ہوتا ہے۔ مجھے اُمید ہے تم
زبردستی مجھے یہاں روک کر میرے طریقہ کار میں خلل نہ ڈالو گے۔"

ستیہ جیت نے اپنی گردن جھکاتے ہوئے کہا۔ "اگر آپ ایک نیک مقصد کی
خاطر یہاں سے کُوچ کا ارادہ کر ہی چکے ہیں تو مَیں آپ کو روکنے کی جرأت نہیں کرونگا۔"

ستیہ جیت نے ہاتھ میں پکڑی ہوئی نصرالدین کے گھوڑے کی لگام اسے تھما
دی۔ نصرالدین نے ستیہ جیت، اسمٰعیل اور شہباز سے مصافحہ کیا پھر وہ اپنے گھوڑے
پر سوار ہوا اور اُسے ایڑ لگا کر حویلی سے باہر نکل گیا تھا۔

اسے رخصت ہوئے ابھی چند ثانیے ہی گزرے تھے اور ستیہ جیت، اسمٰعیل
اور شہباز ابھی صحن میں ہی کھڑے تھے کہ سمیتا اپنی ماموں زاد بہنوں کے ساتھ باہر آئی
اور ستیہ جیت کو مخاطب کر کے اس نے کہا۔

"بھائی! نصرالدین کہاں ہیں؟ اُنہیں زنان خانے کی طرف بھیجیئے، ممانی
انہیں ملنا چاہتی ہیں۔"

ستیہ جیت نے گردن جھکاتے ہوئے کہا۔ "وہ ابھی ابھی یہاں سے سرنگاپٹن
کی طرف کُوچ کر گئے ہیں۔ افسوس ان کے کام کی نوعیت کے باعث مَیں اُنہیں روک نہ
سکا تھا۔"

دُکھ اور پریشانی میں سمیتا شمع کی طرح گھُل سی گئی۔ مُنہ سے وہ کچھ نہ کہہ پائی
تھی۔ وہ واپس مڑی اور زنان خانے کی طرف جاتے ہوئے چکرا کر گر پڑنے والی تھی کہ
اس کی دونوں ماموں زاد بہنیں اسے پکڑ کر اندر لے گئی تھیں۔

سُورج غروب ہونے کو تھا ۔ پرندے اپنی پوری آہنگی و توازن کے ساتھ نوائے مطربہ جیسی آوازیں نکالتے ہوئے غول در غول اپنے آشیانوں کو لوٹ رہے تھے ۔ نصرالدین اپنے گھوڑے کو سرپٹ دوڑاتا ہُوا دریائے کاویری کا چوبی پُل عبور کر رہا تھا آسمان کے حاشیوں پر پھیلتی شفق نے دریائے کاویری کا سینہ بھی سُرخ کر دیا تھا ۔ دریا کی سُرخی مائل ہلکی ہلکی لہریں ہونکتے جنگل کے درندوں کی طرح چُپ اور دُور حدِ نگاہ تک پھیلی ہوئی گونگی پگ ڈنڈیوں کی طرح خاموش تھیں ۔ دریا کے وسط میں اپنی کشتیوں میں کھڑے ہو کر جال پھینکتے اور کھینچتے ماہی گیر کانوں میں رس اُنڈیلتی آوازوں میں پرانے گیت گا رہے تھے ۔

نصرالدین اپنے گھوڑے کو سرپٹ دوڑاتا ہُوا سرنگاپٹن شہر میں داخل ہو چکا تھا ۔ اپنے گھوڑے کو ایڑ پر ایڑ لگائے سُورج غروب ہونے سے قبل ہی وہ سلطان حیدر علی کے ایوان میں داخل ہو رہا تھا ۔ وہ سیدھا اس دیوان خانے کی طرف گیا جس کے اندر بیٹھ کر سلطان شام تک اپنے جرنیلوں کے ساتھ بیٹھ کر صلاح و مشورہ کیا کرتا تھا ۔

اس دیوان خانے کے سامنے کھڑے محافظوں میں سے ایک نے بھاگ کر نصرالدین کے گھوڑے کی باگ پکڑ لی تھی جب کہ نصرالدین اپنے گھوڑے سے کُود کر اُترا ۔ اپنے سر پر آہنی خود اور کمر سے بندھی تلوار کی چرمی پیٹی کو درست کیا ۔ پھر وہ اس دیوان خانے میں داخل ہو گیا تھا ۔

اندر سلطان حیدر علی کے ساتھ اس کے جرنیل محمد علی کمندان، ہیبت جنگ سلطان کے برادرِ نسبتی حسین بیگ اور سلطان کا مشہور اور وفادار ہندو جرنیل ادھو بیٹھے ہوئے تھے ۔ نصرالدین جونہی دیوان خانے میں داخل ہُوا حیدر علی اُٹھ کھڑا ہوا

اس کے ساتھ ہی سارے جرنیل بھی کھڑے ہو گئے تھے

حیدر علی نے اپنے بازو پھیلاتے ہوئے کہا "خوش آمدید ! مرحبا ! اے فرزندِ ہونہار ! تو عین وقت پر وارد ہُوا ۔ مَیں تیرے ساتھیوں کے ساتھ تیرے ہی متعلق گفتگو کر رہا تھا ۔ حیدر علی نے آگے بڑھ کر بڑی شفقت سے نصرالدین کو اپنے ساتھ لپٹا لیا تھا ۔ پھر علیحدہ ہو کر وہ دُوسرے جرنیلوں سے مصافحہ کرنے کے بعد ایک خالی نشست پر بیٹھ گیا تھا ۔ پھر اس نے حیدر علی سے بدنور کے طرزِ حکمرانی، رانی کے لشکر کی تعداد اس کے نظم و نسق اور رعایا پر اس کے مظالم کے علاوہ اس کی عیاشیوں اور رنگ رلیوں کی ساری داستان کہہ سُنائی تھی ۔

نصرالدین جب خاموش ہُوا تو حیدر علی نے کچھ سوچتے ہوئے کہا "میرے چند سوالوں کے جواب دو" ۔ نصرالدین نے مستعد ہو کر بیٹھتے ہوئے کہا " پوچھیے " ۔

حیدر علی نے کہا " سابق حکمران طبقے کا وہ جوان کہاں ہے جس نے ہمیں بدنور پر حملہ آور ہونے کی دعوت دی تھی اور جس کا نام ستیہ جیت ہے ۔

نصرالدین نے اپنے سَر سے خود اُتار کر گود میں رکھتے ہوئے ستیہ جیت اور اسمٰعیل سے ملاقات، شہباز کی رہائی، سمیتا کی مدد اور بدنور سے چیتل درگ تک سارے واقعات تفصیل سے کہہ دیئے تھے ۔

حیدر علی نے پھر پوچھا ۔ " بدنور شہر کی فصیل کیسی ہے " ۔ نصرالدین نے سوچتے ہوئے کہا " کافی مضبوط اور خوب چوڑی دیوار ہے جس میں شگاف کرنا اگر ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے " ۔

" جنگ کی صورت میں کیا رانی کے پاس اس قدر لشکر ہے کہ وہ کھُلے میدان میں ہم سے جنگ کر سکے " ۔

" اس کے لشکر کی تعداد ہمارے لشکر سے زیادہ ہے اور اگر اس لشکر کو لڑانے والا کوئی سمجھ دار اور جرأت مند جرنیل ہو تو وہ بدنور کو ایک آہنی حصار میں بھی بدل سکتا ہے " ۔

حیدر علی نے پھر کچھ سوچنے کے بعد پوچھا "جنگ کی صورت میں بدنور کی رانی کو باہر سے کسی اور کی مدد یا کمک ملنے کی اُمید ہے"۔ نصرالدین نے بلا توقف کہا "ہاں جنگ کی صورت میں ساؤنور کا مسلمان اور افغان حکمران عبدالحکیم خاں اس کی مدد کرے گا۔ بدنور کی رانی اور عبدالحکیم کے درمیان گہرے مراسم اور دیرینہ تعلقات ہیں"۔ حیدر علی نے چونکتے ہوئے کہا "حیرت ہے، بدی کے خلاف جہاد میں ایک مسلمان حکمران ہماری مخالف قوت کے ساتھ مل کر ہمارے ساتھ جنگ کرے گا"۔

نصرالدین کچھ کہنا چاہتا تھا کہ ایوان کے در و بام قریبی مسجد میں اذان کی آواز سے گونج اُٹھے۔ سب اُٹھ کھڑے ہوئے اور نماز ادا کرنے کے لیے مسجد کی طرف چل پڑے تھے۔ نماز کے بعد نصرالدین تھوڑی دیر اور حیدر علی کے پاس بیٹھ کر آئندہ جنگ کے متعلق گفتگو کرتا رہا۔ پھر وہ اپنے گھوڑے پر سوار ہو کر ایوان سے نکلا اور اپنے گھر کی طرف روانہ ہو گیا تھا۔

محلہ کمان گراں میں اپنی حویلی کے سامنے وہ اُتر گیا۔ اس نے دروازہ دبا کر دیکھا وہ بند تھا۔ لہٰذا اس نے دروازے پر دستک دی۔ تھوڑی دیر بعد دروازہ کھلا۔ دروازہ کھولنے والی وہی خادمہ تھی جسے اس کی ماں کی خدمت کے لیے حیدر علی نے اپنی محل سرا سے مہیا کیا تھا۔

وہ پچاس کے سن کی ایک خوب دراز قد اور مضبوط اعضاء کی عورت تھی اور اس کے چہرے سے ذہانت اور دانش مندی ٹپکتی تھی۔ وہ آگے بڑھی اور پیار و شفقت سے اس نے نصرالدین کے سر پہ ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا "کیسے ہو بیٹے!" نصرالدین نے بڑی بے تابی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ "بوا! بوا! میری ماں کیسی ہے؟"

اس خادمہ کا نام صالحہ تھا پر نصرالدین اسے "بوا" کہہ کر مخاطب کیا کرتا تھا۔ حویلی کا سارا دروازہ کھول کر پیچھے ہٹتے ہوئے بوا نے کہا "پہلے اندر تو آؤ بیٹا! تمہاری ماں خیریت سے اور صحت مند ہے لیکن وہ تجھے بہت یاد کرتی رہی ہے۔ آج فجر کی نماز کے بعد انہوں نے تمہاری سلامتی اور واپسی کی دعا اپنے رب سے بڑی عاجزی اور مسکینیت

کے ساتھ مانگی تھی۔ میں سمجھتی ہوں کہ خاتون کی درد بھرے الفاظ پر مبنی دعا قبول ہوئی جو اس وقت تم غیر متوقع طور پر لوٹ آئے ہو"۔

اپنی ماں کی خیریت کا سن کر نصرالدین کے لبوں پر مسکراہٹ بکھر گئی تھی۔ وہ حویلی میں داخل ہوا اور بوا نے دروازہ بند کر دیا۔ نصرالدین سیدھا حویلی کے چھوٹے سے اصطبل میں آیا۔ اپنے گھوڑے کی لگام اور زین اُتار کر اس نے ایک طرف رکھ دی تھی۔ اصطبل کے ایک کونے سے اس نے ٹوکری میں باریک بھس بھر کر گھوڑے کے سامنے لکڑی کی بنی ہوئی لمبی سی ایک ناند میں ڈالا۔ دوبارہ وہ اسی کونے میں آیا۔ ٹوکری کو اس نے وہیں رکھ دیا اور وہیں سے ٹاٹ کا ایک بڑا سا ٹکڑا لے کر اس نے زمین پر بچھایا اور کونے میں رکھی بوری کے اندر سے اس نے پسے ہوئے چنے نکال نکال کر اس ٹاٹ پر رکھنے شروع کر دیے۔ جب ٹاٹ کا وہ ٹکڑا بھر گیا تو اس نے اُسے اٹھایا اور گھوڑے کے سامنے بھس میں ملا دیا۔ گھوڑا پہلے بھس میں بے دلی سے منہ مار رہا تھا اس میں دانہ مل جانے سے وہ تیز تیز منہ چلانے لگا تھا۔ نصرالدین نے پہلے اس کی گردن تھپتھپائی پھر پیٹھ پر پیار سے ہاتھ پھیرا اس کے بعد وہ حویلی کے اندرونی حصے کی طرف چلا گیا تھا۔

نصرالدین اپنے سر سے آہنی خود اُتارتا ہوا ایک کمرے میں داخل ہوا۔ کمرہ چار طاقچوں والے چوکھے چراغ کی روشنی سے روشن تھا جس کے اندر چربی جل رہی تھی اور کمرے کی دائیں جانب کی دیوار کے ساتھ لکڑی کے ایک تخت پوش پر اس کی ماں بیٹھی تھی۔ اس نے گرم اُونی چادر اوڑھ رکھی تھی اور اس کے قریب ہی آتش دان میں آگ روشن تھی اور گھر کی خادمہ وہاں بیٹھی آگ کو اُکسا کر تیزی بھڑکانے کی کوشش کر رہی تھی۔

نصرالدین جب کمرے میں داخل ہوا تو اس کے پاؤں کی آہٹ پاتے ہی اس کی ماں نے بے تاب ہو کر پوچھا۔

"نصر! نصر! تو آ گیا بیٹے! تو نے اصطبل میں اتنی دیر کر دی۔ کیا کرتے رہے وہاں۔ بوا کب سے مجھے تمہاری آمد کی اطلاع کر چکی ہے پر تم آ ہی نہ رہے تھے"۔

نصرالدین چپ چاپ آگے بڑھا۔ ماں کے سامنے وہ گھٹنوں کے بل زمین پر بیٹھ گیا۔

پھر جھک کر اس نے اپنی ماں کے پاؤں کو ایک طویل بوسہ دیا تھا۔ پھر وہ سیدھا ہوا اور کسی معصوم اور سیدھے سادے بچے کی طرح اس نے اپنا سر ماں کی گود میں رکھ دیا تھا۔

اس کی ماں پیار سے اس کے جسم کو ٹٹولنے لگی۔ پہلے اس نے بیٹے کی پتھریلی چٹانوں جیسی چوڑی چھاتی پہ ہاتھ پھیرا پھر وہ درختوں کے تنوں کی طرح اس کے مضبوط بازوؤں کو اپنے ہاتھوں میں لے کر دباتی رہی پھر اس نے خشک شاخوں کی طرح نصرالدین کی سخت انگلیوں کو اپنے ہاتھ میں تھامتے ہوئے کہا۔

"میرے بیٹے! تو میری زندگی کی کڑی اور آخری ریاضت کا امتحان ہے ہر میدانِ عمل خدا تیرا حیلہ گر اور ہر فردگاہ میں وہی تیرا چارہ ساز ہوگا۔ میرے بچے! تو میری آخری پونجی اور سب سے قیمتی متاع ہے۔ میرا رب تجھے چراغوں کی روشنی کی طرح منور اور بے ضمیری کے اندھے اور اندھیرے خواب سے گریز پا رکھے۔ اللہ پاک تجھے توفیق دے کہ تو وطن کے ستارہ سحر، قوم کے لیے روشن چاند اور مذہب کے لیے خورشید بن کر چمکے۔

بوڑھی ماں نیچے جھکی اور نصرالدین کی پیشانی کا بوسہ لیتے ہوئے اس نے پوچھا۔

"تو کہاں کہاں گیا تھا بیٹے!" بچوں کی طرح ماں کی گود میں سر رکھے ہی رکھے نصرالدین نے سرنگاپٹن سے کوچ اور واپسی تک سارے حالات تفصیل سے کہہ دیئے تھے۔

بوڑھی ماں جس کا نام خولہ تھا چند ثانیوں تک اَن جانی اور گہری سوچوں میں کھوئی رہی پھر اس نے نصرالدین سے کہا۔

"نصر! نصر! میرے بیٹے! تم اس لڑکی کو جس کا نام تم نے سمیتا بتایا ہے۔ اپنے ساتھ ہی لے آتے وہ یہاں میرے پاس رہتی۔ میرے پاس رونق ہوتی اور میں سمجھتی خدا نے مجھے بیٹی دے دی ہے۔ کاش"

نصرالدین نے ماں کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ "وہ پرائی بیٹی ہے ماں! ایسے میں کیسے اور کیونکر اپنے ساتھ لے آتا۔ میں پہلے سے اس کا واقف نہ دادخواہ پھر میں اسے اپنے ساتھ لا کر کیوں تمہارے لیے شرمندگی اور رسوائی کا باعث بنتا۔"

بوڑھی خولہ نے نصرالدین کی پیشانی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا تو بہت دانشمند

اور دُور اندیش ہے بیٹے! میں تیرے ارادوں کی طہارت اور تمہارے اعمال کی پاکیزگی سے خوش ہوئی ہوں"۔ اس کے ساتھ ہی خولہ زور زور سے بوڑھی خادمہ کو آواز دینے لگی۔ "صالحہ! صالحہ! میرے بیٹے کو بھوک لگی ہوگی اس کے لیے کھانا لے کر آؤ۔"

آتش دان کے پاس بیٹھی ہوئی ملازمہ اُٹھ کر باہر نکل گئی۔ تھوڑی ہی دیر بعد وہ لوٹی اس نے ہاتھوں میں ایک طشت اُٹھا رکھا تھا جس میں کھانے کے برتن تھے۔ طشت، صالحہ نے نصرالدین کے سامنے رکھ دیا۔ نصرالدین ماں کے قدموں میں ہی بیٹھ کر کھانا کھانے لگا تھا۔

حیدر علی نے اپنے لشکر کی تیاری پر صرف چند یوم ہی صرف کیے اس کے بعد اس نے ملکی امور کی دیکھ بھال کے لیے اپنے برادرِ نسبتی مرزا حسین بیگ کو سرنگاپٹن میں چھوڑا اور شہر میں جو حفاظتی لشکر تھا اس کا سالار اس نے محمد علی کمندان کو مقرر کرنے کے بعد سرنگاپٹن سے کوچ کیا تھا۔ اپنے لشکر کو اس نے شروع ہی سے چار برابر حصوں میں تقسیم کر دیا۔ ایک حصّہ اس نے اپنے پاس رکھا۔ دوسرا نصرالدین، تیسرا ہیبت جنگ اور چوتھا مشہور ہندو جرنیل اودجی رام کے حوالے کیا۔

اس طرح اپنے لشکر کی مناسب تقسیم کے بعد حیدر علی طوفانی انداز میں اپنے غنیم کی طرف بڑھا۔ سیدھا بدنور پر حملہ آور ہونے کے بجائے پہلے اس نے رانی پر اپنی داد و دہشت بٹھانے کی خاطر اس کے اردگرد چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں آگ اور آہن کا طوفان کھڑا کر دیا۔ اس کا پہلا حدف چیتل درگ کا شہر بنا۔ شہر کے اردگرد اس نے میلوں تک اپنے لشکروں کو پھیلا کر جنگ پر آمادہ مسلح لوگوں کا صفایا کر دیا تھا پھر اپنے سارے بکھرے ہوئے لشکروں کو اس نے چیتل درگ کے سامنے اکٹھا کیا۔ خیمے نصب کر کے پڑاؤ کیا گیا اور شہر پر حملہ آور ہونے کی تیاری شروع کی گئی۔

چیتل درگ کے پالیکار (حاکم) نے جب حیدر علی کے لشکر کی تعداد اور قوت کا اندازہ لگایا تو اس نے جنگ کرنا فضول سمجھا۔ ایک روز شام سے ذرا قبل اس نے

شہر کا دروازہ کھولا۔ اپنے چند سواروں کے ساتھ وہ ہاتھ میں صلح کا سفید جھنڈا لیے حیدر علی کے لشکر کی طرف بڑھا تھا۔

حیدر علی کے لشکر میں اس وقت آگ کے الاؤ روشن تھے اور لشکر کے لیے کھانا تیار ہو رہا تھا۔ حیدر علی اپنے خیمے میں رات کے وقت شہر پر حملہ آور ہونے کے لیے نصر الدین، ہیبت جنگ اور ادجی رام سے مشورہ کر رہا تھا۔ اسی وقت خیمے کے گرد پہرہ دینے والے محافظوں کا امیر اندر آیا اور حیدر علی کو چیتل درگ کے پالیکار کے آنے کی اطلاع کی۔ حیدر علی نے اُسے اندر بھیجنے کو کہہ دیا اور تھوڑی ہی دیر بعد چیتل درگ کا ہندو حاکم خیمے میں داخل ہُوا تھا۔ حیدر علی نے اس کی عزت افزائی کی اور اسے اپنی برابر کی نشست پر بیٹھنے کو جگہ دی۔

شہر کا حکمران جو لرزتا کانپتا خیمے میں داخل ہُوا تھا حیدر علی کے اس حسنِ سلوک پر سنبھل کر مطمئن ہو گیا اور کسی قدر بے جھجک ہو کر اس نے حیدر علی سے کہا۔ "میں کمزور ہوں، آپ سے جنگ نہیں کر سکتا بلکہ جس عزم کے لیے آپ نکلے ہیں میں اس میں آپ کا ساتھ دوں گا لیکن اس کے ساتھ میری چند شرائط بھی ہیں"۔

حیدر علی نے بڑی ہمدردی سے کہا۔ "تم اپنی شرائط کہو"۔

شہر کے پالیکار نے کہا۔ "میں سالانہ آپ کو دو لاکھ کا نقد خراج ادا کیا کروں گا اس کے علاوہ اگر آپ نے میری شرائط مان لیں تو آج دو لاکھ کے سالانہ خراج کے علاوہ جنگ کی تیاری کے لیے ایک لاکھ کی نقد رقم اور آپ کے حضور پیش کروں گا۔ میری شرائط یہ ہیں کہ مجھے شہر کی حاکمیت پر بحال رکھا جائے۔ آپ کا لشکر شہر میں داخل نہ ہو۔ آئندہ مجھ پر میرا کوئی دشمن حملہ آور ہو تو آپ میری مدد کریں گے۔ اس کے علاوہ ہر ضرورت کے موقع پر میں خود بھی اپنے لشکر کے ساتھ آپ کی مدد پر حاضر ہو جایا کروں گا"۔

بغیر کسی توقف کے حیدر علی نے کہا۔ "مجھے تمہاری سب شرائط منظور ہیں"۔

پالیکار نے اپنے ساتھ آنے والے سواروں کو اندر بلایا۔ اسی وقت اس نے حیدر علی کو تین لاکھ کی رقم ادا کی اور اپنے عوام کے لیے سلامتی کی خوشخبری اور امن کا پیغام لے کر وہ

واپس چلا گیا تھا۔

چیتل درگ کے حاکم کی وہاں سے روانگی کے بعد حیدر علی نے نصر الدین کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ "تمہارا وہ ستیہ جیت کہاں ہے جس نے ہمیں بدنور پر حملہ آور ہونے کی دعوت دی تھی اور بقول تمہارے اس کا قیام اب بدنور کی بجائے چیتل درگ میں ہے"۔

نصر الدین نے کسی قدر مسکراتے ہوئے کہا۔ "کیا آپ سمجھتے ہیں میں آپ کے سامنے غلط بیانی سے کام لے سکتا ہوں"۔

حیدر علی نے اپنی بات پر زور دے کر کہا۔ "نہیں ہرگز نہیں۔ تمہاری شخصیت میرے لیے ہر شبہ و اوہام سے بالا ہے۔ میرا مطلب ہے اگر وہ اس وقت چیتل درگ میں ہے تو اسے ہمارے پاس آنا چاہیے تھا"۔ نصر الدین نے اجازت طلب کرنے کے انداز میں کہا۔ "اگر آپ اجازت دیں تو میں اُسے بلا لاؤں۔ ہمارے لشکر میں رہ کر اگر وہ فائدہ مند اور سود مند نہیں تو نقصان دہ بھی ثابت نہ ہوگا۔ وہ اپنے پورے خلوص کے ساتھ ہمارا ساتھ دینا چاہتا ہے"۔

حیدر علی نے پہلو بدلتے ہوئے کہا۔ "اسے میرے پاس بلا لاؤ"۔ نصر الدین نے پھر بولتے ہوئے کہا۔ "میں اسمٰعیل اور شہباز کو ان دونوں بہن بھائیوں کی حفاظت اور دیکھ بھال پر چھوڑ آیا تھا۔ اب جب کہ چیتل درگ کا حاکم ہم سے صلح کر کے ہماری مدد پر آمادہ ہے اس حفاظت کی ضرورت نہیں رہی۔ میں چاہتا ہوں اسمٰعیل کو بدنور کی اور شہباز کو ساؤنور کی طرف روانہ کر دیا جائے تاکہ وہ رانی اور افغان حکمران عبدالحکیم خان کے متعلق ہمیں ضروری اطلاعات فراہم کرتے رہیں"۔

حیدر علی نے اطمینان کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ "تمہاری سوچ بہت گہری اور تمہارے اعمال دُور اندیشی پر مبنی ہیں۔ تم جو چاہو کرو اس میں میری اجازت کی ضرورت نہیں ہے جنگی معاملات میں تم پر میں مکمل بھروسہ کرتا ہوں"۔ نصر الدین کھڑا ہوتا ہُوا بولا۔ "تو پھر میں جاتا ہوں اور اسے لے کر آتا ہوں"۔

وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا خیمے سے باہر آیا۔ وہاں خیمے کے کھونٹے سے اس کا گھوڑا بندھا تھا جسے اس نے کھولا، اس پر سوار ہوا اور اسے شہر کی طرف اڑ لگا دی تھی۔

اپنے گھوڑے کو سرپٹ دوڑاتا اور دھول اڑاتا ہوا نصرالدین چیتل درگ کی شہر پناہ کے صدر دروازے پر آیا۔ دروازے کے محافظوں نے اسے اندر جانے سے روکا۔ نصرالدین نے انہیں سمجھاتے ہوئے کہا "کیا تمہیں علم نہیں کہ ہمارے اور تمہارے حاکم کے درمیان صلح کا معاملہ طے پا گیا ہے۔ شہر کے محلہ کمان گراں میں میرے کچھ عزیز رہتے ہیں میں اُن سے ملنا چاہتا ہوں۔"

دروازے کے محافظوں نے اُسے اندر جانے کی اجازت دے دی اور نصرالدین اپنا گھوڑا دوڑاتا ہوا شہر میں داخل ہو گیا تھا۔ محلہ کمان گراں میں آ کر اس نے سمیتا کے ماموں کی حویلی پر دستک دی تھی۔ تھوڑی دیر بعد ستیہ جیت نے دروازہ کھولا اور نصرالدین کو دیکھتے ہی اس نے فکر مندی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

"آپ یہاں؟ اگر کسی کو خبر ہو گئی کہ آپ سلطان حیدر علی کے ایک جرنیل ہیں تو آپ کی زندگی خطرے میں پڑ جائے گی۔ آپ باہر کیوں کھڑے ہیں اندر آجائیے" نصرالدین نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "تم فکر نہ کرو، مجھے کوئی خطرے نہیں ہے۔ چیتل درگ کا تمہارا پالیکار دو لاکھ سالانہ کے خراج پر صلح کر چکا ہے۔ اب شہر جنگ سے محفوظ ہے۔ تم فوراً تیار ہو اور میرے ساتھ چلو، سلطان نے تمہیں بلایا ہے۔ اسمٰعیل اور شہباز کو بھی بلاؤ انہیں اور ذمہ داریاں سونپی جا رہی ہیں۔"

ستیہ جیت نصرالدین کے گھوڑے کی باگ پکڑ کر اندر لایا اور شکوہ کرنے کے انداز میں کہا "آپ اس روز بھی جلدی میں چلے گئے۔ آپ کے جانے کے بعد سے سمیتا میرے ساتھ کئی بار لڑائی جھگڑا کر چکی ہے۔ اس کی ایک ہی ضد ہے کہ میں نے آپ کو جانے کیوں دیا۔" ایک دم ستیہ جیت سنجیدہ اور غمگین ہو گیا اور استفہامیہ انداز میں نصرالدین کی طرف دیکھتے ہوئے اس نے کہا۔ "آپ کے جانے کے تھوڑی

ہی دیر بعد جب سمیتا کو یہ خبر ہوئی کہ آپ جا چکے ہیں تو وہ چکرا گئی تھی اور گرتے گرتے بچی تھی۔

ستیہ جیت رُکا پھر ہکلاتے ہوئے اس نے کہا۔ "میری ایک ہی بہن ہے اور مجھے بے حد عزیز ہے۔ وہ بالکل اپنی ماں جیسی ہے اور میں اسے اپنی ماں کی آخری نشانی سمجھتا ہوں۔ آج تک میں نے کبھی اس کا کہا نہیں ٹالا۔ آپ آج تقریباً ایک ماہ بعد اس حویلی میں لوٹ رہے ہیں۔ یہ ایک ماہ جس انتظار و تنگی میں سمیتا نے کاٹا ہے، اسے میں ہی جانتا ہوں۔ اس دوران وہ اکثر بیمار رہی ہے۔ گو اس نے ابھی تک اپنی زبان سے کچھ نہیں کہا پھر بھی میں دیکھتا ہوں وہ آپ کو پسند کرتی ہے۔ اگر یہ درست ہوا تو میری آپ سے التماس ہے کہ آپ اسے مایوس نہ کریں۔"

نصرالدین کی گردن جھک گئی تھی۔ اس نے زبان سے کچھ نہ کہا تھا تاہم وہ خاموش رہ کر گہری گھمبیر سوچوں میں گھو گیا تھا۔ اتنے میں اسمٰعیل اور شہباز اندر سے نکل آئے۔ انہیں دیکھتے ہی نصرالدین نے کہا۔

"تم دونوں اپنے گھوڑوں پر زینیں ڈالو، تمہارا کام یہاں ختم ہوا۔ یہاں سے تم دونوں میرے ساتھ لشکر میں جاؤ گے۔ وہاں سے اپنے پورے انتظام اور مناسب رقم کے ساتھ اسمٰعیل بدنور کی طرف رانی کے لشکر پر نگاہ رکھنے کے لیے روانہ ہو گا اور شہباز سادُنور کے افغان حکمران عبدالحکیم خان کے لشکر کی نقل و حرکت کا جائزہ لے گا تاکہ اگر وہ رانی کی مدد کو آئے تو ہم رانی کے ساتھ اس سے بھی نمٹ سکیں۔"

اسمٰعیل نے نصرالدین کے قریب آ کر کہا۔ "اے امیر! ہم نے اس حویلی میں ایک ماہ گزارا ہے لیکن اس ایک ماہ میں میں اور شہباز باری باری اپنے گھر سے بھی ہو آئے ہیں۔ یہ حرکت ہم نے آپ کی اجازت کے بغیر کی تھی۔ اس لیے آپ کے علم میں لانا ضروری تھی۔"

اسمٰعیل اور شہباز اصطبل کی طرف چلے گئے۔ نصرالدین نے اسمٰعیل کو زور سے پکارتے ہوئے کہا "اسمٰعیل! اسمٰعیل! ستیہ جیت کے گھوڑے پر زین کس دو

یہ بھی ہمارے ساتھ جائے گا۔"

نصرالدین کی آواز سن کر سمیتا بھاگتی ہوئی اندر سے نکلی تھی۔ تھوڑی دیر تک برآمدے میں کھڑی ہو کر نصرالدین کو دیکھتی رہی پھر وہ آہستہ آہستہ آگے بڑھی تھی۔ ستیہ جیت نے نصرالدین کے گھوڑے کی باگ پکڑتے ہوئے کہا۔ "آپ نیچے تو اتریں نا۔ ماموں اور ممانی بھی آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔"

نصرالدین کے جواب دینے سے قبل ہی سمیتا نزدیک ہوتی ہوئی بولی۔ "یہ نیچے نہیں اتریں گے بھائی! یہ تو اس حویلی سے فوراً بھاگ جانے کے لیے آتے ہیں۔" نصرالدین نے سمیتا کی طرف دیکھا اور سنجیدہ رہتے ہوئے کہا۔ "یہ میری بدقسمتی ہے آج دوسری بار اس حویلی میں آنے کے باوجود میں یہاں رک نہ سکوں گا۔ سلطان حیدر بڑی بے چینی سے میرا انتظار کر رہے ہوں گے۔ میں ستیہ جیت، اسمٰعیل اور شہباز کو لینے آیا ہوں۔ اب یہاں تم لوگوں کو کوئی خطرہ نہیں ہے۔ چیتل ورگ کے پالیگار نے سالانہ خراج دینے کے وعدے پر سلطان حیدر علی نے صلح کر لی ہے اور اب اس شہر میں امن اور سکون رہے گا۔ فی الحال میری زندگی میں ٹھہراؤ نہیں اگر کبھی زندگی کی اس دوڑ اور عمل کے اس طوفان میں کوئی وقفہ آیا تو میں اس حویلی میں قیام کرتے ہوئے فخر محسوس کروں گا۔"

سمیتا کوئی جواب نہ دے سکی تھی۔ اسمٰعیل اور شہباز تین گھوڑوں پر زینیں ڈال کر وہاں لے آئے۔ نصرالدین نے ایک الوداعی سی نگاہ سمیتا پر ڈالی پھر وہ ستیہ جیت، اسمٰعیل اور شہباز کے ساتھ وہاں سے کوچ کر گیا تھا۔ سمیتا صحرا میں بھٹکے ہوئے اس مسافر کی طرح کھڑی رہ گئی تھی جس کا کوئی راہبر کوئی مہربان نہ ہو۔

ستیہ جیت کو لے کر نصرالدین حیدر علی کے خیمے میں داخل ہوا۔ ہیبت جنگ اور ادھنی رام ابھی تک اس کے خیمے میں بیٹھے ہوئے تھے۔ نصرالدین نے ستیہ جیت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے حیدر علی سے کہا۔ "یہ ستیہ جیت ہے اس کا اور اس

کی بہن کا قیام چیتل ورگ میں اپنے ماموں کے ہاں ہے۔"

حیدر علی نے ہاتھ کے اشارے سے ایک نشست پر ستیہ جیت کو بیٹھنے کے لیے کہا اور وہ چپ چاپ وہاں بیٹھ گیا۔ نصرالدین اپنی اسی نشست پر بیٹھا تھا جہاں سے وہ اٹھ کر گیا تھا۔ حیدر علی نے پھر ستیہ جیت کو مخاطب کر کے کہا۔ "کیا بدنور کی موجودہ رانی سے تمہارا کوئی رشتہ ہے؟"

ستیہ جیت نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "اس سے میرا کوئی خاندانی ربط اور کوئی تعلق نہیں ہے۔" حیدر علی نے دوسرا سوال کیا۔ "بدنور پر حملہ کی صورت میں وہاں کے عوام کا کیا ردِ عمل کیا ہوگا؟"

ستیہ جیت نے بلا تامل کہا۔ "ظاہراً وہ رانی کا ساتھ دیں گے اس لیے کہ رانی کے مظالم کے سامنے کسی کو واضح سرکشی اور صریح بغاوت کی جرأت نہ ہوگی تاہم دلی طور پر اُن کی ہمدردیاں اگر آپ کے ساتھ نہیں تو وہ رانی کے مارے جانے یا اس کے تخت سے اتارے جانے کی دعا ضرور مانگ رہے ہوں گے۔"

حیدر علی نے پھر پوچھا۔ "نصرالدین مجھے بتا چکا ہے کہ رانی پر حملہ آور ہونے کی صورت میں ساوُنور کا افغان حکمران عبدالحکیم خان ہمارے خلاف رانی کی مدد کرے گا۔ تمہارے خیال کے مطابق قرب وجوار میں کوئی اور ایسا حکمران یا قوت بھی ہے جو جنگ کے دوران رانی کی مدد کو آئے؟"

ستیہ جیت نے سوچنے کے انداز میں تھوڑی دیر تک گردن جھکائے رکھی پھر اس نے اپنا چہرہ اوپر اٹھاتے ہوئے کہا۔ "ایک اور شخص بھی ہے جس سے امید کی جا سکتی ہے کہ وہ رانی کی بھرپور مدد کرے گا۔"

حیدر علی نے چونک کر پوچھا۔ "وہ کون ہے؟"

"وہ شمشیر بہادر کا بیٹا علی بہادر ہے۔ یہ کسی ملک کا حکمران تو نہیں بظاہر جاگیردار ہے لیکن اس کے پاس نوابوں اور راجاؤں جیسی قوت ہے۔"

حیدر علی نے حیرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ "میں نے اس شخص کے متعلق پہلی

بارسنا ہے ۔ یہ کون ہے ۔ اگر تمہیں معلوم ہو تو ذرا اس کا شجرہ نسب کہو۔"

ستیہ جیت نے اپنا گلہ صاف کرتے ہوئے کہا ۔" بیجاپور میں ایک خوبصورت، پُرکشش اور وجیہہ مسلمان رقاصہ مستانہ نامی تھی ۔ جب بیجاپور میں عادل حکومت کا خاتمہ ہو گیا تو اس رقاصہ کے ذرائع آمدنی بھی مفقود ہو گئے ۔ لہٰذا یہ گردش میں ٹھوکریں کھاتی ہوئی پونا شہر میں جا کر ٹھہر گئی ۔ بہت جلد شہر میں خوبصورتی، حسن و جمال، رقص و موسیقی اور آواز کے سحر کا چرچا اور شہرہ دور دور اطراف و اکناف میں پھیل گیا ۔ یہاں تک کہ بالاجی راؤ نانا جو اس وقت مرہٹوں کا تھا اس حسینہ کی زلفِ گرہ گیر کا اسیر ہو گیا ۔ ان دونوں کے تعلقات کے نتیجہ میں تولد ہوا ۔ رقاصہ نے اپنے لڑکے کو مسلمان بنا کر رکھا اور خود اس کی پرورش کی ۔

جب وہ لڑکا بڑا ہوا تو اس کے باپ بالاجی راؤ نانا نے اسے شمشیر بہادر کا خطاب دے کر بارہ ہزار سواروں کا منصب اور جاگیر عطا کی ۔ شمشیر بہادر رانی کی طرف داری کرتے ہوئے پانی پت کے میدان میں احمد شاہ ابدالی کے خلاف جنگ اور اس جنگ کے دوران وہ ایک ترک سپاہی کے ہاتھوں مارا گیا تھا ۔ یہ علی رانی کی مدد کرے گا اُسی شمشیر بہادر کا بیٹا ہے جس کا باپ بالاجی راؤ نانا اور مال مستانہ تھی ۔

جب ستیہ جیت خاموش ہوا تو حیدر علی نے دُکھ کا اظہار کرتے ہ

" اگر عبدالحکیم اور علی بہادر رانی کی مدد کو آئے تو کیسی بدقسمتی اور تاسف کی گی کہ دو مسلمان حاکم رانی کے مظالم کی حمایت میں ہمارے خلاف صف آرا

اودجی رام نے پہلی بار بولتے ہوئے حیدر علی سے کہا ۔" آپ فکرمند عبدالحکیم خان اور علی بہادر دونوں مل کر بھی رانی کو ہماری طرف سے نازل تباہی اور بربادی سے بچا نہ سکیں گے ۔"

اودجی رام کے خاموش ہونے پر ہیبت جنگ نے پوچھا ۔" ہم کب بدنور کی طرف کوچ کریں گے " ۔ حیدر علی نے اپنی جگہ پر کھڑے ہوتے ہوئے

کی تیاری کرو کل فجر کی نماز کے بعد ہم یہاں سے کوچ کر جائیں گے ۔"

نصرالدین، ہیبت جنگ، اودجی رام اور ستیہ جیت بھی کھڑے ہو گئے ۔ سب باہر نکلنے لگے تو ستیہ جیت نے التماس کرنے کے انداز میں کہا ۔

" سلطانِ محترم ! مجھے اجازت دیجیے کہ میں آپ کے لشکر میں ایک عام سپاہی کی حیثیت سے رہ کر رانی کے خلاف جنگ کروں ۔" حیدر علی نے مطمئن انداز میں کہا ۔" تمہیں اس کی اجازت ہے ۔ تم نصرالدین کے ساتھ رہو یہ تمہاری تنہا رہنمائی کرے گا ۔ جنگ کے دوران تم اسی کے لشکر میں رہو گے ۔" ستیہ جیت کے چہرے پر مسکراہٹ بکھر گئی تھی اور وہ نصرالدین کے ساتھ خیمے سے باہر نکل گیا تھا ۔

دوسرے روز فجر کی نماز کے بعد حیدر علی نے اپنے لشکر کے ساتھ چیتل درگ سے بدنور کی طرف کوچ کیا تھا ۔ حیدر علی نے بدنور تک کی مسافت نہایت تیزی اور رفتاری سے طے کی تھی ۔ یوں لگتا تھا نسل کے اس عرب جوانمرد کے سامنے ہند کی زمین نے سمٹنا اور سکڑنا سیکھ لیا تھا ۔

ابھی وہ بدنور سے دو منزل دور ہی تھا کہ اسمٰعیل نے وہاں آ کر خبر دی کہ رانی فکرمند ہے ۔ اس کا دن کا آرام اور رات کی نیند جاتی رہی ہے ۔ وہ مسلمانوں کی یلغار سے انتہائی فکرمند ہے ۔ اسمٰعیل نے یہ بھی خبر دی کہ رانی اپنے حسن و شباب کی فریب اور نذرانہ و تحائف کی پیش کش کر کے حیدر علی کے اس حملے کا رُخ موڑنے کی کوشش کرے گی ۔" اسمٰعیل یہ خبر دے کر چلا گیا جب کہ حیدر علی اپنے لشکر کے ساتھ آگے بڑھا اور چاروں طرف سے اس نے شہر کا گھیراؤ کر لیا تھا ۔

اسمٰعیل کی اطلاعات درست ثابت ہوئیں ۔ محاصرے کے دوسرے ہی روز حیدر علی نے اپنے لشکر کو چاروں طرف سے سمیٹ کر صرف ایک جگہ بھرپور حملہ کے لیے شہر کے مشرق میں جمع کر لیا تھا اور وہ شہر پر حملہ آور ہونے کی تیاری کر رہا تھا ۔ شہر کا مشرقی دروازہ کھلا اور اس میں سے چند سوار نکل کر اس سمت بڑھے ۔ سلطان نے اپنے لشکر کے ساتھ پڑاؤ کر رکھا تھا ۔ جس وقت یہ سوار شہر سے نکلے

تھے اس وقت حیدر علی، نصر الدین، ہیبت جنگ اور اودجی رام کے ساتھ اپنے خیمہ
باہر دھوپ میں کھڑا اُن سے گفتگو کر رہا تھا۔

وہ سوار قریب آکر رُک گئے۔ لشکر کے خیموں کے اندر سے گزرتے ہو
نے شاید حیدر علی کے متعلق پوچھ لیا تھا لہٰذا ان سواروں کے قائد نے حیدر علی کو ہ
کرتے ہوئے کہا۔

"ہم نگر (بدنور کا دوسرا نام) کی رانی کی طرف سے آپ کی جانب
بن کر آئے ہیں۔ اُمید ہے ہماری پیش کش کو قبول کر کے واپس لوٹ جائیں گے۔"

جس وقت یہ گفتگو ہو رہی تھی اس وقت رانی شہر کی فصیل کے اُوپر ایک
میں کھڑی یہ سارا منظر دیکھ رہی تھی وہ بلا کی حسین اور وجیہہ تھی اور اس وقت
لباس میں اپنے آپ کو وہ ہتھیاروں سے پوری طرح مسلح کئے ہوئے تھی۔

حیدر علی نے سفارت کے اس قائد سے کہا۔ "تمہاری رانی نے کیا
کی ہے۔" قائد نے کہا "نگر کی رانی آپ سے خواست گار ہے کہ وہ ہر سال خ
طور پر ایک لاکھ ہون، صندل کی لکڑی اور سیاہ مرچ سلطان کو ادا کیا کرے گی
کے علاوہ وہ زندگی بھر آپ کی مطیع و فرمانبردار بن کر رہے گی۔ اس صلہ میں و
توقع اور اُمید رکھتی ہے کہ آپ یہ علاقہ اپنی جانب سے اسے عطا کر دیں تا
کی حفاظت اور نگرانی میں دشمن کی یلغار اور حاسدوں کی ترکتاز سے بچی ر

حیدر علی نے تھوڑی دیر کی سوچ بچار کے بعد کہا۔ "تم رانی کے
جاؤ اور اُسے کہو اس کی بہتری اور بھلائی اسی میں ہے کہ وہ بغیر کسی خدشہ
کے میرے لشکر میں چلی آئے۔ ہم اسے اپنے مرکزی شہر سرنگاپٹن بھیج دیں گے
اپنے پورے اعزاز و اکرام کے ساتھ رہے گی اور اس کے سارے مصار
اخراجات پورے کیے جائیں گے۔ ہم دوبارہ اُسے یہ علاقہ دے کر اس کے
اضافہ نہیں کرنا چاہتے۔"

جب سفارت کاروں نے واپس جا کر رانی کو حیدر علی کا پیغام

پھر گئی۔ مکر و فریب کا چوغہ اس نے اُتار دیا اور حیدر علی کے خلاف اعلانِ جنگ
کر دیا۔ حیدر علی نے بھی شہر کے مشرق کی طرف سے بھرپور حملہ کیا تھا لیکن فصیل کے
اُوپر سے رانی نے اس قدر تیز اور سخت تیر اندازی کرائی تھی کہ حیدر علی کو اپنے لشکر کے
ساتھ پیچھے ہٹنا پڑا تھا۔

شام تک گھمسان کی تیر اندازی ہوتی رہی لیکن کوئی نتیجہ نہ نکلا حتیٰ کہ رات
چھا گئی اور جنگ موقوف ہو گئی۔ اسی رات اندھیرے کی اوٹ میں ساؤنور کے حاکم
عبدالحکیم خان کی طرف سے رانی کے لیے دو ہزار سوار اور چار ہزار پیادہ فوج پہنچ گئی۔
جس کی وجہ سے رانی کے لشکر کو خوب تقویت ملی تھی۔

اس کے علاوہ آنے والے اس لشکر نے رانی کو یہ اطلاع بھی دی تھی کہ ساؤنور
کا حکمران بالاندی کے اس پار ایک عظیم لشکر کے ساتھ خیمہ زن ہو چکا ہے اور ضرورت
پڑنے پر وہ فوراً رانی کی مدد کو پہنچ جائے گا۔ اس خبر سے رانی کے حوصلے مزید بلند ہو گئے
تھے تاہم علی بہادر کے متعلق ابھی کوئی خبر نہ تھی جس کے متعلق ستیہ جیت نے خدشہ ظاہر کیا
تھا کہ وہ عبدالحکیم خان کی طرح رانی کا مددگار بن کر آئے گا۔

اس پہلی رات جب کہ جنگ موقوف تھی اور حیدر علی کا لشکر دن بھر کی جنگ
کے بعد آرام کر رہا تھا عبدالحکیم خان نے بالاندی کو عبور کیا۔ گولی ورگ کے جنگلات
میں سے ہوتا ہوا وہ نگر کے پاس نمودار ہوا اور غفلت کی حالت میں حیدر علی کے لشکر
پر شب خون مارا۔ گو بہت جلد حیدر علی نے نصر الدین، ہیبت جنگ اور اودجی رام
کے ساتھ مل کر اپنے لشکر کو سنبھال لیا تھا پھر بھی رات کی تاریکی میں عبدالحکیم خان لشکر
کے ایک حصّے کو کاٹتا ہوا گولی ورگ کے جنگلات سے ہوتا ہوا بالاندی کے کنارے
جا ٹھہرا تھا۔

دوسرے روز پھر حیدر علی نگر (بدنور) پر حملہ آور ہوا۔ دوپہر کے قریب
عین اس وقت جب کہ حیدر علی نے فصیل کی طرف پیش قدمی شروع کی تھی دو لشکروں
نے اچانک اس کی پشت پر حملہ کر دیا۔ ایک لشکر تو عبدالحکیم خان کا تھا اور دوسرا

علی بہادر کا لشکر تھا جس کے متعلق اُمید کی جاتی تھی کہ وہ رانی کی مدد کو آئے گا۔

علی بہادر پچھلی رات ہی وہاں پہنچا تھا اور اس کی آمد سے رانی اور عبدالحکیم کے لشکروں کو خوب تقویت ملی تھی۔

جب حیدر علی نے پُشت پر حملہ کرنے والوں سے نمٹنا چاہا تو رانی نے قلعے سے باہر نکل کر اس پر حملہ کر دیا تھا۔ اس طرح حیدر علی اپنے لشکر کے ساتھ دو طرفہ گھیراؤ میں آ گیا تھا لیکن اس نے جی نہ چھوڑا۔ لشکر کو اس نے فوراً دو حصّوں میں تقسیم کر دیا۔ خود او جنی رام کے ساتھ لشکر کے ایک حصّے کے ساتھ وہ رانی کے لشکر پر پلٹ کر حملہ آور ہوا اور یہ ایسا سخت حملہ تھا کہ رانی کا لشکر دوبارہ اُلٹے قدموں پسپا ہو کر قلعہ بند ہو کر لڑنے پر مجبور ہو گیا جب کہ لشکر کے دُوسرے حصّے کو لے کر نصر الدین اور ہیبت جنگ عبدالحکیم خان اور علی بہادر کے لشکروں پر ٹوٹ پڑے تھے اور انہیں اپنے آگے آگے بھگاتے ہوئے وہ گولی درگ کے جنگل تک لے گئے تھے۔

جب وہ دونوں تعاقب کرتے ہوئے جنگل کے اندر داخل ہونے لگے تو وہاں نصر الدین سے شہباز نے آ کر ملاقات کی اور نصر الدین کو متنبہ کیا کہ جنگل میں داخل نہ ہو کیونکہ عبدالحکیم خان نے گھنے جنگل میں درختوں پر ماہر تیر انداز بٹھا رکھے تھے، جو اس کے لشکر کو نقصان پہنچا سکتے تھے۔

ناچار نصر الدین، ہیبت جنگ کے ساتھ لشکر کو لے کر واپس لوٹ گیا۔

عبدالحکیم خان اور علی بہادر جنگل میں داخل ہو کر اپنے آپ کو محفوظ کر گئے تھے۔ اب یہ ایک معمول بن گیا تھا کہ جب بھی حیدر علی بدنور پر حملہ آور ہوتا عبدالحکیم اور علی اس کی پشت سے حملہ کر کے اس کی قوت کو دو حصّوں میں بانٹ کر کمزور کر دیتے اور حیدر علی بدنور کو فتح کرنے میں کامیاب نہ ہوا۔ یہاں تک کہ یہ محاصرہ کیے کئی ماہ گزر گئے تھے۔

محاصرہ طول پکڑتا گیا یہاں تک کہ بارش کا موسم آ گیا۔ حیدر علی فکر مند ہو گیا کیونکہ برسات کا موسم اس کے لیے مصائب کا پیش خیمہ بن سکتا تھا لہٰذا وہ ان

مصائب کا سامنا کرنے سے قبل ہی اس مہم سے فارغ ہو جانا چاہتا تھا۔

اس مقصد کے لیے حیدر علی نے اپنے جرنیلوں کے ساتھ اپنے خیمے میں مجلسِ مشاورت طلب کی۔ عشاء کے بعد نصر الدین، ہیبت جنگ اور او جنی رام اس کے خیمے میں آئے اور گردنیں جھکا کر بیٹھ گئے۔ وہ چاندرات تھی۔ آدھا لشکر جاگ کر پہرہ دے رہا تھا اور آدھا سو رہا تھا۔

عبدالحکیم خان اور علی بہادر کے شب خون سے بچنے کی خاطر کچھ دستے اطراف و اکناف میں دُور دُور تک پھیلا دیئے گئے تھے۔ خیمے سے باہر مسلح سپاہی تلواریں سونتے ٹہل رہے تھے۔ اندھی ہوا خیموں کے شہر میں سرسراتی پھر رہی تھی اور آسمان سے غول در غول اترتی چاندنی نے رات کے فرش پر کرنوں کا بچھونا سا بچھا دیا تھا۔ بدنور کے آسمان پر راتوں کا رازدار چاند زمین پر ہونے والے انسانی اعمال پر مسکرا رہا تھا۔

نصر الدین، ہیبت جنگ اور او جنی رام خیمے کے اندر چپ اور گردنیں جھکائے بیٹھے تھے۔ حیدر علی نے بھی چند لمحوں تک خاموشی سادھے رکھی اور وہ بڑے غور سے ان تینوں کو دیکھتا رہا پھر اس نے استفہامیہ سے انداز میں گہری، گھمبیر آواز میں کہا۔ "کیا تمہاری خاموشی اور جھکی ہوئی گردنوں سے میں یہ اندازہ لگا لوں کہ بدنور کی رانی ناقابلِ تسخیر ہے اور یہ کہ ہم نے اس پر حملہ کر کے غلطی کی ہے۔"

ہیبت جنگ نے اپنی گردن آہستہ آہستہ اُوپر اُٹھاتے ہوئے کہا۔ "ہم دو دشمنوں کے درمیان گھرے ہوئے ہیں ایک ہم پر شب خون اور چھاپہ مار کر گولی درگ کے جنگلوں میں جا گھستا ہے اور دوسرا ہمارا نقصان کر کے قلعے میں داخل ہو جاتا ہے۔ ایسی صورت میں ہمیں اپنی جنگی حکمت عملی کو بدلنا ہو گا۔"

ہیبت جنگ کے خاموش ہونے پر او جنی رام نے کہا۔ "ہمیں دونوں میں سے ایک کام کرنا چاہیے۔ یا تو ہمیں دونوں دشمنوں کو ایک جگہ جمع کرنا چاہیے اگر ہم ایسا نہیں کر سکتے تو پھر ایک ایک کر کے ان سے نمٹنا چاہیے۔ ایسی صورت

میں دشمن ہمارے سپاہیوں سے زیادہ دیر تک نہ ٹھہر سکیں گے۔ نصرالدین کی گردن ابھی تک جھکی ہوئی تھی۔ حیدر علی نے کچھ سوچا پھر اسے مخاطب کر کے کہا۔

"نصرالدین! نصرالدین! تم اس قدر خاموش کیوں ہو ہم نے کوئی زیادتی اور حمیت تو ابھی تک دشمن سے نہیں اٹھائی پھر تم نے ایسی چپ کیوں سادھ لی ہے۔ کہو تم کیا کہتے ہو۔" نصرالدین نے آہستہ آہستہ اپنی گردن اوپر اٹھاتے ہوئے کہا۔ ہمارے لیے یہی سب سے بڑی عار ہے کہ ہم ابھی تک رانی پر قابو نہیں پا سکے۔ ہیبت جنگ کا یہ کہنا کہ ہمیں اپنی جنگی ترتیب کو بدلنا چاہیے درست ہے۔ اودجی رام کا یہ مشورہ کہ دو جگہ پھیلے دشمن کو ہمیں یک جا کرنا چاہیے بالکل صحیح اور راست ہے۔ آپ مجھے میرا لشکر دے کر علیحدہ کر دیجیے۔ میں آج رات ہی یہاں سے کوچ کر کے گولی درگ کے جنگل کی طرف نکل جاؤں گا۔

جس راستے سے عبدالحکیم خان اور علی بہادر اپنے متحدہ لشکر کو لے کر جنگل سے نکلتے ہیں اس راستے کے دونوں جانب دور تک سرکنڈے کا گھنا سا جنگل پھیلا ہوا ہے۔ میں اپنے لشکر کے ساتھ ان سرکنڈوں کے اندر گھات میں بیٹھ جاؤں گا۔ کل صبح آپ ہیبت جنگ اور اودجی رام کے ساتھ مل کر پوری قوت سے شہر پر حملہ کریں۔ عبدالحکیم اور علی بہادر جب رانی کی مدد کو آئیں گے تو میں انہیں کسی رکاوٹ کے بغیر گزر جانے دوں گا اور ان کی غیر موجودگی میں جنگل کے اندر گھس کر پہلے میں ان تیر اندازوں کا صفایا کروں گا جو جنگل میں داخل ہونے والے راستے کے دونوں جانب درختوں پر بیٹھ کر پہرہ دیتے ہیں۔

حیدر علی نے فکرمندی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ لیکن یہ مقابلہ دشوار ہوگا درختوں پر بیٹھے تیر انداز تمہارے لشکر کے لیے خطرناک ثابت ہوں گے۔ اس لیے کہ ——— نصرالدین نے درمیان میں بولتے ہوئے کہا۔

"آپ بے فکر رہیں وہ چاروں پہر درختوں پر تو نہ بیٹھے رہیں گے۔ کل دوپہر کا کھانا کھانے کے لیے جب وہ نیچے اتریں گے تو میں ان کا صفایا کر دوں گا۔ شہباز

مجھے ان کی ایک ایک حرکت سے آگاہ کرتا رہے گا۔ ان تیر اندازوں کا صفایا کرنے کے بعد میں دوبارہ اس میدان جنگ کی طرف لوٹوں گا اور آپ سے جنگ میں مصروف عبدالحکیم خان اور علی بہادر کے لشکروں کی پشت سے حملہ آور ہو جاؤں گا۔ اگر وہ دونوں میدان جنگ سے منہ موڑ کر بھاگ نکلیں تو میں اور ہیبت جنگ دور تک ان کا تعاقب کر کے ان کی قوت کو کچل دیں گے۔ اس دوران آپ اودجی رام کے ساتھ مل کر شہر پر حملے جاری رکھیں۔ اگر ہم عبدالحکیم اور علی بہادر کی جنگی قوت کو ختم نہیں کم کر کے بھی یہاں سے بھگا دیں تو پھر اس کی رانی سے بدنور چھیننا ہمارے لیے کوئی بڑا مرحلہ نہ رہے گا۔

حیدر علی نے خوشی اور اطمینان کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ تمہاری یہ تجویز نہایت مناسب ہے اور مجھے منظور ہے تم ابھی یہاں سے کوچ کر کے اپنی کمین گاہ میں چلے جاؤ۔ عبدالحکیم اور علی بہادر سے نمٹنے کے بعد میں بدنور کے لشکر کو عبرت خیز سبق دوں گا۔ نصرالدین، ہیبت جنگ اور اودجی رام کھڑے ہو گئے اور خیمے سے باہر نکل گئے۔

نصرالدین نے اپنے لشکر میں آ کر کوچ کا حکم دے دیا تھا اور اس کے حصے کا لشکر بڑی تیزی سے اپنی کچی نیند کو خیرباد کہہ کر کوچ کی تیاری کرنے لگا تھا۔ نصرالدین جب اپنے خیمے میں آیا تو اندر ستیہ جیت اپنے آپ کو مسلح کرنے کے بعد اس کا انتظار کر رہا تھا۔ نصرالدین کو دیکھتے ہی اس نے پوچھا۔ "رات کے اس وقت آپ کہاں کوچ کر رہے ہیں۔"

نصرالدین نے مسکرا کر اس کا شانہ تھپتھپاتے ہوئے کہا۔ بس تم دیکھتے جاؤ بنتا کیا ہے۔ آنے والا دن انشاء اللہ عبدالحکیم خان اور علی بہادر کے لیے حشر کا اور قیامت کا دن ہوگا۔"

ستیہ جیت نے متاثر کن لہجے میں کہا۔ "آپ کے لشکر میں رنگ و نسل کی رنگا رنگی کے باوجود ایک قابلِ رشک اتفاق و اتحاد اور ایک نقطگی دیکھ کر میں

بہت متاثر ہُوا ہوں۔ اس لشکر میں کوئی مالباری، کوئی ارکاٹ اور بیجاپور کا ہے، کوئی ترک ہے اور کسی کا تعلق دہلی اور پنجاب سے ہے اس کے باوجود کوئی انفرادیت نہیں کوئی رنگی تفاوت اور نسلی تفاخر نہیں ہے"۔

نصرالدین نے مسکراتے ہوئے کہا "تمہارا اندازہ درست ہے ہمارے مذہب میں اجتماعیت کی بنیاد رنگ و فام اور نسل و اصل پر نہیں ہے۔ زبان بھی ہمارے ہاں ثانوی حیثیت رکھتی ہے۔ ہماری اصل بنیاد ہمارا مذہب ہے اور اس مذہب کے وحدانیت، رسالت، اخوت اور مساوات کے ستونوں پر ہماری اجتماعی زندگی کی عمارت کھڑی ہے۔ ہمارا مقصد اجتماع نوعی نہیں بلکہ اجتماع ارادی ہے"۔

ستیہ جیت نے پھر بولتے ہوئے پوچھا "آپ کے متعلق تو مجھے علم ہے کہ آپ ترک ہیں لیکن آپ کے لشکر میں رہتے ہوئے سپاہیوں سے مجھے یہ بھی پتہ چلا ہے کہ سلطان حیدر علی عرب ہے"۔

نصرالدین نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا "تم نے ٹھیک ہی سُنا ہے حیدر علی کے جدِ امجد کا تعلق قریش سے ہے۔ ان کا نام فتح محمد تھا وہ مکہ کے رہنے والے تھے وہاں سے بغداد پہنچے پھر حالات کے حوادث اور ایام کی گردشوں میں ٹھوکریں کھاتے ہوئے پنجاب میں آ کر آباد ہوئے۔ پنجاب سے نکل کر دہلی ہوتے ہوئے انہوں نے اس دور کی دکن میں مضبوط اسلامی ریاست کے شہر گلبرگہ میں قیام کیا۔ گلبرگہ کے لوگوں نے آپ کے علم اور اخلاق سے متاثر ہو کر آپ کو ہاتھوں ہاتھ لیا اور اسی شہر میں ان کی نسل بڑھی اور پھیلی"۔

ستیہ جیت نے بڑے شوق سے کہا "مجھے عربوں سے محبت ہے۔ مَیں لفظ عرب میں ہی بڑی لذت اور دِل کشی محسوس کرتا ہوں کیا سلطان کا کوئی بیٹا بھی ہے"۔

نصرالدین نے پیار سے ستیہ جیت کا شانہ دباتے ہوئے کہا سلطان کا ایک لڑکا ہے اس کا نام فتح علی ہے لیکن ٹیپو کے نام سے مشہور ہے۔ ابھی چھوٹا ہے۔

بمشکل نو دس برس کا ہوگا۔ بڑا جاندار اور مضبوط اعضاء کا لڑکا ہے۔ مجھ سے خاصا مانوس ہے کہ میرا ایوان کے اندر تک آنا جانا ہے۔ کیونکہ ٹیپو کی ماں اور حیدر علی کی بیوی فاطمہ یہاں ہند میں گرم کنڈہ کے مقام پر آباد ایک ترک قبیلے سے تعلق رکھتی ہے اور مَیں خود بھی اسی ترک قبیلے سے ہوں لہذا باہم رشتہ داری ہے لیکن ستیہ جیت یہاں باتوں میں اُلجھ اُلجھ کر ہم وقت ضائع کر رہے ہیں۔ لشکر تیار ہو کر ہمارا انتظار کر رہا ہوگا"۔ ستیہ جیت خاموش رہا۔ دونوں خیمے سے باہر نکلے اور پھر اپنے لشکر کے ساتھ وہ گولی درگ کے جنگل کی طرف کوچ کر گئے تھے۔

دوسرے روز صبح ہی صبح فجر کی نماز سے فارغ ہونے کے بعد حیدر علی نے ہیبت جنگ اور ادجی رام کے ساتھ مل کر شہر پر زبردست حملے شروع کر دیئے تھے۔ وہ لگاتار پتھر برسا کر ایک مخصوص جگہ سے شہر کی فصیل کو توڑنے کی کوشش بھی کرنے لگا تھا۔ عبدالحکیم خان اور علی بہادر حسبِ معمول گولی درگ کے جنگل سے نکل کر رانی کی مدد کرنے اور حیدر علی کے لشکر پر حملہ آور ہونے کے لیے شمال مشرق کی طرف بڑھ گئے تھے۔ سرکنڈوں کے جنگل میں گھات میں بیٹھا ہُوا نصرالدین انہیں اپنے پاس سے گزرتے ہوئے خاموشی اور سکون سے دیکھتا رہا۔ کیونکہ یہ سارا عمل اس کی مرضی اور خواہش کے مطابق ہو رہا تھا۔ نصرالدین کافی دیر تک اسی طرح کمین گاہ میں بیٹھا رہا۔ دوپہر کے قریب سرکنڈوں کے اس جنگل میں شہباز نمودار ہُوا اور اس نے نصرالدین کو اطلاع کی کہ درختوں پر بیٹھنے والے عبدالحکیم خان کے تیر انداز نیچے اُتر کر دوپہر کا کھانا کھانے کی تیاری کر رہے ہیں۔

شہباز کی اس اطلاع پر نصرالدین دُم کٹے سانپ کی طرح بل کھا کر کھڑا ہو گیا۔ اس کے لبوں پر تبسم اور نگاہوں میں طوفان اُمڈ آئے تھے۔ اس نے تمش ریز لہجے اور شرر خیز آواز میں بھنا کر کہا "مَیں اپنے رب کی قضا بن کر اس جنگل میں داخل ہوں گا اور عبدالحکیم کے سارے پُراسرار رنگوں اور بے نام خوابوں کو بکھیر

دوں گا۔ نصرالدین حرکت میں آیا۔ لشکر اس نے ایک جگہ جمع کیا پھر شہباز کی راہنمائی میں وہ گولی درگ کے جنگل میں ایسی تیزی اور طوفانی انداز سے داخل ہوا تھا جیسے بپھرے لومڑیوں کے بھٹ میں، شیر ہرنوں کی آماجگاہ میں اور شاہین شکاری پرندوں کے گھونسلوں میں گھستے ہیں۔

عبدالحکیم خان کے تیرانداز کھانا کھا رہے تھے کہ نصرالدین اپنی حیات بخش آواز میں اللہ اکبر کی صدائیں بلند کرتا ہوا اپنے لشکر کے ساتھ موت کی آشتہا اور بیابان کے وحشیوں کی طرح ان پر ٹوٹ پڑا تھا۔ کھانا کھاتے تیراندازوں نے سنبھل کر مقابلہ کرنے کی کوشش کی لیکن نصرالدین بے روک آندھی اور بے تحاشا طوفان کی طرح ان کے اندر تک گھستا چلا گیا تھا۔ وہ ان پر کالی آندھی، سرخ شعلوں کے رقص اور تباہی کی آگ اور مایوسی کا اندھیرا بن کر چھا گیا تھا۔

عبدالحکیم کے تیراندازوں نے جب دیکھا کہ وہ قعرِ گمنامی سے نکلنے والے آسیب اور خبیث روحوں کی طرح جنگل میں گھس آنے والے حملہ آوروں کا مقابلہ نہیں کر سکتے تو وہ اپنی جانیں بچانے کے لیے مغرب کی طرف بالاندی کی طرف بھاگ کھڑے ہوئے تھے۔

لیکن اس شیرولِ ترک نصرالدین سے بھاگنا آسان نہ تھا۔ وہ پرانے جنگل میں اللہ اکبر کی صداؤں کا جشن شور کھڑا کرتا فنا کی انگلیوں، موت کے نادیدہ ناشنیدہ ہاتھوں اور سنسناتے تیروں کی طرح ان کا تعاقب کرنے لگا تھا۔ سہمی سہمی فضاؤں میں عبدالحکیم خان کے تیرانداز بھیڑوں کے گلے اور متوحش جنگلی ہرنوں کی طرح بھاگتے پھرتے تھے اور نصرالدین سوختہ جان موت اور تقدیر کا نوشتہ بن کر ان کا تقلِ عام کرتا رہا۔ یہاں تک کہ گولی درگ کے جنگل میں اس نے ایک ایک تیرانداز کو موت کے گھاٹ اُتار کر جنگل کو اُن کی بدامنی اور خوف سے صاف کر دیا تھا۔

جنگل کے اندر نصرالدین نے عبدالحکیم کے پڑاؤ کو لوٹنے کی بجائے اسی طرح پڑا رہنے دیا۔ اپنے لشکر کے ساتھ وہ جنگل سے نکلا اور شرار و برق کی سی تیزی کے

ساتھ وہ بدنور کی طرف بڑھا تھا۔ جب وہ شہر سے قریب ہوا تو اس نے دیکھا وہاں جنگ عروج پر تھی۔ حیدر علی اور اوجی رام رانی کے لشکر پر حملہ آور ہو رہے تھے جب کہ ہیبت جنگ نے عبدالحکیم خان اور علی بہادر کو بڑی جرأت مندی اور دلیری کے ساتھ حیدر علی اور اوجی رام کی پشت پر حملہ کرنے سے روک رکھا تھا۔

نصرالدین شرار و برق کی سی تیزی اور ہمہ سوز سموم کی سرعت کے ساتھ عبدالحکیم اور علی بہادر کے متحدہ لشکر کی پشت پر آیا اور ان کے سر پر وہ بجلیوں کا گہوارہ اور موت بن کر کھیل گیا تھا۔ نصرالدین کو حملہ کرتے دیکھ کر ہیبت جنگ نے بھی اپنے حملوں میں سختی پیدا کر لی اس طرح دو طرفہ حملوں میں عبدالحکیم اور علی بہادر کے لشکر کی حالت ایسی ہو گئی تھی جیسے خوابوں کے دہکتے مناظر کی کوکھ میں کسی نے بھڑکتی ہوئی آگ بھر دی ہو۔ ان کا لشکر زیادہ دیر تک اس دو طرفہ ضربوں کو برداشت نہ کر سکا اور تار تار دامن کی طرح آہستہ آہستہ بکھرنے اور ٹوٹنے لگا تھا۔

ان دونوں نے جب دیکھا کہ ان کے لشکر کی صفیں بکھرنے اور جنگی تنظیم ٹوٹنا شروع ہو گئی ہے تو انہوں نے پسپائی کے نقارے بجا دیئے اور اپنے لشکر کو لے کر گولی درگ کے جنگل کی طرف جانے والی شاہراہ پر بھاگ کھڑے ہوئے تھے۔ نصرالدین اور ہیبت جنگ قہر کا طوفان بن کر اُن کا تعاقب کر رہے تھے۔ عبدالحکیم اور علی بہادر کو اُمید تھی کہ گولی درگ کے جنگل میں پہنچ کر محفوظ ہو جائیں گے لیکن جنگل میں پہنچ کر جب انہوں نے اپنے پڑاؤ کو اُجڑا ہوا اور پھر جب انہوں نے اِدھر اُدھر بکھری ہوئی اپنے ساتھیوں کی لاشیں دیکھیں تو وہ حواس باختہ ہو گئے۔ انہیں اُمید تک نہ تھی کہ جنگل میں ان کے پڑاؤ کو کوئی اس طرح تباہ و ویران بھی کر سکتا ہے۔

چونکہ نصرالدین اور ہیبت جنگ اُن کے پیچھے پیچھے یلغار اور ترکتاز کرتے ان کے لشکر کو مارتے کاٹتے آ رہے تھے لہٰذا انہوں نے وہاں رُکنا مناسب نہ سمجھا اور مغرب کی طرف بھاگے۔ بدحواسی میں اُنہوں نے بالاندی کو پار کیا اور اس پار کے جنگلوں

میں گھس کر روپوش ہوگئے۔

یہ ایک عبرت خیز شکست تھی جس کا سامنا عبدالحکیم خان اور علی بہادر نے کیا تھا۔ ان کے لشکر کی تعداد کٹ کر کافی کم ہوگئی تھی اور وہ دونوں بالاندی کو پار کر کے اپنے اپنے علاقوں کو اس غرض سے چلے گئے تھے کہ اپنے مرکز سے کمک و رسد حاصل کر کے وہ دوبارہ آئیں اور حیدر علی سے جنگ کریں لگتا تھا انہوں نے بدنور کی رانی کو حیدر علی کے ہاتھوں بچانے کا تہیہ کر رکھا ہے۔

نصرالدین اور ہیبت جنگ نے عبدالحکیم اور علی بہادر کے پڑاؤ پر قبضہ کر لیا۔ انہوں نے وہاں سے خیمے اور اُن کے اندر اور باہر پڑی ہر چیز کو سمیٹا اور بڑی تیزی کے ساتھ انہوں نے بدنور کی طرف کوچ کیا تھا۔ جب وہ نزدیک پہنچے تو انہوں نے دیکھا رانی کا لشکر حیدر علی اور اودجی رام کے ساتھ قلعہ بند ہو کر لڑ رہا تھا۔ انہوں نے جنگل سے ہاتھ لگنے والا سارا سامان اپنے پڑاؤ میں رکھا اور جنگ میں شریک ہوگئے۔ ان کی آمد سے لڑائی کا میدان بُری طرح بھڑک اٹھا تھا اور جنگ زور اختیار کر گئی تھی۔

نصرالدین اور ہیبت جنگ کی آمد سے دشمن بہت زیادہ مصروف ہوگیا تھا اور رانی کے لشکری افراتفری کے عالم میں فصیل پر اِدھر اُدھر بھاگتے پھرتے تھے انہیں خدشہ ہو گیا تھا کہ گھمسان کی اس جنگ میں کہیں دشمن کمندوں کے ذریعے فصیل پر چڑھ کر کسی بُرج پر قبضہ نہ کر لے۔ دشمن کی اس مصروفیت سے حیدر علی نے فائدہ اُٹھایا۔ نصرالدین، ہیبت جنگ اور اودجی رام کو اس نے دُشمن کے ساتھ جنگ میں ہی مصروف رہنے دیا۔ خود اُس نے اس کمزور حصّے پر سنگ باری کرا دی تھی جہاں وہ پہلے بھی پتھر برسا کر فصیل کے اس حصّے کو گرانے کی کوشش کرتا رہا تھا۔

رانی کا لشکر خاطر خواہ طور پر حیدر علی کے اس پتھراؤ کو روک نہ سکا۔ حالانکہ حیدر علی کا وہ لشکر جو فصیل پر پتھر برسا رہا تھا ان کے تیروں کی زد میں تھا لیکن جب وہ حیدر علی پر دباؤ ڈالنے کے لیے اس کی طرف بڑھتے تھے تو نصرالدین ہیبت جنگ

اور اودجی رام کمندوں اور رسّوں کی سیڑھیوں کی مدد سے فصیل پر چڑھنے کی کوشش کرتے تھے اور یہ صورتِ حال اُن کے لیے حیدر علی کے پتھراؤ سے کہیں زیادہ خطرناک اور تکلیف دہ تھی۔ لہٰذا اُنہوں نے حیدر علی کے پتھراؤ کو نظر انداز کر کے فصیل کو اس کے حال پر چھوڑ دیا اور حیدر علی کے جرنیلوں کو وہ زیادہ سے زیادہ جنگ میں مصروف اور اُلجھائے رکھنے کی کوشش کرنے لگے تھے۔

فصیل کے جس حصّہ پر حیدر علی پتھراؤ کر رہا تھا اس کی حفاظت کے لیے رانی نے عبدالحکیم خان کے ان دو ہزار سواروں اور چار ہزار پیادوں کو لگا دیا تھا جو اس کی مدد کے لیے ایک روز رات کی تاریکی میں شہر کے اندر داخل ہوگئے تھے۔

جب سورج غروب ہوگیا اور چاروں طرف گہرا اندھیرا پھیل گیا تو حیدر علی فصیل کا ایک حصّہ گرانے میں کامیاب ہوگیا۔ فصیل کے گرتے ہی نصرالدین، ہیبت جنگ اور اودجی رام بھی اس طرف لپکے تھے اور حیدر علی اپنے پورے لشکر کے ساتھ سیلابی پانی کی طرح شہر میں داخل ہوا تھا۔ رانی عبدالحکیم خان کے چھ ہزار کے لشکر کو حیدر علی کے رحم و کرم پر چھوڑ کر اندھیرے کی آڑ میں شہر کے دوسرے دروازے سے اپنے لشکر کو لے کر بھاگ گئی اور گولی درگ کے جنگل میں قیدیوں کے رکھنے کے لیے اس نے جو مضبوط قلعہ بنا رکھا تھا اور جس کے اندر اس کا شیشے کا ایک عشرت کدہ بھی تھا اس قلعے میں جا کر رانی محصور ہوگئی اور دوبارہ جنگ کی تیاری کرنے لگی۔ جاتے جاتے اس نے اس محل کو آگ لگا دی۔

یہ محل اس کے مرحوم شوہر شوم شکر نے طلا کار چینی کی اینٹوں سے بنوایا تھا۔ اس کے جوڑوں میں بھی سونا بھرا گیا تھا اور در و دیوار پر جواہرات جڑے گئے تھے۔ رانی نے ڈھیروں موتی اور جواہرات بھی آگ میں پھینکوا دیئے۔ حیدر علی نے آن کی آن میں شہر کے تمام مسلح لوگوں کو جنہوں نے مزاحمت کی تھی تہ تیغ کر کے شہر پر قبضہ کر لیا۔

جس وقت حیدر علی، نصرالدین، ہیبت جنگ اور اودجی رام کے ساتھ اپنے لشکر کے قیام اور شہر کے انتظام میں مصروف تھا نصرالدین کے لشکر کا ایک سپاہی

بھاگتا ہوا آیا اور نصرالدین سے اس نے بدحواسی میں کہا۔ "ستیہ جیت بُری طرح زخم
ہے اس کی سانس اکھڑ رہی ہے اور وہ آپ کو بُلا رہا ہے"۔ نصرالدین اس سپاہی
ساتھ بھاگ کھڑا ہوا۔

حیدرعلی ہیبت جنگ اور اودجنی رام بھی اس کے پیچھے پیچھے بھاگے تھوڑ
ہی فاصلے پر ایک جگہ کافی سپاہی جمع تھے۔ نصرالدین کو آتے دیکھ کر وہ اِدھر اُدھر
گئے۔ نصرالدین نے دیکھا ستیہ جیت چند اور زخمی سپاہیوں کے ساتھ خون میں لت پ
پڑا تھا اور کچھ سپاہی ان کی مرہم پٹی کر رہے تھے۔ اتنی دیر تک حیدرعلی، ہیبت جن
اور اودجنی رام بھی وہاں پہنچ گئے۔

نصرالدین وہاں بیٹھ گیا اور اس کا سَر اپنی گود میں لیتے ہوئے اُسے پکا
"ستیہ جیت! ستیہ جیت!" ——— ستیہ جیت نے بڑی مشکل سے اپنی بند آنکھ
کھولیں اور کپکپاتی آواز میں اس نے نصرالدین سے کہا۔

"اے میرے امیر! میرے بعد میری بہن اکیلی رہ جائے گی اس کا خیال ر
اگر آپ اس سے شادی نہ کرنا چاہیں تو بھی اسے اپنے گھر لے جائیں۔ وہ آپ کی ا
بن کر بھی آپ کی نابینا ماں کی خدمت کرتے ہوئے فخر محسوس کرے گی اس لیے ک
جانتا ہوں وہ آپ سے ———"

ستیہ جیت اس سے آگے کچھ نہ کہہ سکا۔ وہ موت کو اپنی سانسوں کی آ
قسط پیش کر چکا تھا۔ اس کی گردن ایک طرف ڈھلک گئی۔ نصرالدین نے ا
نبض پر ہاتھ رکھا وہ مر چکا تھا۔ پرنم آنکھوں کے ساتھ نصرالدین نے اس کی
بند کر دیں اور اس کے قریب کھڑے حیدرعلی، ہیبت جنگ اور اودجنی رام کی گر
جھک گئی تھیں۔

شام سے پہلے ہی ہندوانہ رسوم کے مطابق ستیہ جیت کا کریاکرم کر دیا گیا تھا۔ سمیتا کو اس کے بھائی کی مرگ کی اطلاع کرنے کے لیے نصرالدین نے اسمٰعیل کو چیتل درگ کی طرف روانہ کر دیا تھا۔ اودجنی رام کو اس کے لشکر کے ساتھ حیدرعلی نے بدنور کی حفاظت کے لیے چھوڑا۔ نصرالدین اور ہیبت جنگ کے ساتھ باقی لشکر کو لے کر وہ نکلا اور گولی درگ کے جنگل میں اس قلعہ کا محاصرہ کر لیا تھا جس کے اندر رانی اپنے لشکر کے ساتھ محصور ہو گئی تھی۔

یہ قلعہ چونکہ پہاڑ کی چوٹی پر واقع تھا لہٰذا فی الفور فتح نہ ہو سکا۔ رانی کے لشکر کو یہ فائدہ تھا کہ وہ پتھروں کی اوٹ میں ہو کر میدان اور ڈھلان پر پھیلے ہوئے حیدرعلی کے لشکر کو نقصان پہنچا سکتے تھے۔ حیدرعلی دشمن کی اس فوقیت سے آگاہ تھا۔ اس نے چاروں طرف سے قلعہ کا ایسا سخت محاصرہ کر لیا کہ باہر سے رانی کی کمک اور خوراک کا سلسلہ اس نے منقطع کر دیا تھا۔ عبدالحکیم خان اور علی بہادر کے اچانک حملوں کا مقابلہ کرنے کے لیے اس نے نصرالدین اور ہیبت جنگ کو مستعد کر رکھا تھا۔

رانی کے اس نئے قلعے کا محاصرہ ابھی جاری تھا کہ حیدرعلی کے جاسوس یہ خبریں لائے کہ عبدالحکیم ایک جرار لشکر کو لے کر دوبارہ اپنے مرکزی شہر ساوُنور سے نکل کھڑا ہوا ہے۔ یہ یہ بھی اطلاع آئی کہ علی بہادر رانی کی حمایت میں اس غرض سے پونا کی طرف چلا گیا ہے کہ وہ وہاں مرہٹوں کے پیشوا سوامی مادھو راؤ سے مدد کی درخواست کرے۔ مرہٹہ بلا کی لڑاکا قوم تھی۔

اپنی اصل نسل کے اعتبار سے مرہٹے شمال سے آنے والے آرین اور قدیم قوموں دراوڑ، بھیل، کول اور راموشی کی مشترکہ نسل تھے۔ ان کی زبان مرہٹی تھی۔

دریائے گوداوری اور دریائے کرشنا کے درمیان تکون شکل کا مہاراشٹر ان کے قبضے میں تھا ۔ تانگن گھاٹ ، ناگپور ، الناولیش اور سہاردی شہروں کے علاوہ ورنز پڑا کا کوہستانی سلسلہ اور گوداوری کی وسیع وادیوں پر ان کی عظیم اور مضبوط سلطنت پھیلی ہوئی تھی ۔

یہ اطلاعات حیدر علی کے لیے تشویشناک تھیں ۔ ایک رات اس نے نصر الدین اور ہیبت جنگ کے ساتھ مل کر اندھیرے کی آڑ میں اس برق رفتاری سے قیامت خیز حملہ کیا کہ قلعہ سے باہر پتھروں کی اوٹ میں رہ کر تیر برسانے والے رانی کے تیر اندازوں کو اس نے تہ تیغ کر دیا اور قلعے کا دروازہ توڑ کر وہ اندر گھس گیا ۔ رانی کی ساری سپاہ کو کاٹ کر رانی کو زندہ گرفتار کر لیا گیا تھا ۔ عبدالحکیم خان کے کسی اچانک حملہ کے نظر حیدر علی فوراً اپنے لشکر کے ساتھ بدنور شہر میں واپس آیا ۔ اسی دوران عبدالحکیم خان رانی کی شکست اور اس کی گرفتاری کا سن کر بالاندی کو پار کر کے کھلے میدانوں میں زن ہو گیا تھا ۔

حیدر علی جب بدنور میں داخل ہوا تو اس نے دیکھا اوجنی رام نے شاہی اور شاہی محلات سے حاصل ہونے والا مالِ غنیمت ایک جگہ جمع کر رکھا تھا ۔ ان غنیمت میں سینکڑوں کی تعداد میں سونے کے دست بند، مروارید کی مالائیں، جڑاؤ (زیور کا نام)، آبدار تلواریں ، نفیس کپڑے ، شاہانہ پوشاکیں ، ڈھیروں سونا چاندی اور جنگی ساز و سامان کے انبار تھے ۔

حیدر علی نے پندرہ روز تک شہر میں قیام کیا ۔ مالِ غنیمت کے تین اس نے وہیں اپنے لشکر میں بانٹ دیئے اور مال کے دو حصے جو بچ گئے تھے دو سلطنت کے خزانوں میں داخل کرنے کے لیے اس نے ہیبت جنگ کے حوالے اور اسے حکم دیا کہ وہ اپنے حصے کے لشکر کو لے کر سرنگا پٹن روانہ ہو جائے ۔ اس علاوہ حیدر علی نے رانی کو ایک پالکی میں بٹھایا اور اسے بھی ہیبت جنگ کی میں سرنگا پٹن بھیج دیا تھا ۔

بدنور کا نام حیدر علی نے بدل کر حیدر نگر رکھ دیا ۔ اوجنی رام کو راجہ رام کا خطاب دے کر اس نے حیدر نگر کا صوبیدار مقرر کر دیا اور خود وہ نصر الدین کے ساتھ لشکر کو لے کر عبدالحکیم کی سرکوبی کو روانہ ہو گیا تھا ۔ جب وہ گولی درگ کے جنگل میں سے ہوتے ہوئے رات کی تاریکی میں عبدالحکیم کے پڑاؤ کی طرف بڑھ رہے تھے تو ایک سوار اپنا گھوڑا سرپٹ دوڑاتا ہوا نصر الدین کے پاس آیا ۔ وہ اسمٰعیل تھا جسے نصر الدین نے ستیہ جیت کے مرنے کی اطلاع سمیتا کو دینے کے لیے چیتل درگ کی طرف روانہ کیا تھا ۔

اسمٰعیل کو دیکھتے ہی نصر الدین نے پوچھا ۔ کیا تم سمیتا کے پاس گئے اور اسے ستیہ جیت کے مرنے کی اطلاع کر دی ہے ؟ اسمٰعیل نے اپنے بھاگتے گھوڑے کو اور قریب لاتے ہوئے کہا ۔ ”میں نے اسے اطلاع کر دی تھی وہ انتہائی دلیر اور حوصلہ مند لڑکی ہے ۔ بھائی کی موت پر اس نے قابلِ تعریف صبر و تحمل کا اظہار کیا ہے ۔ وہ اپنے بھائی کی موت کا سن کر روئی ضرور لیکن بڑے ضبط کے ساتھ ۔ میں نے اسے یہ کہتے بھی سنا ہے کہ میرے بھائی نے ایک نیک مقصد کے لیے جان دی ہے ۔ ستیہ جیت کی ہی ہو کہ اس نے اپنے ماموں ، ممانی اور ماموں زاد بہنوں کو تسلی دی تھی جو اس خبر کو سن کر دھاڑیں مار مار کر رونے لگے تھے ۔

میں نے صرف ایک شب ان کے ہاں قیام کیا تھا ۔ مرتے وقت ستیہ جیت نے آپ سے سمیتا کو اپنے ہاں لے جانے کی جو التجا کی تھی میں نے اس کا ذکر بھی سمیتا سے کیا تھا ۔ وہ مجھ سے تقاضا کرنے لگی تھی کہ میں اسے آپ کے ہاں سرنگا پٹن چھوڑ آؤں ۔ وہ کہتی تھی کہ آپ کی غیر موجودگی میں وہ آپ کی نابینا ماں کی خدمت اور سیوا کرے گی لیکن اس کے ماموں نندراج نے اسے منع کر دیا تھا ۔ نندراج نے آپ کے نام پیغام دیا تھا کہ جب آپ اس جنگ سے فارغ ہو سرنگا پٹن کی طرف جائیں تو جاتی دفعہ سمیتا کو اپنے ساتھ لیتے جائیں “ ۔ اسمٰعیل خاموش ہو گیا ۔ نصر الدین نے جواب میں کچھ نہ کہا تھا اور گھوڑے گولی درگ کے جنگل میں بالاندی کے رخ پر سرپٹ دوڑ رہے تھے ۔

گولی درگ کے جنگل اور بالاندی کے درمیان ایک وسیع میدان تھا جس کے اندر ساؤنور کا حکمران عبدالحکیم خان اپنے لشکر کے ساتھ خیمہ زن تھا۔ اس میدان میں اپنے حصّے کے لشکر کو لیے حیدر علی نمودار ہُوا۔ نصرالدین کو اس نے اس کے لشکر سمیت جنگل کے اندر ہی چھپا دیا تھا۔

عبدالحکیم خان نے جب دیکھا کہ ایک مختصر سی جمعیت حیدر علی کے ساتھ ہے تو وہ اس پر ٹوٹ پڑا اور حملہ کرنے میں پہل کر دی تھی۔ گو عبدالحکیم کے لشکر کی تعداد کہیں زیادہ تھی اس کے باوجود حیدر علی نے نہ صرف اس کے لشکر کو روک دیا تھا بلکہ پیچھے ہٹا کر جارحیت سے نکل کر دفاع میں چلے جانے پر مجبور کر دیا تھا۔

جس وقت حیدر علی اور عبدالحکیم کے دوران جنگ اپنے عروج پر پہنچ گئی اس وقت نصرالدین اپنے لشکر کے ساتھ گولی درگ کے جنگل سے نکل کر سیدھا مغرب کی طرف بڑھا۔ بالاندی کے کنارے کنارے اس نے ایک لمبا کاوا کاٹا عبدالحکیم خان کی پشت پر آیا اور شہاب ثاقب کی سی تیزی کے ساتھ وہ اس پر حملہ آور ہو گیا۔ عبدالحکیم کو یوں لگا جیسے اس کی پشت پر ہزاروں جوالا مکھی کے دھانے پھٹ پڑے ہوں۔ اس کے حاشیہ خیال میں بھی یہ بات نہ تھی کہ نصرالدین خون آشام تلواروں کے ساتھ فنا کی تحریر بن کر اس پر نازل ہو جائے گا۔ اس کے لشکر کی گتھی صفیں بکھرنے لگیں اور دفاع کے سارے حصار منتشر ہونا شروع ہو گئے تھے۔

نصرالدین کے حملہ آور ہونے پر حیدر علی نے بھی اپنے حملوں میں سختی اور تیزی پیدا کر دی تھی۔ اب پشت کی طرف سے نصرالدین نے اپنی پوری آتش زنی اور خوں ریزی کے ساتھ عبدالحکیم خان پر خستگی اور بے چارگی طاری کرنی شروع کر دی تھی جب کہ سامنے کی طرف حیدر علی سُرخ شعلوں کے رقص کی طرح لپکتا ہُوا اس پر اعصاب شکن طاری کر رہا تھا۔ اس دو طرفہ حملے نے عبدالحکیم کو توڑ کر رکھ دیا تھا۔ اور وہ جنگ سے پہلو تہی کرنے کے لیے گریز اور بچاؤ کے طریقے تلاش کرنے لگا تھا۔

ان حملوں سے پس کر عبدالحکیم خان پہلو بچاتا ہُوا اپنے لشکر کے ساتھ

کھڑا ہُوا۔ افراتفری کے عالم میں اس نے بالاندی کو عبور کیا اور اپنے دارالسلطنت ساؤنور کی طرف بھاگ جانے کی کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہو سکا۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ حیدر علی اور نصرالدین نے بھی ندی کو عبور کیا اور دوسرے کنارے پر پھر اسے گھیر کر جنگ کرنے پر مجبور کر دیا۔

عبدالحکیم نے جب دیکھا کہ فرار ہونا مشکل ہے تو اس نے فوراً ہتھیار ڈال کر صلح کی درخواست کی اور ایک کروڑ روپیہ ادا کرنے کی شرط پر حیدر علی سے مصلح کر لی اور آئندہ جنگ نہ کرنے کا وعدہ کیا۔ عبدالحکیم نے ایک کروڑ کی رقم کے عوض حیدر علی کو ہاتھی، اُونٹ، مخملی خیمے، زردوزی شامیانے، بُرہان پوری خلعتیں اور قیمتی ہتھیار دیئے اور خود اپنے بچے کھچے لشکر کے ساتھ اپنی جان بچا کر ساؤنور کی طرف چلا گیا۔

حیدر علی کو چونکہ مرہٹوں کی طرف سے اچانک حملے کا خطرہ تھا لہٰذا عبدالحکیم خان سے نمٹنے کے بعد وہ بنکاپور، چرولی اور ہرنی وغیرہ کے چھوٹے چھوٹے شہروں کو فتح کرتا ہوا سرنگاپٹن کی طرف کوچ کر رہا تھا۔

برسات کا موسم آگیا تھا۔ بادل گھر گھر آنے لگے تھے۔ سمیتا ایک روز اپنی دونوں ماموں زاد بہنوں کے ساتھ بیٹھی باتیں کر رہی تھی کہ اس کے ماموں اور ممانی اس کمرے میں آئے جس میں وہ تینوں بیٹھی باتیں کر رہی تھیں۔ اس کے ماموں نندراج نے ہاتھ سے اشارہ کیا اور اس کی دونوں بیٹیاں اُٹھ کر باہر نکل گئیں۔

نندراج نے کمرے کا دروازہ بند کرتے ہوئے کہا۔ "سمیتا! سمیتا! میری بیٹی! مجھے خبر ہوئی ہے کہ حیدر علی نے بدنور کی رانی پر قابو پانے کے علاوہ ساؤنور کے حکمران عبدالحکیم خان کو بھی جو رانی کی مدد کو آیا تھا اپنا مطیع و منقاد بنا لیا ہے۔ میں نے یہ بھی سُنا ہے کہ حیدر علی اپنے لشکر کے ساتھ سرنگاپٹن کی طرف کوچ کر چکا ہے۔ اگر یہ اطلاعات درست ہیں تو شاید چند روز تک نصرالدین تمہیں لینے یہاں آجائے۔"

نصرالدین کا نام سن کر سمیتا کے چہرے پر حیا آمیز سُرخی بکھر گئی تھی اور اس کی گردن قدرے جُھک سی گئی تھی۔ نندراج کہہ رہا تھا۔ "میں نصرالدین کے آنے سے قبل تم سے یہ جاننا چاہوں گا۔ کیا تم خوشی سے اور اسے اپنی منزل جان کر اس کے ساتھ سرنگا پٹن جا رہی ہو۔ اگر ایسا ہے تو مجھے خوشی ہوگی۔ کل کو اگر مجھ کو یہ بات سُننا پڑی کہ سمیتا کے لیے اس کے ماموں کے گھر میں جگہ نہ تھی تو مجھے تکلیف ہوگی۔ میرے سوال کا جواب دو بیٹی! کیا نصرالدین تمہاری منزل ہے اور کیا وہاں جانے میں تیری خوشی اور رضامندی ہے"۔

نندراج وہاں کھڑا ہو کر سمیتا کے جواب کا انتظار کرتا رہا لیکن سمیتا خاموش تھی۔ اس کی گردن اور زیادہ جُھک گئی تھی اور سانسیں بکھر کر رہ گئی تھیں۔ پھر آپ ہی آپ نندراج نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "شاید تم میری موجودگی میں کچھ نہ کہہ سکو۔ میں چلا جاتا ہوں تم اپنی ممانی سے سب کچھ کہہ دو۔ یہ مجھے بتا دے گی۔ نندراج مڑ کر باہر نکل گیا اور اپنے پیچھے اس کمرے کا دروازہ اس نے بند کر دیا تھا۔

سمیتا کی ممانی گومتی آگے بڑھی۔ وہ سمیتا کی مسہری پر جا بیٹھی اور پیار سے اس کا حسین چہرہ اس نے اوپر اُٹھاتے ہوئے کہا۔ "سمیتا! سمیتا! میں تو تمہاری ماں کی جگہ ہوں بیٹی! مجھ سے کیا اخفا۔ کہہ دو جو تمہارے دل میں ہے۔ تمہارے ماموں اپنے اطمینان کی خاطر پوچھتے ہیں اور پھر اس میں تمہاری بھی بھلائی ہے۔ کہو میری بیٹی! کیا تم نصرالدین کو پسند کرتی ہو۔ سمیتا نے اپنا سر آہستہ آہستہ اوپر اُٹھایا اور غور سے گومتی کی طرف دیکھنے لگی۔

گومتی نے پھر اسے ڈھارس دینے کی خاطر کہا۔ مجھ سے کیوں چھپائی اور شرما رہی ہو بیٹی! کھل کر کہو مجھ سے تاکہ تمہارے حق میں ہم سے کوئی غلط فیصلہ نہ ہو۔ سمیتا سمٹ کر گومتی سے لپٹ گئی اور اس کے کندھے پر سر رکھتے ہوئے پیار سے اس نے کہا۔ "ممانی! نصرالدین میرے دل کے آسمان پر اُمید کا ستارہ ہیں۔ ازل سے میرے دل میں بس رہے ہیں۔ اب جب کہ یہ بات کھل ہی گئی ہے تو میں بلا خوف کہہ سکتی ہوں۔ دن کو میری نظر اور رات کو میری رُوح انہیں تلاش کرتی ہے وہ میرے خون میں دھڑکتے ہیں اگر وہ مجھے نہ ملے تو بھی اُن کا نام میرے سینے میں سلامت رہے گا۔ وہ میری آہوں، میری سانسوں اور میرے اعصاب پر محیط ہیں۔

سنو ممانی! اگر کسی ہندو لڑکی کا کسی مسلمان سے محبت کرنا گناہ اور پاپ ہے تو میں سب سے بڑی گنہ گار ہوں۔" گومتی نے سمیتا کو زور سے اپنے ساتھ لپٹاتے ہوئے کہا۔ نہیں بیٹی! تو گنہ گار نہیں ہے۔ اب ہم پُرسکون ہو کر تجھ کو نصرالدین کے ساتھ روانہ کر سکیں گے۔ پھر گومتی علیحدہ ہو کر کھڑی ہوتی ہوئی بولی۔ "تم بیٹھو میں تمہارے ماموں کو تمہارے اس فیصلے سے آگاہ کرتی ہوں۔

گومتی کمرے سے باہر نکلنے والی تھی کہ حویلی کے بیرونی دروازے پر دستک ہوئی اس نے فوراً مڑ کر سمیتا کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ اس وقت ہماری حویلی کے دروازے پر کون دستک دے سکتا ہے۔ لگتا ہے نصرالدین آ گیا ہے۔ آؤ دیکھتے ہیں کون آیا ہے سمیتا مسہری سے اُتر گئی۔ برآمدے میں آ کر اُنہوں نے دیکھا۔ نندراج حویلی کا دروازہ کھولنے کو جا رہا تھا اور برآمدے کے دوسرے سرے پر گومتی کی دونوں بیٹیاں کھڑی تھیں۔ نندراج نے جب دروازہ کھولا تو اس نے دیکھا باہر نصرالدین اپنے گھوڑے کی باگ پکڑے کھڑا تھا۔ نندراج نے بڑی گرم جوشی سے مصافحہ کیا اور اس کے گھوڑے کی باگ پکڑتے ہوئے اس نے کہا۔ "آپ کی عمر بہت دراز ہے۔ ابھی گھر میں آپ ہی کا ذکر ہو رہا تھا۔"

نصرالدین اندر آیا۔ جونہی سمیتا نے اسے دیکھا اس کے تھکے مرجھائے چہرے پر رعنائی کے سفید پھول جیسی خوشگواری اور تازگی بکھر گئی تھی۔ اتنے میں گومتی نے صحن کی طرف بڑھتے ہوئے سمیتا سے کہا۔ "تم اپنے کمرے میں جاؤ بیٹی! میں نصرالدین کو تمہارے کمرے میں ہی لاتی ہوں۔ میں تمہیں اس سے کھل کر باتیں کرنے کا موقع دوں گی۔" سمیتا کسی سماوی خوشبو اور روشنی کے رنگین گیت کی صداؤں کی طرح پرسکون ہو کر اپنے کمرے میں چلی گئی تھی۔

دروازے کے قریب آکر گومتی نے نصرالدین کا بازو پکڑتے ہوئے اپنے شوہر نندراج سے کہا۔ "آپ اس کا گھوڑا اصطبل میں لے جائیں۔ مَیں اسے اور سمیتا کو باہم مل کر کوئی فیصلہ کرنے کا موقع دیتی ہوں"۔ نندراج چُپ چاپ گھوڑے کو پکڑ کر اصطبل کی طرف لے گیا۔ گومتی نصرالدین کا بازو پکڑے پکڑے اسی کمرے کے دروازے پر آئی جہاں وہ تھوڑی دیر قبل سمیتا سے گفتگو کرتی رہی تھی پھر اس نے نصرالدین کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"تم اندر چلے جاؤ بیٹے! یہ کمرہ سمیتا کا ہے۔ تم دونوں مِل کر جو فیصلہ کرو گے ہم اسی پر عمل پیرا ہوں گے"۔ گومتی مُڑی اور چلی گئی۔ نصرالدین دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا۔ اس نے دیکھا کمرے کے دائیں جانب مسہری کے قریب ہی سمیتا گردن جُھکائے خود فراموشی کے عالم میں کھڑی تھی۔ نصرالدین نے اندر آکر شباب کی اُمنگوں کے اس اُبلتے چشمے اور نسوانیت کے اس وقار کو نظر بھر کر دیکھا پھر ہلکے سے اس نے پکارا "سمیتا! سمیتا!"

سمیتا نے اپنی گردن سیدھی کی جھکی دراز پلکیں اس نے اُٹھائیں اور نصرالدین کی طرف دیکھا۔ نصرالدین کے آنے کی خوشی میں اس کے چہرے پر ہلکی ہلکی مسکراہٹ تھی۔ ایسی مسکراہٹ جس میں گھلاوٹ اور گرمی تھی۔ نصرالدین نے کہا "سمیتا! سمیتا! کیا تم میرے ساتھ سرنگاپٹن جانے کو تیار ہو"؟ سمیتا نے مُنہ سے کچھ نہ کہا۔ بس ایک طفلانہ سی سادگی میں اس نے اپنا سر اثبات میں ہلا دیا تھا۔

چند ثانیوں تک نصرالدین کھڑا اسے دیکھتا رہا پھر اس مہیب سناٹے کو سمیتا نے توڑتے ہوئے مدھم اور شرمیلی آواز میں کہا "آپ بیٹھیے نا، کھڑے کیوں ہیں"۔ نصرالدین وہیں کھڑا رہا اور سنجیدہ آواز میں اس نے کہا "سمیتا! سمیتا! میری زندگی افق پر پھیلنے والی اس شفق جیسی ہے جو بہت جلد رات کے اندھیروں میں ڈوب جاتی ہے۔ مَیں ایک سپاہی ہوں اور جنگ میں اپنی داستان مکمل کرنے کے لیے بکھرے اوراق جمع کرنے نکلتا ہوں۔ سنو! یہ داستان نامکمل بھی رہ سکتی ہے۔ مَیں آگ سے کھیلنے اور خون میں نہانے کو نکلا ہوں اور کسی وقت بھی میرا گھوڑا خالی پیٹھ آسکتا ہے۔ سمیتا! سمیتا! میں وہ قاصد ہوں

موت کے دروازے پر دستک دینے کو نکلتا ہے اور کسی بھی وقت یہ دستک آخری دستک بھی ہو سکتی ہے۔ تم نے ایک اچھے ماحول میں زندگی گزاری ہے اور مَیں تمہیں ایسا ماحول نہ دے سکوں گا۔ میری ماں نابینا ہے اور گھر پر کوئی ایسا نہیں جو تیری ناز برداری کر سکے۔ اس کے وجود اگر تم ڈوبتی کشتی کے ناخدا کو اور ایک ایسے مسافر کو جس کے سامنے تاریکی کے سوا کچھ نہیں اپنی زندگی کا ساتھی بنانے کا فیصلہ کر چکی ہو تو مَیں تمہیں مایوس نہ کروں گا۔ مَیں نے جو کہنا تھا کہہ چکا ہوں اب مجھے تمہارے فیصلے کا انتظار ہے۔

شام کے غمگین اندھیروں کی طرح ویران کھڑی سمیتا نے اپنی خمیدہ گردن کو سیدھا کیا۔ اس کی آنکھوں میں بے کسی کے آنسو اور تھکے تھکے چہرے پر ایک کرب ایک درد کا اظہار تھا۔ چند ثانیوں تک وہ بے چین و بے کل انداز میں نصرالدین کو دیکھتی رہی پھر اس نے آنسوؤں میں بھیگی آواز میں کہا۔

"آپ میری زندگی کی تاریک رات کی سحر اور میری آخری اُمید ہیں۔ مَیں اگر ایک مجاہد کے ساتھ جنگوں میں حصّہ نہ لے سکوں گی تو اس کے دُکھ درد اور تکلیف میں اس کی حصّہ دار تو بن سکوں گی"۔

نصرالدین چند لمحوں تک خاموشی سے سمیتا کو دیکھتا رہا پھر اس نے مدھم آواز میں کہا "تو پھر تیاری کرو۔ مَیں ابھی یہاں سے کُوچ کروں گا۔ میرا لشکر ابھی یہاں سے نزدیک ہی ہے اور مَیں حیدر علی سے تھوڑی دیر کی اجازت لے کر آیا ہوں۔ مَیں یہاں رات نہ رہ سکوں گا۔ اس لیے کہ مرہٹے سرنگاپٹن پر حملہ آور ہونے کے لیے ایک بہت بڑے لشکر کے ساتھ پونا سے رواں ہو چکے ہیں۔ ہم نے نہ صرف سرنگاپٹن کے دفاع کو مضبوط کرنا ہے بلکہ آگے بڑھ کر دشمن کا راستہ روکنا ہے تاکہ وہ ہمارے اطراف میں تباہی بن کر پھیل نہ سکے"۔

سمیتا نے اپنی آنکھیں خشک کر کے ہلکے ہلکے مسکراتے ہوئے کہا "آپ بیٹھیے تو سہی! مَیں پہلے آپ کے لیے کھانا لاتی ہوں"۔

سمیتا نے جب دروازے کی طرف بڑھنا چاہا تو نصرالدین نے اس کی راہ

روکتے ہوئے کہا۔ "میں کھانا کھا چکا ہوں۔ تم زحمت نہ کرو۔ میں یہیں رُک کر تمہارا انتظار کرتا ہوں۔ تم ماموں سے اجازت لے کر اپنی تیاری کر لو۔"

نصرالدین مسہری پر بیٹھ گیا۔ باہر برآمدے میں نندراج، اس کی بیوی گومتی اور دونوں بیٹیاں کھڑی تھیں۔ سمیتا نے قریب آ کر کہا۔ "ماموں! وہ ابھی یہاں سے کُوچ کرنا چاہتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ مرہٹے سرنگاپٹن پر حملہ کرنے کے لیے پونا سے کُوچ کر چکے ہیں لہٰذا وہ رات یہاں نہ رُک سکیں گے۔"

گومتی نے استفہامیہ انداز میں پوچھا۔ "کیا وہ تمہیں اپنے ساتھ لے جانے پر تیار ہے؟" "ہاں وہ اس پر آمادہ ہیں اور مجھے لے کر وہ ابھی یہاں سے کُوچ کرنا چاہتے ہیں۔" نندراج نے آگے بڑھ کر سمیتا کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے پیار اور شفقت میں کہا۔ "سمیتا! سمیتا! میری بیٹی! میں تیری رضا اور تیرے بھائی کی مرتے وقت کی خواہش کے پیشِ نظر تمہیں پرائے گھر جانے کی اجازت دے رہا ہوں۔ ورنہ میں تمہیں کبھی اپنے سے جدا نہ کرتا۔ تم ممانی کے ساتھ مل کر اپنی تیاری کر لو۔ میں اصطبل میں تمہارے گھوڑے پر زین کستا ہوں۔" گومتی اور اس کی بیٹیاں سمیتا کو لے کر ایک کمرے کی طرف چلی گئیں جب کہ بوڑھا نندراج اصطبل کی طرف جا رہا تھا۔

نصرالدین اسی مسہری پر بیٹھا انتظار کر رہا تھا کہ تھوڑی دیر بعد اس کمرے کا دروازہ کھلا اور گومتی نے باہر ہی کھڑے رہ کر نصرالدین سے کہا۔ "آؤ بیٹے! سمیتا کُوچ کے لیے اپنی تیاری مکمل کر چکی ہے۔" نصرالدین اُٹھ کر کمرے سے باہر نکلا۔ جب وہ گومتی کے پیچھے پیچھے صحن میں آیا تو اس نے دیکھا۔ بیرونی دروازے کے قریب ہی نندراج دو گھوڑوں کی باگیں پکڑے کھڑا تھا۔ ان میں سے ایک نصرالدین کا گھوڑا تھا اور دوسرا سمیتا کے لیے تیار کیا گیا تھا۔ قریب ہی نندراج کی دونوں بیٹیاں بھی اداس کھڑی تھیں۔ گومتی آگے بڑھی اس کے ہاتھ میں دو تھیلیاں تھیں جنہیں اس نے نصرالدین کے گھوڑے کی خرجین میں ڈالتے ہوئے اس سے کہا۔

"ان میں سے ایک تھیلی میں وہ کل اثاثہ ہے جو سمیتا بدنور سے یہاں

لے کر آئی تھی۔ دوسری تھیلی میں کچھ نقدی ہے جو اس کے ماموں کی طرف سے ہے۔"

گومتی جب خاموش ہوئی تو بوڑھے نندراج نے کہا۔ "کیا ہم سمیتا سے ملنے کبھی کبھی وہاں آ سکتے ہیں؟"

نصرالدین نے خوش طبعی سے کہا۔ "وہ گھر آپ کا اپنا گھر ہے آپ جب چاہیں وہاں آ سکتے ہیں وہاں ہمیشہ ایک اعزاز کے ساتھ آپ کا استقبال کیا جائے گا۔" نندراج نے کہا۔ "تو پھر اپنی منزل کھوٹی نہ کرو۔ جلدی یہاں سے روانہ ہو جاؤ کہیں تمہارا لشکر دُور نہ نکل جائے۔ میری دلی خواہش ہے تم دونوں لشکر کے ساتھ ساتھ بحفاظت سرنگاپٹن پہنچ جاؤ اس لیے کہ تمہارے پاس ایک بھاری رقم کے علاوہ قیمتی زیورات و جواہر بھی ہیں اور تم دونوں اکیلے سفر کرتے ہوئے غیر محفوظ ہو گے۔"

نصرالدین نے آگے بڑھ کر نندراج سے ہاتھ ملایا اور اپنے گھوڑے پر سوار ہو گیا۔ سمیتا بھی باری باری گومتی اور اس کی دونوں بیٹیوں سے ملی اس موقع پر اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے تھے۔ آخر میں نندراج نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا اور وہ اپنے گھوڑے پر سوار ہو گئی۔ اس طرح رات کے ویران اندھیروں میں نصرالدین اور سمیتا چیتل درگ سے سرنگاپٹن کی طرف کُوچ کر گئے تھے۔

دوسرے روز سہ پہر کے قریب نصرالدین سمیتا کے ساتھ اپنی حویلی میں داخل ہو رہا تھا۔ حویلی میں بالکل خاموشی اور سکوت تھا جیسے وہاں کوئی رہتا ہی نہ ہو۔ نصرالدین گھوڑوں کو پہلے اصطبل میں لے گیا۔ سمیتا بھی اس کے ساتھ ساتھ تھی۔ اپنے گھوڑے کی خرجین سے پہلے اس نے وہ دونوں تھیلیاں نکالیں جو گومتی نے اس میں ڈالی تھیں۔ پھر دونوں تھیلیاں اس نے سمیتا کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ "انہیں سنبھالو۔"

سمیتا نے شرماتے اور ہچکچاتے ہوئے کہا۔ "میں انہیں کہاں رکھوں گی، آپ خود سنبھالیں۔" نصرالدین نے دونوں تھیلیاں زبردستی اُسے تھما دیں۔ "اب تم نے ہی اس گھر میں رہنا ہے تو ان کی دیکھ بھال بھی تم ہی کیا کرو گی۔ میں تو جب گھر آؤں، مجھے

دو وقت کی روٹی دے دیا کرنا۔ میرے لیے یہی کافی ہوگا۔" سمیتا بے چاری کچھ اُداس ہو گئی۔ نصرالدین گھوڑوں کی زینیں اُتار کر اُنہیں چارہ ڈال رہا تھا۔

اصطبل سے نکل کر جب وہ دونوں حویلی کے ایک کمرے میں داخل ہوئے تو انہوں نے دیکھا وہاں نصرالدین کی بوڑھی اور نابینا ماں خولہ اور گھر کی ملازمہ صالحہ ظہر کی نماز ادا کر رہی تھیں۔ وہ دونوں ان کی پشت پر کھڑے ہو کر انہیں دیکھتے رہے۔ جب وہ نماز پڑھ چکیں اور خولہ مصلّے پر آلتی پالتی مار کر بیٹھ گئی تو نصرالدین آگے بڑھا صالحہ چونک کر اُن دونوں کی طرف دیکھنے لگی تھی وہ اُٹھ کر کچھ کہنے والی تھی کہ نصرالدین نے فوراً جُوتے اُتارے۔ وہ ماں کے سامنے گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا اور اس کے پاؤں چومنے لگا۔ خولہ نے چونک کر پوچھا "تو آگیا بیٹے!"

وہ اس کی پیٹھ پر ہاتھ پھیرنے لگی تھی۔ پھر اس نے نصرالدین کا چہرہ اپنے دونوں ہاتھوں میں لیا اور اس کی پیشانی چومنے لگی تھی۔ پشت میں کھڑی سمیتا یہ منظر پُر آنکھوں سے دیکھ رہی تھی۔ پھر نصرالدین سیدھا ہو کر بیٹھ گیا اور خولہ سے کہا "ماں! میرے ساتھ ایک مہمان بھی ہے"۔

صالحہ ابھی تک حیرت اور پریشانی میں حسین اور دلکش سمیتا کی طرف دیکھ رہی تھی۔ خولہ نے بڑی جستجو سے پوچھا "تیرے ساتھ مہمان کون ہے بیٹے"۔ نصرالدین ایک بار بُت کی طرح خاموش اور ساکن کھڑی سمیتا کی طرف دیکھا پھر اپنی ماں سے نے کہا۔ "ماں! پچھلی بار میں نے تم سے ایک لڑکی سمیتا کا ذکر کیا تھا نا، جس کے متعل تم نے کہا تھا کہ اسے اپنے ساتھ گھر لے آتے۔ اس جنگ میں اس کا بھائی کام آگیا اب وہ اکیلی رہ گئی ہے اور میں اسے اپنے ساتھ لے آیا ہوں"۔

خولہ نے بے تاب ہو کر پوچھا "وہ کہاں ہے بیٹے! اور تو اُسے کہاں کر آیا ہے"۔ نصرالدین نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "وہ آپ کے پیچھے کھڑی ہے" خوشی کے اظہار میں خولہ نے کہا۔ "تو پھر اسے میرے سامنے لا کر بٹھا"۔ نصرالد پیچھے ہٹ گیا اور اشارے سے سمیتا کو آگے بڑھ کر ماں کے سامنے بیٹھنے کو کہا۔ سم

آگے بڑھی، جُوتے اُتارے اور خولہ کے سامنے بیٹھ گئی۔

خولہ نے اس کے جسم پر ہاتھ پھیرتے ہوئے اس کا سر اپنے ہاتھوں میں لیا پھر اس کی پیشانی چُوم کر کہا۔ "اب یہ تیرا گھر ہے بیٹی! تو مجھے قد کاٹھ کی تو خُوب لگتی ہے پر میں یہ اندازہ نہیں لگا سکتی کہ تو شکل کی کیسی ہے"۔ پھر خود ہی خولہ نے صالحہ سے پوچھ لیا۔ "صالحہ! صالحہ! میری بیٹی شکل کی کیسی ہے"۔

صالحہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "بس یوں سمجھ لیں کہ میں نے اپنی زندگی میں بہت کم ایسی خوب صورت اور دلکش لڑکیاں دیکھی ہیں"۔ خولہ نے ایک بار پھر سمیتا کو اپنے ساتھ لپٹا لیا پھر اس نے اپنی کمر سے چابیوں کا ایک گچھا کھولا اور سمیتا سے کہا۔ "یہ چابیاں پکڑو بیٹی!" سمیتا نے حیرت و استعجاب کے عالم میں نصرالدین کی طرف دیکھا۔ جب نصرالدین نے سر کے اشارے سے اُسے چابیاں تھام لینے کو کہا تو سمیتا نے چابیاں لے لیں۔ اس کے ساتھ ہی خولہ نے پھر کہا۔

"سمیتا! سمیتا! میری بیٹی! یہ اس گھر کی چابیاں ہیں۔ میں آج سے انہیں تمہارے حوالے کرتی ہوں اس لیے کہ اب تم ہی اس گھر کی مالک ہو گی۔ سمیتا کے لبوں پر ہلکی ہلکی مسکراہٹ بکھر گئی تھی۔ خولہ نے اس بار صالحہ سے کہا۔ "صالحہ! اُٹھو میرے بیٹے اور بیٹی کے لیے کھانا تیار کرو۔ انہیں بھوک لگی ہو گی"۔ صالحہ اُٹھ کر باہر نکل گئی خولہ نصرالدین اور سمیتا وہیں بیٹھ کر آپس میں باتیں کرنے لگے تھے۔

مرہٹوں کا راستہ روکنے کے لیے حیدر علی اپنے لشکر کے ساتھ سرنگاپٹن سے روانہ ہوا۔ اس بار بھی اپنے جرنیل محمد علی کمندان کو اس نے اپنے مرکز کی حفاظت پر چھوڑا صرف نصرالدین اور ہیبت جنگ کو ساتھ لے کر دشمن کی طرف روانہ ہو گیا تھا طوفانی انداز سے سفر کرتے ہوئے حیدر علی بنگلور آیا اور یہاں اس نے اپنے لشکر کے ساتھ پڑاؤ کیا۔ لشکر کو اس نے اپنے، نصرالدین اور ہیبت جنگ کے درمیان تین برابر حصّوں میں تقسیم کر لیا تھا۔ اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ جونہی دشمن قریب آئے تین اطراف سے

اس پر قیامت خیز یلغار کر دی جائے۔

دوسری طرف مرہٹوں کا پیشوا سوامی مادھو راؤ بھی اپنے عظیم لشکر کے ساتھ پونا سے کوچ کر چکا تھا۔ اس کے لشکر میں اَن گِنت پیادے اور تقریباً ایک لاکھ سوار تھے جن میں پچاس ہزار بندوقچی بھی تھے۔ اس کے علاوہ اس لشکر میں تیس ہزار پنڈارے بھی تھے۔

یہ پنڈارے دکن کے خانہ بدوش اور اچکوں کا ایک گروہ تھا جو مرہٹوں کی فوج میں چھاپہ مار دستوں کا کام دیتے تھے۔ مرہٹوں کی زیادہ تر کامیابیاں ان ہی پنڈاروں کی دوڑ دھوپ کا نتیجہ تھیں۔ پنڈارے ان کے ساتھ لوٹ مار اور غارت گری میں مصروف رہتے تھے۔ ان کو مرہٹہ فوج کی طرف سے کوئی معاوضہ نہ ملتا تھا۔ البتہ وہ لشکر کے پڑاؤ میں گھاس اور جنگل سے لکڑی لا کر بیچا کرتے تھے اور جب کہیں لشکر کشی ہوتی تو یہ دشمن کے علاقہ میں لوٹ مار اور قتل و غارت کے لیے پھیل جاتے۔ جدھر جدھر سے بھی ان کا ٹڈی دَل گزرتا وہ علاقہ بے چراغ اور ویران ہو جاتا تھا۔ پنڈاروں کے اس گروہ میں زیادہ تر وسطی دکن کی نیچ قومیں شامل تھیں۔

ان پنڈاروں کے علاوہ مرہٹوں کے لشکر میں علی بہادر کی فوج، ایک بھاری توپ خانہ اور ہزاروں کی تعداد میں بیدڑے بھی شامل تھے۔ یہ بیدڑے دکن کی ایک خانہ بدوش، وحشی اور جنگجو قوم تھی۔ یہ سانپ کی پوجا کرتے تھے اور ہر قسم کا مُردار کھا لیا کرتے تھے۔ مرد اور عورتیں دونوں نیم برہنہ رہتے تھے۔ ان کا رنگ نہایت سیاہ ہوتا تھا اور ان کی عورتیں خوب صحت مند ہُوا کرتی تھیں۔

حیدر علی کو اس کے دونوں جاسوسوں اسمٰعیل اور شہباز نے جب مرہٹوں کے لشکر کے اعداد و شمار مہیا کیے تو اس نے مرہٹوں کے اَن گِنت لشکر کو بنگلور کے قریب روکنا غیر مناسب جانا۔ وہ جانتا تھا کہ اگر اس کھلے میدان میں لاکھوں دشمنوں کے سامنے ایک بار بھی اس کے پاؤں اُکھڑ گئے تو دشمن سرنگاپٹن کی دیواروں تک آ کے کہیں بھی رُک کر مقابلہ کرنے کی تِع نہ دے گا۔ لہٰذا اس نے بنگلور سے اپنا پڑاؤ اُٹھایا اور کوچ کر

کے وہ دوبارہ سرنگاپٹن آیا۔ شہر کی حفاظت کے لیے اس نے خندقیں کھدوا کر ان میں توپیں جما دیں۔ اس کے علاوہ کرناٹکی تیر اندازوں اور پیادوں کے دستے بھی اس نے اِن خندقوں میں متعین کر دیئے تھے اور ان خندقوں کے اندر ہی قیام کر کے وہ دشمن کی آمد کا انتظار کرنے لگا تھا۔

مرہٹہ لشکر یلغار کرتا ہُوا آگے بڑھا اور ساونور پہنچا۔ یہاں ان کے پیشوا سوامی نے عبدالحکیم خان کو بھی اپنے ساتھ مِلا لیا۔ آگے بڑھتے ہوئے گرکنات کے گھاٹ سے مرہٹہ لشکر نے دریائے تنگبھدرا کو عبور کیا اور چیتل درگ پہنچا۔ وہاں کا حاکم حیدر علی کا مطیع و فرمانبردار تھا لیکن مرہٹوں کے خوف سے وہ بھی ان کے ساتھ مِل گیا۔ اس طرح سوامی کے لشکر کو اور زیادہ تقویت مِل گئی تھی۔

اب مرہٹے براہِ راست حیدر علی کی سرزمین میں داخل ہوئے۔ وہ تباہ کُن آندھی کی طرح آگے بڑھتے اور ہر چیز کو آگ کا ایندھن بناتے ہوئے اپنے پیچھے فنا کی ناقابلِ برداشت تحریریں چھوڑتے جا رہے تھے۔ حیدر علی کا شہر سرا سب سے پہلے مرہٹوں کے راستے میں آیا۔ یہاں حیدر علی کی طرف سے میر رضا علی خان حاکم مقرر تھا۔

شہر کے شمال میں ایک تالاب تھا۔ سوامی نے اس کے کنارے اپنی توپیں نصب کیں اور شہر کی فصیل کو توڑنے کے لیے اس نے گولے برسانے شروع کر دیئے تھے۔ رضا علی خان حاکم سرا دس بارہ روز تک مرہٹوں سے مقابلہ کرتا رہا۔ جب اُسے یقین ہو گیا کہ وہ زیادہ دیر تک اپنا دفاع جاری نہ رکھ سکے گا تو اس نے چند شرائط پر مرہٹوں سے صلح کر کے شہر کی چابیاں اُن کے حوالے کر دیں اور خود اُن کے لشکر میں ہی ملازمت اختیار کر لی۔

یہاں سے فارغ ہونے کے بعد مرہٹے آگے بڑھے۔ اب اُن کا رُخ کوہستان نجکل کی طرف تھا۔ ان کوہستانوں کے اندر نجکل کے نام سے حیدر علی کا ایک مضبوط قلعہ اور شہر تھا اور سردار خاں جو حیدر علی کا ایک وفادار اور پُرانا ملازم تھا یہاں کا قلعہ دار تھا۔ مرہٹوں کا رُخ اب اسی شہر کی طرف تھا۔

دوسری طرف حیدر علی بھی حرکت میں آیا اس نے سرنگاپٹن کے اندر محمد علی کمندان

کو اور شہر سے باہر کھودی ہوئی خندقوں پر ہیبت جنگ کو محافظ مقرر کیا اور خود دو
کے ساتھ ایک بڑے لشکر کے ساتھ سرنگاپٹن سے نکلا۔ خود وہ ماگری درگ کے
میں اس نیت سے چھپ کر بیٹھ گیا کہ جب مرہٹے یہاں سے گزر کر سرنگاپٹن کی طر
جائیں گے تو وہ ان پر ایک کامیاب شب خون مارے گا۔ نصرالدین کو اس نے آدھ
لشکر دے کر نجکل شہر کے قلعہ دار سردار خان کی مدد کو روانہ کر دیا تھا۔

آدھی رات کے قریب ایک روز نصرالدین نجکل شہر کے مشرقی دروازے پ
دستک دے رہا تھا۔ اور اس کا لشکر اس کے پیچھے اندھیرے میں دُور تک پھیلا ہوا تھ
مرہٹوں کے خوف سے نجکل کا قلعہ دار سردار خان شہر کے دروازے ہر وقت بند رکھتا تھا
دو تین بار کی دستک کے بعد دروازہ کھلنے کے بجائے کسی نے روزن میں سے جھانکتے ہ
پوچھا۔ "تم کون ہو؟ اور آدھی رات کو شہر کے دروازے پر کیوں دستک دے رہے ہو"

نصرالدین نے کہا۔ "میں حیدر علی کا جرنیل نصرالدین ہوں اور اپنے لشکر کے
ساتھ اہلِ نجکل کی مدد کو آیا ہوں۔ دروازے کے محافظ نے روزن میں سے پھر کہا "
دروازہ نہیں کھول سکتا۔ ہمیں آپ کے آنے کی کوئی اطلاع نہیں۔ آپ تھوڑی دیر ک
ہمارے قلعہ دار سردار خان ابھی تک جاگ رہے ہیں۔ وہ یہیں نزدیک ہی ہیں میں اُن سے
بات کرتا ہوں"۔ نصرالدین وہیں کھڑا ہو کر انتظار کرنے لگا تھا۔

کوئی زیادہ دیر نہ گزری تھی کہ دروازے کے روزن میں سے اس بار کسی نے ا
بھاری بھرکم آواز اور تحکمانہ لہجے میں پوچھا "کون ہے؟" نصرالدین نے پرسکون آواز
کہا۔ "میں تمہاری آواز کو پہچانتا ہوں۔ تم قلعہ دار سردار خان ہو۔ میں نصرالدین ہوں شا
میری آواز تمہاری سماعت کی شناسا ہو"۔

اندر سے سردار خان نے چلّا کر دروازے کے محافظوں سے کہا "دروازہ کھ
دو۔ خدا کی قسم یہ امیر نصرالدین ہیں۔ میں ان کی آواز پہچانتا ہوں"۔

تھوڑی دیر بعد شہر کا دروازہ کھلا۔ سامنے قلعہ دار سردار خان کھڑا تھا نصرالدین
کو دیکھتے ہی وہ آگے بڑھا اور اس سے گلے ملتے ہوئے اس نے بے پناہ خوشی کا اظہار کرتے

ہوئے کہا۔ "میں آپ کو یہاں خوش آمدید کہتا ہوں"۔ پھر وہ علیحدہ ہوا اور نصرالدین کا
ہاتھ تھامتے ہوئے اس نے کہا۔ "آپ کی آمد سے میرے حوصلے اور بڑھ گئے ہیں۔ اب آپ
ہی اس شہر کے حاکم اور محافظ ہیں۔ میں آپ کا مطیع و منقاد بن کر رہوں گا۔ آپ کا ہر
فیصلہ ہمارے لیے آخری حکم ہوگا۔ نجکل کے ان کوہستانوں میں اب ہم انشاء اللہ ایک آہنی
حصار کھڑا کر دیں گے۔

نصرالدین نے سردار خان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "اس محافظ کو بلاؤ جس نے
میرے کہنے پر دروازہ نہ کھولا تھا"۔ ایک سپاہی بھاگ کر خود ہی سامنے آگیا اور کہا۔ "اے
امیر! میں نے دروازہ نہ کھولا تھا اس لیے کہ ——"

اس سپاہی کو رُک جانا پڑا کیونکہ نصرالدین نے اپنے گھوڑے کی خرجین سے
نقدی کی ایک تھیلی نکالی اور اس سپاہی کو تھما کر اس کا شانہ تھپتھپاتے ہوئے کہا۔ "میں
تمہاری فرض شناسی سے متاثر اور خوش ہوں۔ تم نے دروازہ کھولنے میں جو احتیاط برتی
ہے مجھے اسی کی توقع تھی۔ نقدی کی یہ تھیلی تمہارے خلوص، بیداری اور فرض شناسی کا
صلہ ہے۔ اگر ہم سب ایسے ہی بیدار ہو جائیں تو دُنیا کی کوئی طاقت ہمیں زیر نہیں کر سکتی"۔

وہ سپاہی خوش خوش پیچھے ہٹ گیا۔ نصرالدین اپنے لشکر کے ساتھ شہر میں
داخل ہو رہا تھا اور سردار خان اپنے نائبوں کے ساتھ اس کے لشکر کی رہائش اور خوراک کا
انتظام کرنے میں لگ گیا تھا۔

نجکل میں دو یوم کے قیام کے دوران نصرالدین نے شہر کے اندر موجود چھوٹی
چھوٹی توپوں کو شہر کی فصیل کے اُوپر بُرجوں میں نصب کر دیا تھا۔ اپنے لشکر کو اس نے
شمال اور مشرق کی طرف جب کہ سردار خان کے لشکر کو جنوب اور مغرب کی طرف متعین کر دیا
گیا تھا۔ تیسرے روز صبح ہی صبح مرہٹہ لشکر بھی وہاں پہنچ گیا تھا۔ یہ لاتعداد اور اَن گنت
پیدل اور سواروں پر مشتمل دو بڑے حصّوں میں تقسیم تھا۔ ایک حصّہ خود مرہٹوں کے مذہبی پیشوا
سوامی کے تحت تھا۔ جب کہ دوسرا اس کے ایک قابلِ اعتبار جرنیل گوپال راؤ کی
سرکردگی میں کام کر رہا تھا۔

شہر کے شمال مشرقی حصے میں مرہٹوں نے آکر پڑاؤ کیا۔ اپنی آمد کے تھوڑی ہی دیر بعد سوامی نے دو سوار نجکل شہر کی طرف بھیجے جو سیدھے شہر کے مشرقی دروازے کی طرف آئے تھے لیکن محافظوں نے دروازہ کھولے بغیر اُنہیں اسی بُرج کی طرف جانے کو کہا جس کے اندر اس وقت نصرالدین اور سردار خان کھڑے تھے۔ وہ دونوں سوار وہاں آئے اور اُن میں سے ایک نے بلند آواز میں پکارتے ہوئے کہا۔ "تم میں سے نجکل کا قلعہ دار کون ہے"۔

نصرالدین اور سردار خان بُرج سے باہر نکل کر کھڑے ہوگئے پھر سردار خان نے ان دونوں سپاہیوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "میں نجکل کا قلعہ دار ہوں۔ کہو ——" اس سپاہی نے کہا "ہمارے پیشوا کا حکم ہے کہ قلعہ ہمارے حوالے کر دو۔ اس سے تم جان محفوظ رہے اور ہم اہل شہر کو بھی سلامتی اور امن کی ضمانت دیں گے"۔

سردار خان سوالیہ انداز میں نصرالدین کی طرف دیکھنے لگا تھا۔ نصرالدین نے اُنہیں مخاطب کر کے کہا۔ "جاؤ واپس لوٹ جاؤ۔ تمہارے پڑاؤ میں داخل ہونے سے قبل ہی تمہارے پیشوا کو ہمارا جواب مِل جائے گا"۔ دونوں سپاہیوں نے ایک دوسرے کی طرف حیرت اور تعجب سے دیکھا پھر وہ اپنے گھوڑوں کو ایڑ لگا کر واپس چلے گئے تھے۔ نصرالدین نے اپنے ایک سپاہی سے جلتی ہوئی مشعل لی اور اس سے مرہٹوں کے لشکر کی طرف بُرج کے اندر کھڑی توپ سے چند گولے داغ کر اس نے جنگ کا اعلان کر دیا تھا۔

مرہٹوں کے پیشوا سوامی نے غضب ناک ہو کر قلعہ پر ایک ساتھ حملہ بول دینے کا حکم دے دیا تھا۔ اَن گِنت مرہٹے زنبور کی طرح بھنبھناتے ہوئے شہر کی فصیل پر چڑھنے لگے تھے لیکن اس وقت مرہٹوں پر رست خیزی کا عالم طاری ہو گیا تھا جب فصیل پر چڑھنے والوں پر تیروں کی بوچھاڑ اور فصیل کی طرف بڑھنے والوں پر توپوں کے گولے برسنے لگے تھے۔ جب مرہٹے ان گولوں کی زد سے بچتے ہوئے فصیل سے اور نزدیک ہوئے تو فصیل کے اُوپر سے بندوقچیوں نے ان پر گولیوں کی بوچھاڑ شروع کر دی تھی۔

چاروں طرف ایک طوفان اُٹھ کھڑا ہوا تھا۔ مرہٹے شکست کھا کر پیچھے بھاگے اور فصیل کے اطراف میں دُور دُور تک ان کے ساتھیوں کی لاشیں بکھر گئی تھیں۔

مرہٹے دوسرے روز اپنی پُوری تیاری کے ساتھ شہر پر حملہ آور ہونے کے لیے پھر فصیل کی طرف بڑھے۔ آج اُن کا پیشوا سوامی بھی ایک ہاتھی پر سوار ان کے ساتھ تھا لیکن جونہی مرہٹہ لشکر نزدیک ہوا ان پر گولیوں اور تیروں کی برسات شروع ہو گئی تھی۔ توپوں کے دھانے دھواں اور آگ کا طوفان کھڑا کرتے ہوئے گولے اُگلنے لگے تھے۔ مرہٹے ایک بار پھر نصرالدین اور سردار خان کے دفاع کے سامنے اپنے آپ کو بے بس اور لاچار محسوس کرنے لگے تھے۔

اپنے پیشوا کے اُکسانے پر جوق در جوق حملہ کرنے کے لیے آگے بڑھنے والے مرہٹوں کی لاشوں کے انبار لگ گئے تھے۔ اپنا اس قدر نقصان دیکھ کر سوامی نے اپنے لشکر کو پیچھے ہٹ جانے کا حکم دے دیا تھا۔

خولہ اور صالحہ مغرب کی نماز پڑھ رہی تھیں اور سمیتا ان کے پیچھے کھڑی ان دونوں کو رکوع و سجود کرتے ہوئے بڑے غور اور انہماک سے دیکھ رہی تھی۔ نماز کے بعد جب وہ دونوں دُعا مانگ کر فارغ ہوئیں تو صالحہ نے مُڑ کر دیکھا، سمیتا ابھی تک ان دونوں کی طرف دیکھے جا رہی تھی۔ صالحہ نے مُسکراتے ہوئے پوچھا۔ "تم کیا دیکھ رہی ہو بیٹی!"۔

سمیتا نے انہماک اور جذب سے چونکتے ہوئے کہا۔ "میں آپ کے پُوجا پاٹھ کے طریقہ کو دیکھ رہی تھی"۔ صالحہ کی بجائے اس بار خولہ نے پوچھا۔ "کیا اس سے قبل تم نے کسی مسلمان کو عبادت کرتے نہیں دیکھا؟" سمیتا نے بڑی معصومیت سے کہا۔ "صرف نصرالدین کو میں نے اپنی زندگی میں پہلی بار ایسی عبادت کرتے دیکھا تھا لیکن مجھے ان سے کچھ پوچھنے کی ہمت نہ ہوئی تھی۔ میں نے اپنی زندگی کا زیادہ وقت حویلی کے اندر ہی گزارا ہے۔ باہر نکلنے کے مجھے بہت کم مواقع ملے ہیں۔

اس لیے عبادت کا یہ طریقہ میرے لیے انوکھا اور نیا ہے کہ آپ لوگ کوئی بُت، کوئی مورتی نہیں رکھتے نہ اپنی پُوجا کو کسی دیوتا سے مختص کرتے ہیں ۔

نابینا خولہ نے اپنے سامنے مصلّے پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا ۔" سمیتا! سمیتا! اِدھر میرے سامنے آکر بیٹھو بیٹی! اگر تم پسند کرو تو مَیں مذہب سے متعلق تم سے گفتگو کرنا پسند کروں گی ۔" سمیتا آگے بڑھی اور خولہ کے سامنے مصلّے پر بیٹھ گئی ۔ خولہ کو یہ احساس دِلانے کے لیے کہ وہ اس کے سامنے بیٹھ چکی ہے ۔ اس نے اپنا ایک ہاتھ خولہ کے گھٹنے پر رکھ دیا تھا ۔ خولہ نے سمیتا کے اس ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھتے ہوئے کہا ۔" بیٹی کیا تُو بتائے گی گھروں میں چراغ روشن کیوں کیے جاتے ہیں ۔"

سمیتا نے خولہ سے اور قریب ہوتے ہوئے کہا ۔" کہ روشنی ہو اور انسان دیکھ سکے ۔" خولہ نے سوچتے ہوئے کہا ۔" تو سنو بیٹی! جس طرح گھر میں روشن چراغ اپنی روشنی سے ہر چیز کی طرف صحیح راہنمائی کرتا ہے ۔ ایسے ہی انسانی جسم کے اندر بھی ایک چراغ ہے اور وہ اس کا ضمیر ہے ۔ ضمیر خاموش ہو تو انسانیت کی موت ہے آج مَیں بھی تمہارے ضمیر کو اپنے مذہب کی چمک سے روشن کرتی ہوں ۔ اگر یہ تیری صحیح راہنمائی کر سکے، تیرے دِل کو سکون و ہم آہنگی بخشے تو اسے قبول کر لینا بصورتِ دیگر تم اپنی موجودہ حیثیت پر برقرار رہنا ۔

سمیتا نے خولہ کی طرح دو زانو ہو کر بیٹھتے ہوئے کہا ۔" کہیں مَیں غور سے سنوں گی ۔" خولہ نے کہا ۔" کیا تُو نے اپنے مذہب کی کوئی کتاب پڑھی ہے ۔" سمیتا نے گردن جھکاتے ہوئے کہا ۔" مَیں نے مہابھارت، رامائن، بھگوت گیتا، منوسمرتی کے علاوہ کچھ پران اور اپنشد کا بھی مطالعہ کر رکھا ہے ۔" خولہ نے پھر کہا ۔" کیا تو نے اپنے ویدوں کا مطالعہ نہیں کیا ۔ سمیتا نے شرمندگی کے احساس میں کہا ۔" مَیں نے صِرف رگ وید پڑھی ہے ۔"

خولہ نے اس کا ہاتھ تھامتے ہوئے کہا ۔" کاش تُو نے سام وید، اتھروید اور یجر وید کا بھی مطالعہ کیا ہوتا ۔" سمیتا نے چونکتے ہوئے پوچھا ۔" کیا ان میں کوئی خاص بات ہے ۔" ———— " ہاں ہاں! ان میں خاص بات تو ہے پر کیا تو میری ان باتوں کا اعتبار کر لے گی اور ہاں سنو! اگر تجھے میری کہی ہوئی کسی بات پر شبہ ہو تو تم وہ کتابیں پڑھ کر دیکھ لینا جن کا مَیں ذکر کروں گی اور جن میں ہمارے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی آمد کے متعلق پیش گوئیاں کی گئی ہیں ۔"

سمیتا نے اور زیادہ متوجہ ہوتے ہوئے کہا ۔" آپ کہیئے مَیں آپ کی ہر بات کا ویسے ہی اعتبار کروں گی جیسے میں ویدوں کے منتروں کو بن پڑھے ان کی سچائی کا اقرار کرتی ہوں ۔"

خولہ نے سر جھکا کر سوچا پھر کہا ۔" سنو بیٹی! سام وید کے پرپاٹھک ۲ کھنڈ ۶ کے منتر آٹھ کا رشی کہتا ہے ۔" احمدؐ نے اپنے رب سے حِکمت شریعت کو حاصل کیا ۔ مَیں سُورج کی مانند اس سے روشن ہو رہا ہوں ۔" ———— خولہ نے رُک کر سمیتا کو مخاطب کر کے کہا ۔" کیا تُو نے سُنا جو مَیں نے کہا ۔ یہ وہ کلام ہے جو حضرت عیسٰےؑ سے بھی قبل مرتب کیا گیا تھا ۔"

سمیتا نے متاثرہ آواز میں کہا ۔" ہاں مَیں نے غور سے سُنا ہے ۔" خولہ پھر بولی ۔" اس کے علاوہ اتھروید کے کنتاپ سوکت کے پہلے منتر میں ہمارے رسولؐ کے متعلق جو پیش گوئی ہے اس کا خلاصہ یہ ہے ۔

" آپ کا نام محمدؐ ہوگا ۔ وہ شہزادۂ اِمن ہوگا ۔ دُشمن کی کثرت میں خُدا اس کی حفاظت کرے گا ۔"

اگر اس سے بھی آگے بڑھیں بیٹی تو ہمارے رسُولؐ سے بہت عرصہ پہلے مہرویاس نام کا ہندوؤں میں ایک صفاکیش رِشی گزرا ہے اس نے ایک بڑی کتاب بھوشیہ پران مرتب کی تھی ۔ اس کتاب کے پرتی سرگ کے اشلوک ۵ تا ۸ میں وہ یُوں لِکھتا ہے ۔

" ایک ملیچھ یا اجنبی ملک اور زبان کا معلّم رُوحانی اپنے صحابہؓ کے ساتھ آئے گا ۔ اس کا نام محمدؐ ہوگا ۔ راجہ بھوج نے اس مہادیو

(ملائک سیرت) عرب کے رہنے والے کو آبِ ردِ گنگا اور پنج گویہ سے غسل کرا کے (یعنی تمام گناہوں سے پاک ٹھہرا کر) دلی ارادت سے نذر نیاز پیش کر کے اس کی تعظیم کی اور کہا میں تیرے حضور جھکتا ہوں۔ اے فخرِ نسلِ انسانی عرب کے رہنے والے! شیطان کے مارنے کے لیے بہت سی طاقت مہیا کرنے والے دشمن ملیچھوں سے حفاظت کیے گئے ہو۔ اے پاک ہستی مطلق اور سرورِ کامل کے مظہر میں آپ کا غلام ہو مجھے اپنے قدموں میں آیا ہوا جانیئے۔"

خولہ نے رُک کر کہا۔ "کیا کسی نبیؑ اور رسولؑ کے متعلق اس کی سچائی کے لیے اس سے بھی بڑھ کر کوئی واضح اور صاف پیش گوئی اور دلیل ہو سکتی ہے۔ تم ہندو ہو اس لیے میں تمہاری ہی مذہبی کتب سے یہ اقتباسات پیش کیے ہیں۔ ورنہ تورات اور انجیل میں تو جگہ جگہ ہمارے نبیؐ کی آمد کا مژدہ ہے۔" سمیتا نے خولہ کے دونوں گھٹنے پکڑتے ہوئے کہا۔ "ماں! جو عبادت تم کرتی ہو یہ مجھے بھی سکھاؤ مجھے بھلی لگتی ہے۔ اس کے علاوہ ہر روز صبح اپنی جس مذہبی کتاب کی تم تلاوت کرتی ہو وہ مجھے بھی پڑھاؤ کہ میں اس سے فلاح و سلامتی حاصل کروں گی۔"

خولہ نے سمیتا کو اپنے ساتھ لپٹاتے ہوئے کہا۔ "میں تجھے ضرور پڑھاؤں اور سکھاؤں گی۔" سمیتا بھی خولہ سے لپٹ گئی۔ پھر خولہ نے ہلکی سی آواز میں کہا۔ "صالحہ! صالحہ! اُٹھو کھانا یہیں لے آؤ۔ یہیں تینوں اکٹھی بیٹھ کر کھا لیتی ہیں۔"

خولہ نے جب محسوس کر لیا کہ صالحہ اُٹھ کر باہر چلی گئی ہے تو اس نے پیار سے سمیتا کی پیٹھ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ "بیٹی! اگر تم سچ کہو تو ایک بات پوچھوں؟"

سمیتا نے اپنا سر خولہ کی گود میں رکھتے ہوئے کہا۔ "آپ پوچھیں میں آپ سے کبھی جھوٹ نہ کہوں گی۔" خولہ نے ہلکی مدھم آواز میں پوچھا۔ "کیا تم نصر الدین کو پسند کرتی ہو؟" سمیتا علیحدہ ہو گئی۔ اس کی سانسوں کی دھڑکن تیز ہو گئی اور اس نے

خاموشی سادھے رکھی تھی۔ خولہ نے پھر پوچھا۔ "کچھ تو کہو بیٹی! میں تمہاری زبان سے کچھ سننا چاہتی ہوں تاکہ اسی کے مطابق میں عمل بھی کر سکوں۔"

سمیتا نے تیزی سے پلکیں جھپکاتے ہوئے شرمیلی سی آواز میں کہا۔ "ماں! ماں! میں اپنے جسم اور روح کا انہیں مالک جانتی ہوں۔ ان ہی کے دم سے میرے جسم کی تابانی اور میری روح کی پائیداری ہے۔" سمیتا ذرا رکی پھر وہ بہتے پانی کے دھیمے راگ کی طرح کہتی چلی گئی تھی۔

"ماں! وہ میری زندگی میں شب کے ویران گوشے کے چراغ، میری نیست کے خاموش آسمان پر ایک ستارہ، میری سازِ حیات کے خاموش تار اور میرے تھکے چہرے کی مسکراہٹ ہیں۔ ماں! وہ میرے تاریک اُفق پر اُمید کی کرن اور میری زندگی کی ہر سانس کی قیمت ہیں۔ میں نے اُن کے نام کی گونج ہمیشہ اپنے سپنوں کی تعبیر اور اپنے دل کی دھڑکنوں کی خاموشی میں سُنی ہے۔ لگتا ہے وہ ازل سے میرے دل میں ہوں اور کسی نے مجھے ان کی سلامتی اور زندگی کا مقصد بنا کر پیدا کیا ہو۔"

خولہ نے فیصلہ کن انداز میں کہا تو پھر کوئی بھی تمہیں اس سے علیحدہ نہیں کر سکتا میں بہت جلد تم دونوں کو ایک کر دوں گی۔ سمیتا والہانہ انداز میں ایک بار پھر خولہ سے لپٹ گئی اور اس کی چھاتی پر سر رکھتے ہوئے اس نے کہا۔

"ماں! تمہاری آنکھیں کب سے اندھی ہیں؟" خولہ نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ "بیٹی! شوہر کی وفات کے بعد جلدی ہی میری آنکھوں کی بینائی جاتی رہی۔" سمیتا نے علیحدہ ہوتے ہوئے کہا۔ "ماں! کیا تم ——"

صالحہ کھانا لے آئی تھی۔ لہٰذا سمیتا نے بات کا رُخ بدلتے ہوئے کہا۔ "کھانا آگیا ہے ماں! آؤ پہلے کھانا کھائیں۔ سمیتا پیچھے ہٹ کر بیٹھ گئی۔ صالحہ نے اُن دونوں کے سامنے کھانے کے برتن بڑے قرینے سے لگائے پھر وہ تینوں اکٹھی بیٹھ کر کھانا کھا رہی تھیں۔

نصرالدین نجکل شہر کی فصیل کے ایک برج میں کھڑا بڑے غور سے اس طرف دیکھ رہا تھا جدھر دُور دُور تک مرہٹوں کا لشکر پڑاؤ کیے ہوئے تھا۔ جہاں تک نگاہ کام کرتی تھی خیمے ہی خیمے نصب تھے۔ وہ نہ جانے کن سوچوں میں کھویا ہُوا تھا کہ ایک طرف سے نجکل کا قلعہ دار سردار خان بھاگتا ہُوا آیا اور نصرالدین کے قریب آ کر اس نے مایوسی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ "میں ایک بُری خبر لے کر آیا ہوں"۔

نصرالدین نے سوالیہ کیفیت میں پوچھا۔ "کیسی بُری خبر لائے ہو"۔

"میرے آدمی خبر لائے ہیں کہ مرہٹے چند یوم تک نئے انداز سے حملہ آور ہوں گے۔ وہ خود تو شہر کے شمال اور مشرق کی طرف حملہ آور ہوں گے لیکن انہوں نے بیڈروں اور پنڈاروں کو جنوب اور مغرب کی طرف سے حملہ آور ہونے کے لیے تیار کیا ہے۔ مرہٹے حملہ کر کے ہمیں مصروف رکھنے کی کوشش کریں گے جب کہ بیڈر اور پنڈارے جنوبی اور مغربی سمتوں سے فصیل پر چڑھ کر شہر میں داخل ہونے کی کوشش کریں گے۔ یہ دونوں وحشی اور مردار خور قومیں ہیں اور نہ صرف شہر کے لوگ بلکہ میرے عسکری بھی ان کا مقابلہ کرتے ہوئے جی چُراتے ہیں۔ اگر ان دونوں قوموں میں سے کوئی ایک بھی شہر میں داخل ہونے میں کامیاب ہو گئی تو میرا ذاتی لشکر زیادہ دیر تک ان کے سامنے جم کر نہ لڑ سکے گا۔ وہ وحشی مردہ انسانوں تک کا بھی گوشت کھا جاتے ہیں"۔

نصرالدین نے آگے بڑھ کر سردار خان کا شانہ تھپتھپاتے ہوئے تسلی آمیز لہجہ

میں کہا۔ "تم فکرمند نہ ہو۔ جہاں ہم نے مرہٹوں کے حملوں کا مُنہ توڑ جواب دیا ہے وہاں وحشی پنڈارے اور بیڈر بھی ہمارے سامنے ٹھہر نہ سکیں گے۔ تم اپنے لشکر کے ساتھ قلعے کی حفاظت کرتے رہنا۔ میں آج رات ہی اپنے لشکر کو لے کر شہر سے نکل کر مغربی جنگل کی طرف چلا جاؤں گا۔ اگر اس طرف کہیں بیڈر اور پنڈاروں نے جمع ہونے کی کوشش کی تو میں ان پر شب خون مار کر انہیں وہاں سے بھاگ جانے پر مجبور کر دوں گا۔ اگر تم حملہ آوروں کو فصیل سے نزدیک نہ آنے دو تو میں تمہیں یقین دلاتا ہوں وحشی پنڈارے اور بیڈر ہمارے سامنے بے بس ہو کر رہ جائیں گے۔ کیا تمہیں خبر ہوئی کہ مرہٹے ہم پر کب تک ایسا حملہ کریں گے"۔

سردار خان نے غمگین اور دلگیر آواز میں کہا۔ "یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ وہ کب ایسے حملے کی ابتداء کریں گے۔ بہرحال وہ وقت ضائع نہیں کریں گے اور جہاں تک میرا اندازہ ہے وہ چند یوم میں ہی حملہ آور ہو جائیں گے"۔

نصرالدین نے چند ثانیوں کی سوچ اور فکر کے بعد کہا۔ "شام ہونے میں تھوڑی ہی دیر ہے۔ میں آج عشاء کی نماز کے بعد یہاں سے کُوچ کر جاؤں گا۔ میں جانتا ہوں مرہٹے زیادہ عرصہ تک بے کار بیٹھنے والے نہیں ہیں۔ قبل اس کے کہ وہ پنڈاروں اور بیڈروں کے بل بوتے پر ہم پر قابو پانے کی کوشش کریں میں پہلے ہی ان دونوں وحشی قوموں سے نمٹ لینا چاہتا ہوں۔ مجھے عشاء سے پہلے پہلے اپنے لشکر کی رسد و خوراک اور اس کے کُوچ کا انتظام کر لینا چاہیئے"۔ نصرالدین برج سے نکل کر فصیل سے نیچے اُتر گیا سردار خان بھی اس کے ساتھ ساتھ نیچے چلا گیا تھا۔

عشاء کی نماز کے بعد شہر کا جنوبی دروازہ کھلا اور نصرالدین رات کی تاریکی میں اپنے لشکر کے ساتھ نجکل شہر سے نکل کر جنوب مغربی جنگل کی طرف چلا گیا تھا۔ اس نے بڑی خاموشی اور رازداری سے سفر کیا تھا اور رات کے پہلے حصّے میں وہ کوہستانوں سے گھرے ہوئے اس جنگل میں داخل ہو گیا تھا جو شہر سے چند میل کے فاصلے پر تھا۔ یہاں نصرالدین نے لشکر کے پڑاؤ کے لیے خیمے نصب نہ کیے تھے۔ بلکہ چٹانوں کے اندر ایک

محفوظ جگہ اپنے لشکر کو جمع کر کے اس نے مرہٹوں، پنڈاروں اور بیڈروں کے حملے کا انتظار کرنا شروع کر دیا تھا۔

دو روز تک نصرالدین اپنے لشکر کے ساتھ انہی چٹانوں کے اندر گھات لگائے بیٹھا رہا۔ تیسرے روز مرہٹہ لشکر میں حرکت ہوئی اور رات کے پچھلے حصّے میں جس جنگل کے اندر نصرالدین گھات میں پڑا تھا اس کے اندر شہر کے جنوبی جانب پنڈارے اور مشرقی جانب بیڈرے آ کر خیمہ زن ہو گئے تھے جب کہ خود سوامی اپنے مرہٹہ لشکر کے ساتھ وہیں پڑا رہا جہاں اُس نے شروع دِن سے پڑاؤ کر رکھا تھا۔

اگلے روز جب سُورج طلوع ہو کر ذرا بلند ہُوا تو سوامی نے اپنے لشکر کے ساتھ شہر پر حملہ کیا۔ بیڈرے اور پنڈارے ابھی تک خاموش پڑے تھے شاید انہیں سوامی کی طرف سے کسی نئے حکم کا انتظار تھا لیکن نصرالدین نے کسی کا انتظار نہ کیا۔ جب سوامی نے شہر پر حملہ کیا تو وہ بھی اپنی کمین گاہ سے نکلا اور اپنے بائیں ہاتھ بیڈروں کو نظر انداز کرتا ہُوا وہ پنڈاروں پر حملہ آور ہُوا۔

چونکہ پنڈاروں اور بیڈروں کے درمیان ۲ میل کا فاصلہ تھا لہٰذا وہ باری باری بخوبی ان دونوں سے نمٹ سکتا تھا۔ پنڈاروں کو اس حملے کی قطعاً توقع نہ تھی اور پھر نصرالدین نے ان پر ایسا اچانک دھاوا بولا تھا کہ اُن پر بوکھلاہٹ طاری ہو گئی تھی۔ اپنے پہلے ہی اچانک حملے میں نصرالدین نے پنڈاروں کے ایک بڑے حصّے کو موت کے گھاٹ اُتار دیا اور زندہ بچنے والے ایسے خوفزدہ اور حراساں ہوئے کہ وہ اپنے خیمے اور پڑاؤ کی ہر چیز بھُول کر اس طرف بھاگے جہاں بیڈرے ٹھہرے ہوئے تھے۔ نصرالدین نے اُنہیں دم نہ لینے دیا وہ ان کے تعاقب میں رہا اور انہیں مارتا کاٹتا ان کی تعداد کم کرتا رہا۔

جب پنڈارے شور اور واویلا کرتے ہوئے بیڈروں کے کیمپ میں آ کر داخل ہوئے اور اُنہوں نے چلّا چلّا کر حملہ آوروں کی اطلاع دی، تو بیڈرے جنگ کے لیے تیار ہو گئے لیکن نصرالدین اس وقت تک ان کے اندر گھُس آیا تھا اور پنڈاروں

کے ساتھ اس نے بیڈروں کا بھی قتلِ عام شروع کر دیا

یہ دونوں وحشی اور مُردار خور قومیں گو پورے جنوبی ہند میں اپنی شجاعت اور بے جگری سے حملہ آور ہونے میں مشہور تھیں لیکن نصرالدین کی سرکردگی میں مُسلمانوں نے ان کے پاؤں تلے سے بساط کی مانند زمین کھینچ لی تھی۔ چند ساعتوں کی جنگ کے بعد ہی نصرالدین کے سامنے پنڈارے اور بیڈرے عاجز ہو کر بھاگ کھڑے ہوئے۔ اس وقت تک مرہٹوں کے پیشوا سوامی کو بھی نصرالدین کے اس حملے کی اطلاع ہو گئی تھی لہٰذا اس نے فوراً مرہٹوں کے ایک لشکر کو پنڈاروں اور بیڈروں کی مدد کے لیے روانہ کر دیا۔

جس وقت جنگل سے نکل کر پنڈارے اور بیڈرے نصرالدین کے آگے آگے شہر کی طرف بھاگ رہے تھے سوامی کا بھیجا ہُوا مرہٹہ لشکر جنگل کی طرف بھاگ رہا تھا۔ وہ نصرالدین کو چکمہ دے کر اس کی پُشت پر حملہ آور ہونا چاہتا تھا۔ نصرالدین اس لشکر کو دیکھ نہ سکا تھا عین اس وقت جب کہ وہ بڑی تیزی سے اپنے آگے آگے بدحواسی میں بھاگنے والے بیڈروں اور پنڈاروں کی تعداد کم کر رہا تھا، وہ مرہٹہ لشکر نصرالدین کی پُشت پر سے حملہ آور ہُوا۔ نصرالدین کو جونہی اس حملے کی خبر ہوئی اس نے فوراً تعاقب روک کر اپنا رُخ موڑا اور پُشت کی طرف سے آنے والے مرہٹوں پر جوابی حملہ کر دیا۔

جنگل اور شہر کے درمیان گھمسان کی جنگ چھِڑ گئی تھی۔ پنڈاروں اور بیڈروں کو خبر بھی ہو گئی تھی کہ نصرالدین کی پُشت سے مرہٹہ اس پر حملہ آور ہو چکے ہیں اس کے باوجود ان پر نصرالدین کی ایسی دہشت طاری ہو گئی تھی کہ مُڑ کر حملہ کرنے کی بجائے وہ شہر کی طرف بھاگتے چلے گئے تھے۔

پُشت کی طرف سے حملہ آور ہونے والے مرہٹہ لشکر نے مُسلمانوں کو کافی نقصان پہنچایا تھا۔ اپنے لشکر کو سنبھالتے سنبھالتے نصرالدین دُشمن کے اندر تک گھُس کر ایسی بے جگری سے لڑا تھا کہ اس نے اپنے لشکر کو جس میں پسپائی کے آثار پیدا ہو چکے تھے بڑے احسن طریقے سے سنبھال لیا تھا۔ اسی تگ و دو میں کسی دُشمن کا ایک آہنی نیزہ اس کی ران میں گھُس گیا تھا لیکن اس نے فوراً وہ نیزہ کھینچ کر پھینک دیا اور

اپنے لشکر کو یہ احساس نہ ہونے دیا کہ وہ زخمی ہو چکا ہے۔ اب وہ اپنے لشکر کو پوری طرح اپنی گرفت میں لے کر دشمن پر جان لیوا حملے کرنے لگا تھا۔

مرہٹے گو حملہ آور ہوتے وقت خوب بپھرے ہوئے اور پُرجوش تھے لیکن جب نصرالدین نے اپنے بکھرتے لشکر کو سنبھالنے کے بعد ان پر جوابی حملے شروع کیے، تو اُن کا سارا جنون اور سرگرمی دھوپ میں رکھی برف کی طرح پگھل گئے تھے۔ نصرالدین کو یہ بھی خطرہ تھا کہ بیڈرے یا پنڈارے پُشت پر سے اس پر حملہ نہ کر دیں لہٰذا اس نے بڑی تحریک اور برانگیختی کے ساتھ حملہ آور ہونا شروع کر دیا تھا۔ اس کی دیکھا دیکھی اس کا ہر سپاہی چنگاری سے شعلہ بن کر لپکنے لگا تھا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ مرہٹے اس حملے کی تاب نہ لا کر پسپا ہونے لگے۔ انہوں نے بھاگ کر اس طرف جانا چاہا جہاں سوامی اپنے لشکر کے ساتھ شہر پر حملے کر رہا تھا۔

لیکن مرہٹے اپنی خواہش کے مطابق بھاگ بھی نہ سکے۔ نصرالدین نے ان کی راہ روک لی تھی اور انہیں جنگل کی طرف بھاگنے پر مجبور کیا تھا۔ بدحواسی کے عالم میں مرہٹے ہر مصلحت کو پسِ پُشت ڈال کر جنگل کی طرف بھاگ کھڑے ہوئے جب کہ نصرالدین نے اُنہیں اپنے لشکر کے ساتھ اپنی آب دار تلواروں پر رکھ کر انہیں کاٹنا شروع کر دیا تھا۔

جنگل کے اندر اور اس پار تک تقریباً دس میل تک یہ تعاقب جاری رہا تھا یہاں تک کہ مسلمانوں نے ایک ایک مرہٹے کو قتل کر دیا۔ نصرالدین کا زخم گو کافی گہرا تھا اور اس کا کافی خون نکل چکا تھا تاہم اس نے ابھی تک اپنے کسی لشکری پر یہ ظاہر نہ ہونے دیا تھا کہ وہ زخمی ہے۔ تعاقب کے دوران ہی خون بند کرنے کی خاطر اس نے خرجین سے کپڑا نکال کر اپنی ران کے اس زخم پر کس کر باندھ دیا تھا تاہم زخم کے باعث اس پر نقاہت اور بخار کی سی کیفیت طاری ہو رہی تھی۔

دوسری طرف بھاگتے ہوئے پنڈاروں اور بیڈروں نے جب دیکھا کہ نصرالدین مرہٹوں کا تعاقب کرتا ہوا جنگل میں گھس گیا ہے تو انہوں نے اس موقع

کو غنیمت جانا۔ جس مقصد کے لیے سوامی نے انہیں اس طرف روانہ کیا تھا انہوں نے اس پر عمل کرنا شروع کر دیا۔

سب سے پہلے بیڈروں نے فصیل پر کمندیں پھینکیں اور اُوپر چڑھنا شروع کر دیا تھا۔ فصیل پر پہرہ دینے والے محافظوں نے اُنہیں روکنا چاہا لیکن پنڈاروں نے تیروں کی تیز بوچھاڑ مار کر پیچھے ہٹنے پر مجبور کر دیا تھا اور بیڈرے اُوپر چڑھتے رہے تھے۔ سردار خان کے لشکر کا زیادہ حصّہ چونکہ سوامی اور اس کے لشکر کے ساتھ اُلجھا ہُوا تھا لہٰذا اس طرف کا گنتی کا لشکر فصیل پر چڑھنے والے بیڈروں کو روک نہ سکا تھا۔ اس موقع پر سردار خان سے ایک غلطی ہوئی۔ اسے خبر تھی کہ نصرالدین مرہٹوں کے تعاقب میں جا چکا ہے اور شہر کے جنوب مغربی حصّے کی طرف پنڈارے اور بیڈرے بڑھ رہے ہیں لیکن اس نے اس طرف کے دفاع پر کوئی توجہ نہ دی تھی۔

جب فصیل کے جنوب مغربی حصّے پر بیڈرے جوق در جوق اُوپر چڑھنے لگے اور ان کی حفاظت کے لیے پنڈارے نیچے رہ کر تیر برساتے رہے تو اس طرف کے مسلمان محافظوں پر سکتہ سا طاری ہو گیا تھا۔ انہوں نے فوراً اس سانحہ کی اطلاع سردار خان کو کی لیکن اس وقت تک سارے بیڈرے فصیل پر چڑھ آئے تھے۔ سردار خان نے اپنے لشکر کے ایک حصّے کے ساتھ بیڈروں کو روکنا چاہا لیکن اُسے کامیابی نہ ہوئی بلکہ بیڈروں سے جنگ کے دوران وہ بُری طرح زخمی ہو گیا تھا۔

اس کے لشکر پر بیڈروں کا اس قدر خوف اور دہشت طاری تھی، کہ انہوں نے جب دیکھا کہ بیڈرے فصیل پر چڑھ آئے ہیں تو اُن کے ہاتھ پاؤں پھول گئے اور وہ بیڈروں کا مقابلہ کرتے ہوئے جی چُرانے لگے جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ بیڈروں نے فصیل سے نیچے اُتر کر شہر کا دروازہ کھول دیا، سوامی اپنے لشکر کے ساتھ سیلاب کی طرح شہر میں داخل ہُوا۔ بچے کھچے مسلمان سپاہی آن کی آن میں موت کے گھاٹ اُتار دیئے گئے شہر پر سوامی نے قبضہ کر لیا اور سردار خان کی بہادری سے متاثر ہو کر اسے اپنے لشکر

میں شامل کر لیا تھا۔

نصرالدین اپنے زخم اور اس کے باعث طاری ہونے والی نقاہت کو فراموش اور نظر انداز کرتا ہوا مرہٹہ لشکر کی مکمل تباہی کے بعد دوبارہ پلٹا۔ اس کا ارادہ تھا کہ وہ بیڈروں اور پنڈاروں کا خاتمہ کر کے نجکل شہر کو مرہٹوں کی یلغار اور ترکتاز سے محفوظ کر دے گا۔ اپنے لشکر کے ساتھ ابھی وہ جنگل کے اندر سے گزر ہی رہا تھا کہ سامنے کی طرف سے اسمٰعیل اپنا گھوڑا سرپٹ دوڑاتا ہوا آیا۔ وہی اسمٰعیل جو حیدر علی کا کارگر اور مہلک جاسوسوں میں سے ایک تھا۔ وہ سیاہ رنگ کے گھوڑے پر سوار تھا اور جنگل کے اندر نصرالدین اور اس کے لشکر کا راستہ روک کر کھڑا ہوا تھا۔ نصرالدین نے اس کے قریب اپنے گھوڑے کو روکتے ہوئے پوچھا "کیا تم میرے لیے سلطان کی طرف سے کوئی نیا حکم لے کر آئے ہو؟"

اسمٰعیل نے سنجیدگی سے کہا "میں آپ کو آپ کی سلامتی کا پیغام دینے آیا ہوں۔ آپ اب نجکل کی طرف جانے کی بجائے ماگری درگ کے جنگل کا رُخ کیجیے۔ جہاں ابھی تک سلطان حیدر علی گھات میں بیٹھے ہوئے ہیں۔"

"لیکن تم مجھے نجکل کی طرف بڑھنے سے کیوں روک رہے ہو؟" اسمٰعیل نے سر جھکاتے ہوئے کھوکھلی سی آواز میں خستہ لہجے میں کہا "نجکل ہمارے ہاتھ سے نکل چکا ہے اور مرہٹے اس پر قابض ہو چکے ہیں۔"

غم گین اور دلگیر آواز میں نصرالدین نے کہا "یہ تم کیا کہہ رہے ہو۔ مرہٹے اس قدر جلد کیونکر نجکل پر قابض ہو گئے ہیں۔ اگر میں یہ سمجھ لوں کہ میری غیر موجودگی میں نجکل کا قلعہ دار سردار خان گہری نیند سو گیا تھا تو بھی میرا دل نہیں مانتا کہ نجکل ہمارے ہاتھ سے نکل گیا ہے۔"

اسمٰعیل نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے نصرالدین کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "میں سلطان کی طرف سے جنگ کی خبریں حاصل کرتے نجکل کی طرف آیا تھا۔ یہاں آ کر مجھے خبر ہوئی جب آپ بیڈروں اور پنڈاروں کو شکست دینے کے بعد پشت

کی طرف سے حملہ آور ہونے والے مرہٹہ لشکر کا تعاقب کرتے ہوئے جنگل میں روپوش ہو گئے تو بیڈروں اور پنڈاروں نے اس وقفے سے فوراً فائدہ اٹھایا۔ بیڈرے کمندیں پھینک کر فصیل پر چڑھنے لگے اور پنڈارے نیچے رہ کر ان کی حفاظت کرتے رہے۔

سردار خان کو اس وقت خبر ہوئی جب بیڈرے فصیل پر چڑھ گئے۔ اس نے لشکر کے ایک حصے کے ساتھ بیڈروں کے سیلاب کو روکنا چاہا لیکن وہ ناکام رہا کیونکہ اس کے لشکری بیڈروں کو فصیل پر دیکھتے ہی جنگ کرنے سے جی چرانے لگے تھے۔ خود سردار خان اس جنگ میں لڑتا ہوا زخمی ہو گیا۔ بیڈروں کو شہر کے اندر کسی بھی مزاحمت کا سامنا نہ کرنا پڑا اور انہوں نے فصیل سے نیچے اتر کر شہر کا دروازہ کھول دیا جس کے نتیجے میں عوامی اپنے لشکر کو لے کر شہر میں داخل ہو گیا۔ اس نے شہر کے سارے مسلح جوانوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا ہے۔ شہر پر اس نے قبضہ کر لیا ہے اور قلعہ دار سردار خان کو اس نے اپنے لشکر میں شامل کر لیا ہے۔"

نصرالدین چند ثانیوں تک خاموش اور بے حس سا رہا پھر اس نے کربناک لہجے میں کہا "کاش سردار خان نے تھوڑی دیر ہی میرا انتظار کیا ہوتا۔ اگر وہ کچھ دیر تک بیڈروں اور پنڈاروں کو روکے رکھتا تو یقیناً حالات ہماری گرفت میں ہوتے اور آج میں یوں بدحالی اور رنجیدہ کیفیت میں جنگل کے اندر کھڑا نہ ہوتا۔ میں اب کس منہ سے سلطان کا سامنا کر سکوں گا۔"

اسمٰعیل نے اس کی ڈھارس بندھاتے ہوئے کہا "آپ فکرمند نہ ہوں نجکل شہر سے کچھ لوگ پہلے ہی بھاگ کر جا چکے ہیں وہ آپ سے پہلے ہی سلطان کو مطلع کر دیں گے کہ نجکل شہر کا سقوط کیسے ہوا۔" اچانک اسمٰعیل کی نظر اس خون آلود کپڑے پر پڑ گئی جسے نصرالدین نے کس کر اپنی ران کے زخم پر باندھ رکھا تھا۔ نصرالدین کی طرف دیکھتے ہوئے اس نے غم گین اور دل گیر سی آواز میں کہا "اے امیر! آپ اور آپ کے لشکری کے لباس دشمن کے خون سے تر ضرور ہیں لیکن آپ کی ران پر بندھا ہوا یہ کپڑا کیا اس سانحہ کا اظہار نہیں کہ آپ زخمی ہیں۔"

نصرالدین نے شاید درد کی شدت کے باعث آنکھیں بند کر لیں اور دُکھ بھرے لہجے میں اُس نے کہا "میں زخمی ضرور ہوں لیکن ران کا یہ زخم اس زخم سے تو زیادہ تکلیف دہ نہیں ہے جو نجکل کے سقوط سے میرے دِل پر لگا ہے۔" اسمٰعیل نے فوراً نیچے اُتر کر ران پہ بندھا ہوا کپڑا کھولا۔ اس نے دیکھا وہ ایک کافی گہرا زخم تھا۔ اپنے گھوڑے کی زین سے لٹکتی چھاگل سے پانی لے کر اس نے پہلے زخم کو صاف کیا پھر اس پر مرہم لگا کر پٹی باندھ دی تھی۔ نصرالدین ابھی تک اپنی آنکھیں بند کیے ہوئے تھا اسمٰعیل نے اس کا بازو تھامتے ہوئے کہا۔

"اے امیر! آپ کو تیز بخار ہو رہا ہے۔ ہمیں فوراً یہاں سے کوچ کر جانا چاہیے۔ اگر دُشمن نے قلعے سے نکل کر ہمارا تعاقب کیا تو ہمارے لیے نقصان دہ ہو گا"۔

نصرالدین نے اثبات میں سَر ہلاتے ہوئے کہا "تم ٹھیک کہتے ہو یہاں ٹھہرنے کا اب کوئی فائدہ نہیں" اس کے ساتھ ہی نصرالدین نے اپنے گھوڑے کو دائیں طرف کر ایڑھ لگا دی اور اپنے لشکر کے ساتھ وہ ماگری درگ کے جنگل کا رُخ کر رہا تھا جس کے اندر حیدر علی نے پڑاؤ کر رکھا تھا۔

سورج اپنے پیچھے اُفق کے حاشیوں کے ساتھ ساتھ رنگ و نکہت کی برسات کرتا ہوا کافی دیر کا غروب ہو چکا تھا۔ فنا پذیری کی عادی سنگین جوان رات دن کی روشنی اور نور کو یوں نگل چکی تھی جس طرح پاتال مُردوں کو نگل جاتا ہے۔ ہر چیز خاموش اور یوں چُپ تھی گویا پوری کائنات کسی ردِعمل اور بازگشت کی منتظر ہو۔ خولہ سمیتا اور صالحہ نے مغرب کی نماز اکٹھے پڑھی تھی۔

سمیتا خولہ کے ہاتھوں اسلام قبول کر چکی تھی اور وہ ان دونوں کے ساتھ باقاعدگی سے نماز ادا کرتی تھی۔ نماز کے بعد انہوں نے کھانا کھایا اور اکٹھی بیٹھ کر باتیں کر رہی تھیں کہ حویلی کے بیرونی دروازے پر دستک ہوئی۔ سمیتا حجاب طلب نگاہوں سے صالحہ کی طرف دیکھنے لگی تھی۔ اِتنے میں خولہ کی آواز کمرے میں ابھری وہ صالحہ کو

مخاطب کر کے بولی تھی۔

"صالحہ! صالحہ! کیا تم نے سُنا کسی نے دروازے پر دستک دی ہے۔ دیکھو تو کون آیا ہے۔ خدا کرے آنے والا میرا بیٹا ہو اور جس مہم پر وہ گیا ہوا ہے اللہ کرے وہ اس میں کامیاب و فوز مند لوٹا ہو۔"

صالحہ خاموشی سے اُٹھ کر باہر چلی گئی۔ جب اس نے حویلی کا دروازہ کھولا تو سامنے اسمٰعیل اپنے گھوڑے کی باگ پکڑے کھڑا تھا۔ صالحہ نے فکر مند ہو کر پوچھا "تم رات کے اس وقت خیریت سے تو آئے ہو بیٹے! اور نصرالدین کہاں ہے"؟

اسمٰعیل حویلی میں داخل ہوتا ہوا بولا "مجھے امیر کی ماں کے پاس لے چلیے۔ میں جو کچھ کہنا چاہتا ہوں آپ دونوں کی موجودگی میں کہوں گا بلکہ تینوں کی موجودگی میں کیونکہ سمیتا بہن بھی یہیں ہو گی۔ اگر میں نے علیحدہ علیحدہ تم سب سے کچھ کہنا چاہا۔ تو میرا وقت ضائع ہو گا۔ جب کہ میں بہت جلد یہاں سے کوچ کر جانا چاہتا ہوں"۔

صالحہ حویلی کا دروازہ بند کر کے اندرونی حصّے کی طرف بڑھی۔ اپنے گھوڑے کو صحن میں کھڑا کر کے اسمٰعیل بھی اس کے ساتھ ہو لیا تھا۔

صالحہ اس کمرے میں آئی جس میں سے وہ اُٹھ کر گئی تھی اور کمرے میں داخل ہوتے ہوئے اس نے خولہ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا "خاتون! اسمٰعیل آیا ہے۔ یہ آپ سے کچھ کہنا چاہتا ہے۔ میں نے اس سے پوچھا لیکن اس نے نہ بتایا"۔

خولہ نے پریشان لہجے میں کہا "تم کیا کہنے آئے ہو اسمٰعیل بیٹے! اور کیا تمہیں خبر ہے اِن دِنوں نصرالدین کہاں ہے؟"

اسمٰعیل نے کھنکار کر اپنا گلا صاف کرتے ہوئے کہا "میں اُن کے متعلق ہی آپ سے کچھ کہنا چاہتا ہوں۔ وہ ایک جنگ میں زخمی ہو گئے تھے۔ زخم کا بروقت علاج اور دیکھ بھال نہ ہونے کے سبب انہیں تیز بخار بھی ہو گیا اور اس وقت وہ ماگری درگ کے جنگل میں سلطان حیدر علی کے طبیب کے زیر علاج ہیں"۔

نصرالدین کے زخمی ہونے کا سُن کر سمیتا کا رنگ فق ہو گیا تھا۔ اس کے چہرے

پر تار تار دامن جیسی حالت طاری ہوگئی تھی اور اس کی کیفیت ایسی ہوگئی تھی جیسے کسی نے اس کے دامن اس کی جھولی میں آگ اور انگارے ڈال دیے ہوں۔

خولہ نے اپنے آپ کو سنبھالتے ہوئے کہا۔ "میرا تلواروں کی چھاؤں اور تیروں کی بوچھاڑ میں لڑنے والا فرزند جنگ میں کیسے اور کہاں زخمی ہوا۔ تم بیٹھ جاؤ اور مجھے پورے واقعات کہو"۔ اسمٰعیل بیٹھ گیا پھر وہ ان تینوں سے بیڈروں، پنڈاروں اور مرہٹوں کی نصرالدین کے ہاتھوں شکست، نصرالدین کے زخمی ہونے اور بنگلور شہر کے سقوط کی پوری داستان سنا رہا تھا۔

جب وہ خاموش ہوا تو خولہ نے پوچھا۔ "اس کے زخم خطرناک اور تشویش کا باعث تو نہیں"۔ اسمٰعیل نے انہیں تسلی دیتے ہوئے کہا۔ "ایسی کوئی بات نہیں۔ زیرِ علاج ہیں اور بہت جلد ٹھیک ہو جائیں گے۔ میں ہیبت جنگ کے نام کا ایک اہم پیغام لے کر آیا تھا۔ سوچا واپس جانے سے پہلے آپ سے بھی مل لوں حالانکہ امیر نے مجھے منع کیا تھا کہ میں آپ کو ان کے زخمی ہونے کی اطلاع نہ کروں اس کے باوجود میں نے آپ سے سب کچھ کہہ دیا ہے"۔

خولہ نے فکرمند ہو کر کہا۔ "مرہٹوں کی ترکتاز بڑھتی جا رہی ہے کہیں ایسا نہ ہو ایک روز وہ سرنگاپٹن کو آگھیریں اور ہاں تم ہیبت جنگ کے پاس کس نوعیت کا پیغام لے کر آئے تھے"۔

اسمٰعیل نے اپنی لاعلمی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ "وہ پیغام کاغذ پر تحریر شدہ تھا اور [illegible] کا مجاز نہ تھا۔ لہذا وہ کاغذ کھول کر دیکھے بغیر [illegible] ہیبت [illegible] تھا"۔ اس کے ساتھ ہی اسمٰعیل کھڑا ہوتا ہوا بولا۔ "اب مجھے اجا[illegible] [illegible]یں"۔

[illegible] بولتے ہوئے کہا۔ "ماں! اگر تم اجازت دو تو میں اسمٰعیل کے ساتھ چلی جاؤں، وہ زخمی اور بیمار ہیں۔ انہیں کسی کی دیکھ بھال اور تیمارداری کی ضرورت ہوگی"۔ خولہ خاموش رہ کر کچھ سوچتی رہی۔ سمیتا آگے بڑھی اور خولہ سے لپٹ کر اس کے کان میں سرگوشی کرتے ہوئے کہا۔ "ماں! تم مجھے ان کا ساتھی چن چکی ہو۔ یہ کہاں کا دستور ہے کہ ایک ساتھی تو زخمی اور بیمار ہو اور دوسرا اس کی خبرگیری کیے بغیر گھر پڑا رہے"۔

خولہ نے سمیتا کی گفتگو سے متاثر ہوتے ہوئے کہا۔ "میں تجھے اکیلی کیونکر بھیج دوں۔ چل تو اٹھ کر تیاری کر۔ اپنے کچھ فالتو کپڑے ساتھ لے لے۔ اسمٰعیل تم اصطبل میں جاؤ اور ایک گھوڑے پر زین ڈالو۔ ہم دونوں ماں بیٹی تمہارے ساتھ یہاں سے روانہ ہوں گی"۔

سمیتا اٹھی اور بھاگتی ہوئی دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ اسمٰعیل نے احتجاج کرنے کے انداز میں۔ "میں آپ دونوں کو کیونکر اپنے ساتھ لے جا سکتا ہوں۔ مگری درگ کے جنگل سے روانہ ہونے سے قبل میں انہیں ملا تھا اور انہوں نے مجھے سختی سے منع کیا تھا کہ میری ماں کو میرے زخمی ہونے کی اطلاع مت کرنا۔ اب جب کہ میں آپ کو ساتھ لے کر ان کے پاس جاؤں گا تو کیا وہ مجھ سے خفا نہ ہوں گے اور امیر کی ناراضگی میری بدقسمتی کا سبب ہوگی"۔

خولہ نے اس کی ڈھارس بندھاتے ہوئے کہا۔ "تم فکرمند نہ ہو، نصرالدین تم سے خفا نہ ہوگا، میں اسے سمجھا لوں گی۔ تم جانتے ہو وہ اپنی ماں کی کوئی بات نہیں ٹالتا پھر میری موجودگی میں کیونکر وہ تم سے ناراضگی کا اظہار کرے گا۔ تم جاؤ گھوڑے پر زین ڈالو"۔ اسمٰعیل سر جھکائے باہر نکل گیا تھا۔

تھوڑی ہی دیر بعد سمیتا تیار ہو کر آ گئی۔ اس نے ایک گٹھڑی میں اپنے اور خولہ کے کچھ کپڑے باندھ لیے تھے جب کہ دوسری چھوٹی سی گٹھڑی میں اس نے نصرالدین کے لیے کچھ کھانے کی چیزیں باندھ لی تھیں۔ قریب آ کر اس نے خولہ کا بازو پکڑ کر اٹھاتے ہوئے کہا۔ "آؤ ماں چلیں۔ میں نے اپنی تیاری کر لی ہے اسمٰعیل بھی گھوڑے پر زین ڈال چکا ہوگا"۔

خولہ سمیتا کے سہارے کھڑی ہوئی پھر وہ کمرے سے نکل کر صحن میں آئیں جہاں

بھی ان کے ساتھ ساتھ تھی۔ اسمٰعیل اصطبل سے ایک گھوڑے پر زین ڈالنے کے بعد اسے وہاں لے آیا جہاں اس کا اپنا گھوڑا کھڑا تھا۔ سمیتا نے آگے بڑھ کر اسمٰعیل سے اس گھوڑے کی باگ لے لی۔ پہلے اس نے دونوں گٹھڑیاں زین سے لٹکتی چرمی خرجین میں ڈالیں۔ ایک بار پیار سے اس نے گھوڑے کی پیٹھ پر ہاتھ پھیرا پھر خولہ کو اس نے سہارا دے کر گھوڑے پر سوار کرا دیا تھا۔

صالحہ وہاں کھڑی انہیں افسردگی سے دیکھے جا رہی تھی۔ سمیتا خود بھی گھوڑے پر بیٹھ گئی اور صالحہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "بوا! ہم زیادہ دن وہاں نہ ٹھہریں گی۔ تم اکیلی گھبرا نہ جانا۔ جونہی ہم نے دیکھا ان کی حالت بہتر ہے ہم لوٹ آئیں گی۔" صالحہ نے دکھتی آواز میں کہا۔ "ربِ عظیم اس مجاہد کو کامل صحت عطا کرے گا۔ میں بڑی بے تابی سے تم دونوں کی واپسی کا انتظار کروں گی، اس امید کے ساتھ نہیں میری تنہائی کٹ جائے گی۔ بلکہ اس لیے کہ تب تم دونوں لوٹ کر مجھے زخمی نصرالدین کی صحت مندی کا مژدہ سناؤ گی۔"

اسمٰعیل نے اپنے گھوڑے کو ایڑ لگا دی تھی اور اس کے پیچھے پیچھے سمیتا نے بھی اپنے گھوڑے کو مہمیز لگا کر ہانک دیا تھا۔ صالحہ حویلی کے بیرونی دروازے تک ان کے ساتھ آئی۔ وہ دروازے پر کھڑی ہو کر انہیں دیکھتی رہی۔ جب وہ اپنے گھوڑوں کو بھگاتے ہوئے رات کی تاریکی میں روپوش ہو گئے تو وہ دروازہ بند کر کے اندر چلی گئی تھی۔

رات اپنے اختتام کو پہنچ رہی تھی۔ پُرہول سناٹے میں جہاں پہلے کاٹ کھانے والی خاموشی طاری تھی وہاں اب فضاؤں میں کبھی کبھی اور کہیں کہیں جنگلی پرندے رب کی حمد اور وحدانیت کے گیت گاتے سنائی دینے لگے تھے۔ خولہ اور سمیتا کو لے کر اسمٰعیل ماگری درگ کے جنگل میں حیدر علی کے پڑاؤ میں داخل ہو رہا تھا۔ وہ خیموں میں داخل ہونے لگے کسی پہریدار نے چلاتے ہوئے اپنی غضب ناک آواز میں کہا۔ "ٹھہرو، کون ہے۔"

اسمٰعیل نے بڑے ٹھہراؤ اور سکون سے کہا۔ "میں اسمٰعیل ہوں اور میرے ساتھ امیر نصرالدین کے اہلِ خانہ ہیں۔" پہریدار خاموش رہا اور اسمٰعیل ان دونوں کو لے کر آگے بڑھتا رہا یہاں تک کہ وہ ایک خیمے کے سامنے رُک گیا۔ پہلے وہ خود نیچے اُترا پھر خولہ اور سمیتا کو نیچے اُترنے میں مدد دی۔ دونوں گھوڑوں کو اس نے خیمے کی طناب سے باندھ دیا اور ان دونوں کو باہر ہی کھڑا کر کے وہ خیمے میں داخل ہوا۔ اندر فرش پر لگے ایک بستر پر نصرالدین سو رہا تھا۔ اس کے قریب ہی دو سپاہی گہری نیند سوئے ہوئے تھے جب کہ ایک بیٹھا جاگ رہا تھا۔ وہ تینوں سپاہی شاید باری باری نصرالدین کی دیکھ بھال پر معمور تھے۔

اسمٰعیل کو دیکھتے ہی جاگنے والا سپاہی کھڑا ہو گیا۔ وہ کچھ کہنا چاہتا تھا کہ اسمٰعیل نے پہلے ہی اسے مخاطب کر کے کہا۔ "اپنے دونوں ساتھیوں کو جگاؤ۔" اس سپاہی نے فوراً آگے بڑھ کر اپنے دونوں ساتھیوں کو جگا دیا۔ جب وہ اُٹھ کر بیٹھ گئے تو اسمٰعیل نے کہا۔ "تم تینوں اپنے خیمے میں جا کر اب آرام کرو۔ میرے ساتھ امیر نصرالدین کے اہلِ خانہ آئے ہیں۔ تم جاؤ تاکہ میں انہیں اندر لاؤں اور سنو جب تک میں نہ کہوں طبیب کے سوا کوئی اس خیمے میں نہ آئے۔"

وہ تینوں سپاہی خیمے سے باہر نکل گئے۔ اسمٰعیل مڑا اور خیمے سے نکل کر وہ خولہ اور سمیتا کو اندر لانا چاہتا تھا کہ اس کی پشت سے نصرالدین کی کڑکتی ہوئی آواز بلند ہوئی۔ "ٹھہرو اسمٰعیل"! ——— اسمٰعیل جہاں تک وہیں رُک گیا اور مڑ کر نصرالدین کی طرف دیکھنے لگا تھا۔ تھوڑی دیر قبل بستر پر لیٹا ہوا نصرالدین اب اُٹھ کر بیٹھ چکا تھا۔ اسمٰعیل حیرت اور پریشانی سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

نصرالدین نے غصیلی آواز میں پوچھا۔ "تم کسے اپنے ساتھ لائے ہو؟" اسمٰعیل نے گردن جھکاتے ہوئے بدحواس سی آواز میں کہا۔ "میرے ساتھ آپ کی مادرِ محترم اور سمیتا بہن آئی ہیں۔" نصرالدین نے غضب ناک ہو کر پوچھا۔ "کیوں؟ میں نے تمہیں کہا نہ تھا کہ میرے زخمی ہونے کی اطلاع میرے گھر نہ کرنا میری

ماں پریشان ہوگی ۔"

"اسمٰعیل نے ہکلاتے ہوئے کہا۔" اے امیر! مَیں نے انہیں آنے پر مجبور نہیں کیا وہ خود میرے ساتھ آئی ہیں ۔ مَیں نے تو انہیں آنے سے روکا بھی تھا۔" نصرالدین نے پھر غصیلی آواز میں کہا۔ تم نے انہیں میرے زخمی ہونے کی خبر دی ہوگی تب ہی وہ دونوں ضد کرکے تمہارے ساتھ آئی ہیں نا ۔" اسمٰعیل کے پاس اپنی خلاصی کے لیے کوئی مناسب جواب نہ تھا ۔ لہٰذا اس نے فوراً آخری حربہ آزمایا اور اونچی آواز میں اس نے کہا ۔" سمیتا بہن! ماں کو لے کر اب اندر آجاؤ۔"

سمیتا خولہ کو سہارا دیتی ہوئی اندر لائی ۔ خیمے میں آتے ہی خولہ نے سے ڈانٹتے ہوئے نصرالدین کو مخاطب کرکے کہا ۔" تم اسمٰعیل پر کیوں خفا ہو رہے ہو بیٹے! مَیں اپنی مرضی سے آئی ہوں ۔ تم نے اسے منع کیوں کیا تھا کہ تمہارے زخمی ہونے کی اطلاع نہ کرے ۔ اس نے ٹھیک کیا مجھے خبر دی، اب اس سے کو باز پرس نہ کرنا ۔"

نصرالدین خاموش رہا۔ سمیتا نے خولہ کو لا کر اس کے قریب بٹھا دیا اور خود بھی اس کے پہلو میں بیٹھ گئی ۔ خولہ نے پیار سے نصرالدین کا سر اپنی گود میں لیتے ہوئے اس کی پیشانی چومی پھر اس کے سر پہ ہاتھ پھیرتے ہوئے اُس نے کہا ۔" تمہیں بخار تو نہیں ہے بیٹے! پر تمہاری ران کا زخم کیسا ہے ؟"

"پہلے سے بہت بہتر ہے ماں! اُمید ہے چند یوم تک بالکل مندمل ہو جائے گا"۔۔۔۔۔۔۔۔" تم کیسے بے حرص ہوتے جا رہے ہو بیٹے! تم نے اسمٰعیل سے یہ کیوں کہا۔" میری ماں کو خبر نہ کرنا ۔" نصرالدین نے شرمندگی میں کہا۔" ماں مَیں جانتا تھا تم پریشان ہوگی پھر تمہاری بینائی نہیں ہے یہاں آتے ہوئے تمہیں دشواری ہوتی ۔"

خولہ نے اپنا بایاں بازو پھیلا کر پہلو میں بیٹھی سمیتا کو اپنے ساتھ لپٹاتے ہوئے کہا ۔" کون کہتا ہے میری بینائی نہیں اِدھر دیکھو میری بینائی میرے ساتھ بیٹھی ہے ۔ خیمے کے اندر چربی سے جلتے چراغ کی مدھم اور غبار آلود روشنی میں نصرالدین نے سمیتا کی طرف دیکھا اور جواب میں سمیتا نے شرماتے ہوئے اپنی گردن خم کر لی تھی ۔

خولہ کو اچانک جیسے کچھ یاد آگیا ہو ۔ اس نے نصرالدین سے کہا۔" بیٹے! مَیں تمہیں بتانا بھول گئی کہ سمیتا مسلمان ہو چکی ہے ۔ نصرالدین نے چونکتے ہوئے کہا۔" مَیں اس پر سمیتا کو مبارک باد دیتا ہوں ۔" سمیتا نے اپنی جھکی ہوئی گردن سیدھی کی اور نصرالدین کی طرف میٹھی نگاہوں سے دیکھتے ہوئے اس نے کہا ۔" مبارک باد تو ماں کو دیجیے جس نے مجھے دین کی اس راہ پر لا کھڑا کیا ہے جہاں میرا ذہن آسودہ اور ضمیر مطمئن ہے ۔"

سمیتا کے خاموش ہونے پر خولہ نے کہا ۔" بیٹے! تیری غیر موجودگی میں ایک فیصلہ مَیں نے کیا ہے اور مجھے اُمید ہے میرا بیٹا اپنی ماں سے اتفاق کرے گا ۔" نصرالدین نے بڑی عاجزی سے کہا ۔" تمہارا ہر فیصلہ میرے لیے حکم کا درجہ رکھتا ہے ماں! کہو تم نے کیسا فیصلہ کیا ہے ۔"

خولہ نے ایک بار پھر سمیتا کو اپنے ساتھ لپٹاتے ہوئے کہا ۔" مَیں سمیتا کو تمہاری زندگی کا ساتھی بنانے کا فیصلہ کر چکی ہوں ۔ کہو، تمہیں اعتراض تو نہ ہوگا ۔"

سمیتا بے چاری خولہ کی گود میں سمٹ کر شرم سے دہری ہو گئی تھی ۔ اسمٰعیل سر جھکائے ہلکے ہلکے مسکرا رہا تھا ۔ نصرالدین نے بھی اپنے سکون اور خوشی کو دباتے ہوئے کہا ۔" جب تم فیصلہ کر ہی چکی ہو ماں! تو مَیں کیسے اور کیونکر اس فیصلے کو رد کرنے کی جسارت کر سکتا ہوں ۔"

اتنے میں لشکر کے اندر فجر کی اذان سنائی دی ۔ اسمٰعیل نے خیمے میں رکھی چھاگلوں کی طرف اشارہ کرکے کہا ۔ سمیتا بہن! ان چھاگلوں میں پانی ہے ۔ تم ماں کا وضو کراؤ اور نماز پڑھو پھر اس نے نصرالدین کی طرف دیکھتے ہوئے کہا ۔ اے امیر! مَیں فجر کی نماز کے بعد پھر حاضر ہوتا ہوں ۔" نصرالدین نے جب اثبات میں گردن ہلا دی تو اسمٰعیل مڑ کر باہر نکل گیا ۔

نصرالدین نے بیٹھے ہی بیٹھے ننگی زمین پہ ہاتھ پھیرتے ہوئے تیمم کیا اور

بیٹھے ہی بیٹھے قبلہ رُو ہو کر نماز ادا کرنے لگا تھا۔ سمیتا اور خولہ بھی اُٹھ کر نماز کی تیاری کرنے لگی تھیں۔

اپنے لشکر کے ساتھ فجر کی نماز کے بعد اسمٰعیل جب جُوتے پہن کر خیموں کی طرف جانے لگا تو دائیں طرف سے حیدر علی اس کے سامنے آ کھڑا ہُوا۔ اسمٰعیل کچھ کہنے والا تھا کہ حیدر علی پہلے ہی بول پڑا "کیا تم ہیبت جنگ کو میرا پیغام پہنچا آئے ہو؟" اسمٰعیل نے مؤدب ہوتے ہوئے کہا۔ "سلطان محترم! مَیں ہیبت جنگ کو پیغام پہنچا کر آج رات کے پچھلے پہر لشکر میں داخل ہُوا ہوں۔ میرے ساتھ امیر نصرالدین کی ماں اور ستیہ جیت کی بہن سمیتا بھی آئی ہیں۔ امیر نصرالدین کی ماں سمیتا کے ساتھ امیر کی شادی کرنے کا فیصلہ کر چکی ہیں اس لیے کہ وہ لڑکی مسلمان ہو چکی ہے۔"

حیدر علی نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "وہ بڑی مدبّر اور دانا خاتون ہے۔ اس نے درست فیصلہ کیا ہے۔ وہ لڑکی ہی نصرالدین کو پسند نہیں کرتی بلکہ نصرالدین بھی اس میں دل چسپی لیتا ہے لہٰذا یہ فیصلہ درست ہُوا ہے۔ مَیں سیدھا نصرالدین کے خیمے میں جاتا ہوں۔ تم ان تینوں کا کھانا اور طبیب کو لے کر وہاں پہنچو۔ اتنی دیر تک میں اس معزز خاتون سے مِلتا ہوں جو مجھے بہن جیسی عزیز اور جس کے خاندان کے میرے خاندان پر گرانبار احسانات ہیں۔ اس دَور میں اس خاتون کی کیا شان تھی جب وہ اپنے شوہر کے پہلو بہ پہلو میرے چچا فتح علی کے لشکر میں دشمن کے خلاف جنگوں میں حصّہ لیا کرتی تھی۔ خدا کی قسم! اکثر وہ خاتون دشمن پر حملہ آور ہونے میں مردوں کو بھی پیچھے چھوڑ جایا کرتی تھی۔ شوہر کی بے وقت موت نے اسے اندھا کر دیا اور وہ لاچار ہو کر رہ گئی۔ بہرحال نصرالدین نے اپنے باپ اور ماں دونوں ہی کی کسر پوری کر دی ہے۔ رب انام اسے صحت اور شفا دے۔" حیدر علی آگے بڑھتا ہُوا بولا۔ "میں سیدھا ان کی طرف جاتا ہوں۔ تم فوراً ان کا کھانا اور طبیب لے کر آؤ۔"

نماز سے فارغ ہو کر نصرالدین، سمیتا اور خولہ بستر پر بیٹھے آپس میں باتیں کر

رہے تھے کہ حیدر علی خیمے کے باہر ہی سے کھانستا ہُوا اندر داخل ہُوا۔ نصرالدین چُپ ہو گیا۔ خولہ نے اعتراض کرتے ہوئے کہا "تم باتیں کرتے کرتے اچانک خاموش کیوں ہو گئے ہو بیٹا!" نصرالدین نے دھیمی سی آواز میں کہا۔ "سلطان حیدر علی آئے ہیں ماں!" حیدر علی نے اتنی دیر تک آگے بڑھ کر سمیتا کے سر پہ ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ "اس خیمے میں اپنی بیٹی کو مَیں خوش آمدید کہتا ہوں۔"

پھر حیدر علی نے خولہ کو مخاطب کر کے کہا۔ "اے بہن! مَیں حیدر علی ہوں، تمہارا بھائی حیدر علی۔" خولہ نے دعائیہ انداز میں کہا۔ "اے بھائی! ربِ عظیم تمہیں بے لگام مرہٹوں کے خلاف کامیاب و کامران رکھے۔ یہ تو کہو جنگ میں میرے بیٹے کی کارکردگی کیسی ہوتی ہے۔"

حیدر علی دوسرے بستر پر بیٹھ گیا اور مسکراتے ہوئے کہا۔ "نصرالدین اپنے باپ سے بھی کہیں زیادہ حوصلہ مند، زیرک اور جنگی ممارست میں اعلیٰ و ارفع ثابت ہُوا ہے جنگوں میں میرے ساتھ اس کی کارکردگی ان کارناموں سے کہیں زیادہ بہتر اور مربوط ہے جو تم اور تمہارے شوہر نے میرے چچا فتح علی کے لشکر میں مرہٹوں کے خلاف انجام دیئے۔"

خولہ نے دُعا کے انداز میں ہاتھ بلند کرتے ہوئے کہا۔ "مولا کریم کا صد احسان کہ اس نے میرے بیٹے کو میری خواہشوں پہ پورا اُترنے کی توفیق عطا فرمائی۔"

حیدر علی جواب میں کچھ کہنا چاہتا تھا کہ اسمٰعیل خیمے میں داخل ہوا۔ اس نے نصرالدین، سمیتا اور خولہ کا کھانا اُٹھا رکھا تھا اور اس کے ساتھ طبیب بھی تھا۔ حیدر علی کھڑا ہُوا اور طبیب سے کہا۔ "ذرا پٹی کھولو، مَیں دیکھوں زخم کہاں تک مندمل ہُوا ہے۔"

طبیب نے ہاتھ میں پکڑا ہُوا اپنا چرمی خریطہ ایک طرف رکھا اور نصرالدین کی پٹی کھول کر زخم حیدر علی کو دکھاتے ہوئے کہا۔ "زخم کافی حد تک مندمل ہو چکا ہے اب یہ پوری طرح ٹھیک ہونے میں صرف چند یوم لے گا۔"

خولہ نے سمیتا کو مخاطب کر کے کہا۔ "سمیتا! سمیتا! ذرا تم خود زخم دیکھ

کر مجھے بتاؤ کہ زخم کہاں ہے۔ گہرائی میں کیسا ہے اور کہاں تک ٹھیک ہوا ہے"
سمیتا کھڑی ہو گئی اور نصرالدین کے بالکل اوپر آ کر اس نے نیچے جھک کر
چند ثانیوں تک بغور زخم کو دیکھا پھر خولہ سے کہا۔ "ماں! زخم کافی گہرا ہے۔ دائیں
ران میں ہے لیکن اب مندمل اور ٹھیک ہوتا نظر آ رہا ہے"۔

سمیتا دوبارہ جب خولہ کے پاس آ کر بیٹھ گئی تو خولہ نے سرگوشی میں پوچھا
"سمیتا بیٹی! کیا کوئی طبیب ہے جو زخم کی مرہم پٹی کرنے لگا ہے"۔ سمیتا نے
سر خولہ کے کندھے پر لے جاتے ہوئے کہا۔ "ہاں ماں! طبیب ہی ہے اور پرانی پٹی
کھول کر نئی پٹی کرنے لگا ہے"۔

"ذرا اس سے پوچھو تو میرا بیٹا کب تک چلنے پھرنے لگے گا"۔ سمیتا نے
طبیب کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ "میرے محترم! میری ماں پوچھتی ہیں یہ کب
تک چلنے پھرنے لگیں گے"۔

طبیب نے ان کی ڈھارس بندھاتے ہوئے کہا۔ "فکر اور اندیشے کی ایسی
کوئی بات نہیں ہے۔ انشاء اللہ امیر ہفتہ عشرہ تک بھاگتے دوڑنے لگیں گے"
دعائیہ انداز میں اپنے دونوں ہاتھ اوپر اٹھاتے ہوئے خولہ نے کہا "میرا رب ایسا
کرے گا"۔

طبیب نے پہلے زخم پر سفوف چھڑک کر خوب صاف کیا پھر نئی مرہم لگا
اس نے کس کر پٹی باندھ دی تھی۔ طبیب جب فارغ ہوا تو حیدر علی نے کہا۔ "ذرا
اس کا بخار بھی دیکھئے"۔ طبیب نے اپنے دائیں ہاتھ کی دو انگلیاں نصرالدین کی
پر رکھ دی تھیں۔ چند ثانیوں تک وہ نبض کا جائزہ لیتا رہا پھر مطمئن ہو کر کہا۔
"امیر کو بخار نہیں ہے اور نہ ہی اب اس زخم کے باعث بخار ہو گا"
طبیب اپنا چرمی تھیلا تھام کر کھڑا ہو گیا۔ حیدر علی نے خولہ کو مخاطب کر کے کہا۔ "ا
خواہر محترم! آپ تینوں کا کھانا پڑا ٹھنڈا ہو رہا ہے آپ تینوں کھانا کھائیں، میں
دوبارہ آپ کے پاس حاضر ہوں گا"۔ حیدر علی اور اسمٰعیل طبیب کے ساتھ

باہر نکل گئے۔ نصرالدین، سمیتا اور خولہ اکٹھے بیٹھ کر کھانا کھا رہے تھے۔

مرہٹے ایک کے بعد دوسرا شہر فتح کرتے ہوئے سرنگاپٹن کی طرف بڑھتے رہے
نکل کے بعد انہوں نے بالاپور کلاں اور خورد دونوں کو زیر کر لیا۔ سوامی اصل میں اس حکمت
عملی پر گامزن تھا کہ پہلے سرنگاپٹن کے اطراف میں تمام قلعوں اور شہروں پر قبضہ کر لیا جائے
اور آخر میں حیدر علی کو محصور اور مجبور کر کے اس پر آخری اور فیصلہ کن ضرب لگائی جائے۔
بالاپور میں حیدر علی کی طرف سے ایک جرنیل بدرالزمان خان وہاں کا فوجدار تھا وہ نہایت
شجاع اور بہادر انسان تھا لیکن مرہٹوں کی کثرت کے سامنے وہ ایسا مرعوب ہوا کہ لڑے
بغیر ہی مرہٹوں کا مطیع و فرمانبردار ہو گیا۔

یہاں سے نکلنے کے بعد مرہٹے کولار پر قابض ہوئے پھر مڑوا کل کے سامنے آ
نمودار ہوئے اور محاصرہ کر لیا۔ چند ہی روز میں انہوں نے شہر فتح کر لیا۔ قلعدار کی گردن
اڑا دی اور شہر میں جی بھر کر انہوں نے مسلمانوں کا قتل عام کیا۔ اس کے بعد وہ یورش
کرتے ہوئے کرم کنڈہ شہر کی طرف آئے۔ گو یہ ایک مضبوط فصیل کا شہر تھا لیکن وہاں کی
محافظ فوج زیادہ عرصہ تک مرہٹوں کے سامنے محصور رہ کر نہ لڑ سکی۔ آخر اس شہر پر بھی
قابض ہو گئے۔

مرہٹوں کے لشکر میں میر علی رضا نام کا ایک شخص تھا جو اس سے قبل حیدر علی
کی طرف سے شہر سرا کا قلعدار تھا اور اس شہر کو فتح کر کے مرہٹوں نے میر علی رضا خاں کو اپنے
لشکر میں شامل کر لیا تھا۔ مرہٹوں کے پیشوا سوامی نے اسی علی رضا خان کو کرم کنڈہ

شہر کا حاکم مقرر کیا اور اسے حکم دیا کہ وہ آس پاس کے چھوٹے چھوٹے قلعہ داروں کو زیر کرے
کے علاوہ مقامی آبادی میں سے مرہٹوں کے لیے ایک ہزار سوار اور تین ہزار پیادہ فوج
مہیا کرے۔

سرنگاپٹن کے اطراف میں تمام قلعوں پر قبضہ کر چکنے کے بعد سوامی نے ماگری
کے جنگل سے پندرہ میل شمال میں اپنے لشکر کو ایک جگہ جمع کیا۔ اب وہ براہِ راست حیدر
پر ضرب لگانے کا فیصلہ کر چکا تھا۔ حیدر علی کے علاوہ جنوبی ہند میں کوئی ایسی مسلم قوت نہ تھی جو
مرہٹوں کی اس طوفانی یورش اور سیلابی ترکتاز کو روکتی۔

حیدر علی ابھی تک ماگری درگ کے جنگل میں گھات لگائے بیٹھا تھا۔ یہ ایک
وسیع و عریض جنگل تھا جس کے اندر کوہستانوں کے طویل سلسلے تھے اور اس میں سے گزر کر
سرنگاپٹن کی طرف جانا پڑتا تھا۔ حیدر علی نے اپنے جرنیل ہیبت جنگ کو بھی اپنے پاس
لیا تھا اور سرنگاپٹن کی حفاظت اپنے نامور جرنیل امیر محمد علی کمندان کے سپرد کر دی تھی۔

نصرالدین اب مکمل طور پر صحت یاب ہو چکا تھا۔ خولہ اور سمیتا اس کے پاس
چند روز قیام کرنے کے بعد واپس جا چکی تھیں۔ یہاں حیدر علی نے نصرالدین، ہیبت جنگ
اور اپنے درمیان لشکر کو تین برابر حصوں میں تقسیم کر لیا تھا اور اسی طرح گھات میں رہ کر
مرہٹہ لشکر کا انتظار کرنے لگا تھا۔

دوسری طرف سوامی نے اپنے لشکر کو چار حصوں میں تقسیم کیا۔ ہراول پر جسے
لشکر بینی کہتے تھے اپنے ایک رشتہ کے بھائی کو سالار مقرر کیا۔ دوسرے حصے پر بیڈرے
اور تیسرے حصے میں پنڈارے تھے اور ان دونوں وحشی اور خون آشام و مردار خور قوتوں
اُن میں سے ہی کمانڈر مقرر کیے تھے۔ لشکر کا چوتھا اور بڑا حصہ سوامی نے اپنی کمان میں
اور اپنے مشہور زمانہ جرنیل گوپال راؤ کو بھی اس نے بُرے وقت کا مقابلہ کرنے کے لیے اپنے
نائب کی حیثیت سے اپنے ساتھ رکھ لیا تھا۔ لشکر کی اس تقسیم کے بعد سوامی نے ماگری
کے جنگل کی طرف کوچ کیا تھا۔

دوسری طرف حیدر علی کے برق رفتار جاسوس بھی مرہٹوں کی مکمل نقل و حرکت کے

متعلق اسے آگاہ کر رہے تھے۔ ایک روز عشار کے بعد حیدر علی نے نصرالدین اور ہیبت
جنگ کو اپنے خیمے میں بلایا۔ جب وہ دونوں آ کر اس کے سامنے بیٹھ گئے تو حیدر علی نے کہا۔

"مرہٹے ہماری طرف کوچ کر چکے ہیں۔ سوامی نے اپنے لشکر کو چار حصوں میں تقسیم
کیا ہے۔ دو حصوں پر بیڈرے اور پنڈارے ہیں۔ ایک حصہ اس کا ہراول ہے۔ چوتھا اور
بڑا حصہ سوامی نے اپنے پاس رکھا ہے۔ جنگ کی ابتدا کرنے کے لیے مجھے تم دونوں کے
مشورے کی ضرورت ہے۔"

نصرالدین نے سوالیہ انداز میں ہیبت جنگ کی طرف دیکھا اور جواب میں ہیبت
جنگ نے خفیف سی مسکراہٹ میں بھرپور اعتماد کا اظہار کرتے ہوئے نصرالدین سے
کہا۔ "آپ کہیں جو کہنا چاہتے ہیں میں آپ کے مشورے کو اپنی رائے کا اظہار ہی جانوں
گا۔ مجھے بھروسہ اور اعتماد ہے کہ جو کچھ بھی آپ کہیں گے اور کریں گے اس میں ہماری بہتری
اور فتح مندی ہی کا راز ہوگا۔"

نصرالدین نے اپنا سر جھکاتے ہوئے کچھ سوچا پھر آہستہ آہستہ اس نے اپنی
گردن سیدھی کی اور حیدر علی کی طرف دیکھتے ہوئے اس نے کہا۔ "میرے آقا! میرا مشورہ
ہے کہ دشمن کو پھیلا کر اور اُلجھا کر اس نمٹا جائے۔ آپ بیڈرے اور پنڈارے میرے
حوالے کر دیجیے میں ان سے سمجھ لوں گا۔ میں دیکھوں گا وہ کیسے وحشی اور کس قدر مردار
خور ہیں۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں میں پنڈاروں کو پھاڑ اور بیڈروں کو ادھیڑ دونگا
آپ اپنے لشکر کے ساتھ دشمن کے ہراول کو اپنے ساتھ مصروفِ پیکار رکھیں اور اس
دوران سوامی کے لشکر پر ہیبت جنگ وقفے وقفے سے شب خون مار کر اسے اپنے لشکر
کے دوسرے حصوں کے متعلق سوچنے کی مہلت نہ دے۔ اگر ہم ایسا کرنے میں کامیاب
ہو گئے تو میں سمجھتا ہوں۔ سوامی اپنے بچے کھچے لشکر کو سمیٹ کر پونا واپس جانے کا فیصلہ
کر لے گا۔ اگر ہم اس مقصد میں کامیاب نہ ہوئے تو بھی ہمارا کچھ نہ بگڑے گا۔ ہماری
پشت پر سرنگاپٹن ہوگا اور وہاں سے محمد علی کمندان کی صورت میں ہم اپنے لیے مزید
کمک اور قوت حاصل کر سکتے ہیں۔

مجھے اُمید ہے اگر ہم اپنے رب کے نام سے ابتدا کریں تو ماگری درگ کے اس جنگل میں ہم سوامی اور اس کے چاروں لشکروں کو شکست دے کر اس کے لیے عبرت، تنبیہہ، نصیحت اور سبق بن سکتے ہیں۔ اس نے ہمارے خلاف جو کچھ کرنا تھا کر چکا۔ اب ہماری باری ہے اور اس جنگ میں ہم اس پر قدرت کا ایک عذاب اور اپنے رب کا قہر بن کر نازل ہوں گے۔ مَیں نے جو کچھ کہنا تھا کہہ چکا۔ اب آپ کہیئے آپ کا کیا فیصلہ ہے۔"

حیدر علی نے خفیف سی مسکراہٹ میں کہا۔ "میرے فیصلے اور تمہارے عزائم میں کوئی فرق نہیں۔ جس کا تم ارادہ کر چکے ہو وہی میرا فیصلہ ہے۔ مَیں تمہاری رائے سے اتفاق کرتا ہوں۔ ہمارے لشکریوں پر پنڈارے اور بیڈرے ہی خوف اور دہشت کا بھوت بن کر سوار ہیں اگر تم ان دونوں قوتوں سے نمٹ لو تو باقی لشکر کو مَیں اور ہیبت جنگ اپنے ساتھ مصروف کر لیں گے۔

یاد رکھو! ماگری درگ کے جنگل میں ہم اگر سوامی کے اس بڑی دل لشکر کو شکست دینے یا پسپا کرنے میں کامیاب ہو گئے تو وہ سرنگاپٹن پر حملہ کرنے کی حماقت نہ کرے گا اور وہ کسی دوسری جنگ کی ابتدا کرنے پر پونا واپس جانے کو ترجیح دے گا۔"

حیدر علی کے خاموش ہونے پر ہیبت جنگ نے کہا۔ "سرنگاپٹن کا محاصرہ سوامی کے لیے اتنا آسان نہ ہوگا۔ اس نے پہلے ہمارے جتنے قلعے اور شہر فتح کیے ان میں کسی ایک کے اندر بھی ہمارا کوئی قابلِ ذکر لشکر نہ تھا۔ سرنگاپٹن میں وارد ہونے کے لیے اسے یا تو ہماری لاشوں پر سے گزرنا ہوگا یا اپنے لشکریوں کے خون کا دریا بہانا ہوگا دشمن کی یہاں آمد سے قبل ہی کیا ہمیں ان کے کوچ کے مطابق اپنے لشکروں کو ترتیب نہ دے لینا چاہیے۔"

حیدر علی کھڑا ہوتا ہوا بولا۔ "تم نے درست کہا۔ سب سے آگے آگے سوامی کا ہراول ہے اس کے پیچھے پنڈارے اور بیڈرے ہیں اور آخر میں خود سوامی کا لشکر ہے۔

لہٰذا میرا قیام یہیں مناسب ہے۔ تم دونوں مناسب فاصلہ رکھ کر یہاں سے شمال کی طرف کوچ کرو اور دونوں دشمن پر ایک ساتھ حملہ آور ہونے کی کوشش کرنا۔"

نصرالدین اور ہیبت اُٹھے اور خیمے سے باہر نکل گئے تھے۔ اپنے اپنے لشکروں کے ساتھ انہوں نے وہاں سے کوچ کیا اور شمال کی طرف بڑھ گئے تھے۔

سوامی فتح کے نشہ میں مست سرنگاپٹن کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اس سے آگے آگے اس کا ہراول اور اس کے پیچھے پنڈارے اور بیڈرے تھے۔ سوامی نے اپنے آپ کو پیچھے رکھا تھا تاکہ وہ دن کے کسی اچانک حملے اور شب خون سے محفوظ رہ سکے۔ سرنگاپٹن اس کی آخری منزل تھی۔ اسے یقین تھا کہ اپنے عظیم لشکر کے ساتھ شہر فتح کرنے میں اسے زیادہ دن نہ لگیں گے اور پھر اس کی سابقہ فتوحات اس کی خوش فہمیوں اور سرمستیوں کی ایک مناسب اور مضبوط وجہ تھیں۔ بہرحال وہ آگے بڑھتا رہا اور دوپہر کے قریب وہ ماگری درگ کے جنگل میں داخل ہوا تھا۔

جونہی مرہٹوں نے جنگل اور کوہستانوں کے اندر تین میل کی مسافت طے کی سب سے پہلے ہیبت جنگ گھات سے نکلا اور سوامی کے حصّے پر حملہ آور ہوا۔ پنڈارے اور بیڈرے آگے تھے انہیں اس حملے کی خبر نہ ہوئی جب کہ ہراول اس سے بھی زیادہ آگے تھے۔ سوامی پر حملہ کر کے ہیبت جنگ نے اسے پوری طرح اپنے آپ کے ساتھ مصروف پیکار کر لیا تھا۔ اس سے تھوڑی ہی دیر بعد حیدر علی ہراول پر حملہ آور ہو گیا تھا۔

پنڈارے اور بیڈرے ابھی تک پُرسکون رہ کر آگے بڑھ رہے تھے۔ نصرالدین اپنی کمین گاہ سے نکلا اور قہر بن کر ان پر ٹوٹ پڑا۔ نصرالدین کے کہنے پر اس کے لشکری حملہ آور ہوتے ہوئے چلا چلا کر پنڈاروں اور بیڈروں سے کہہ رہے تھے۔ "ہم اور ہمارا سالار وہی ہیں جنہوں نے تم دونوں قوموں کو بنگل شہر سے باہر کھلی جنگ میں عبرتناک شکست دی تھی۔"

اس انکشاف پر بیڈرے اور پنڈارے اپنا سارا وحشی پن اور اپنی ساری

خونخواری بھول گئے تھے۔ ان پر لرزہ اور خوف طاری ہو گیا تھا کیونکہ جنگل سے باہر نصرالدین کے ہاتھوں اپنی شکست سے وہ متاثر اور خوفزدہ تھے لہٰذا وہ جم کر لڑ سکے اور نصرالدین نے انہیں اپنے لشکر کے ساتھ تلواروں کی نوک پر رکھ لیا تھا۔ تھوڑی ہی دیر بعد پنڈاروں اور بیڈروں میں پسپائی کے آثار نمودار ہونے لگے تھے۔

اس موقع پر ان کے سالار نے دانش مندی سے کام لیا اور اپنے لشکر کو دو حصّوں میں بانٹ کر نصرالدین کے لیے دو محاذ کھڑے کرنے کی کوشش کی تھی لیکن اس میں اسے کامیابی نہ ہوئی تھی۔ شاید نصرالدین اس کی چال کو جان گیا تھا اس لیے اس نے پنڈاروں اور بیڈروں کے اس علیحدہ علیحدہ ہونے کی کوشش کو ان پر بھرپور اور تیز حملے کر کے ناکام بنا دیا تھا۔

نصرالدین کے ان طوفانی حملوں کی تاب نہ لا کر دشمن بُری طرح مغرب کی طرف پسپا ہونا شروع ہو گئے تھے۔ اس موقع پر بھاگتے ہوئے بیڈروں نے اپنے ہراول اور پنڈاروں نے سوامی کے لشکر کی طرف بھاگنے کی کوشش کی۔ اس طرح وہ اپنے آپ کو محفوظ کرنے کے علاوہ اپنے ان دونوں لشکروں کی تعداد اور قوت میں بھی اضافہ کر سکتے تھے۔

لیکن نصرالدین جو اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کر حملہ آور ہوا تھا، پوری طرح چوکنا تھا۔ اس نے دائیں بائیں اپنے لشکر کو خوب پھیلا کر دشمن کے راستے مسدود کر دیے تھے اور انہیں صرف اپنے سامنے کی طرف بھاگنے پر مجبور کر دیا تھا۔ نصرالدین نے یوں انہیں اپنے گھیراؤ میں لے لیا تھا جس طرح کوئی گڈریا، کوئی چوپان اپنے ریوڑ کو گھر لے جاتے ہوئے خوب سمیٹ اور سکیڑ کر رکھتا ہے۔

پنڈارے اور بیڈرے پانچ میل تک مغرب کی طرف تیزی سے بھاگتے رہے اور نصرالدین ان کا تعاقب کر کے ان کی تعداد کم کرتا رہا حتیٰ کہ سامنے ایک برساتی نالہ آ گیا تھا جسے عبور کر کے وہ نالے کے اس پار چلے گئے جب کہ نصرالدین نے اپنے لشکر کو روک لیا تھا۔ دوسرے کنارے پر جا کر پنڈارے اور بیڈرے رکنے کے بجائے

مغرب کی طرف بھاگتے رہے۔

جب نصرالدین کی نگاہوں سے اوجھل ہو گئے تو نصرالدین اپنے لشکر کو لے کر واپس مڑا اور برق رفتاری سے فاصلوں کو سمیٹتا ہوا وہ اس طرف آیا جہاں ہیبت جنگ سوامی کے ساتھ مصروف جنگ تھا۔ ہیبت جنگ سوامی کے سامنے جم کر نہ لڑ رہا تھا۔ اس لیے کہ سوامی کے لشکر کی تعداد حیدر علی کے کُل لشکر کی تعداد سے بھی کہیں زیادہ تھی۔ لہٰذا ہیبت جنگ نے اُسے صرف ایک جگہ روک لینے پر اکتفا کیا ہوا تھا۔ وہ اچانک جنگل کے اندر دشمن کے کسی پہلو پر حملہ آور ہوتا اور اُسے نقصان پہنچاتا ہُوا اپنا آپ بچا کر آگے نکل جاتا تھا۔ گریز و بچاؤ کا یہ کھیل اس کے لیے سود مند تھا کہ وہ دُشمن کو مصروف رکھنے کے علاوہ اپنے لشکر کو نقصان سے بچائے ہوئے تھا۔

ایسے ہی ایک موقع پر جب کہ ہیبت جنگ سوامی کے لشکر پر کسی مناسب پہلو سے حملہ آور ہونے کی تیاری میں تھا۔ نصرالدین اپنے لشکر کے ساتھ اس کی کمین گاہ میں آ داخل ہُوا۔ ہیبت جنگ جو اپنے گھوڑے پر سوار ہو چکا تھا۔ نصرالدین کو اپنی کمین گاہ میں داخل ہوتے دیکھ کر پریشان ہو گیا تھا۔ وہ اپنے گھوڑے کو ایڑ لگا کر نصرالدین کے قریب آیا اور پریشان آواز میں پوچھا "آپ یہاں؟ خیریت تو ہے۔ آپ تو پنڈاروں اور بیڈروں سے برسرِ پیکار تھے"۔

نصرالدین نے مسکراتے ہوئے "تم فکر مند نہ ہو۔ میں بیڈروں اور پنڈاروں کو شکست دے کر میدانِ جنگ سے بھگا چکا ہوں۔ میں دیکھتا ہوں کیا تم کوہستانوں سے گھری ہوئی اس وادی میں غیر محفوظ نہیں ہو اس وقت تم دُشمن کے ساتھ جنگ کی حالت میں ہو اور وہ کسی وقت بھی اس وادی میں داخل ہو کر تمہیں زیر کر سکتا ہے اور تمہارا زیر ہو جانا ہمارے لیے ناقابلِ تلافی نقصان ہو گا"۔

ہیبت جنگ نے اب مطمئن ہو کر کہا "آپ میرے متعلق فکر مند نہ ہوں میں نے دُشمن کا بندوبست کر رکھا ہے۔ پہاڑوں سے گھری ہوئی اس وادی میں داخل

ہونے کو دو درّے ہیں۔ مَیں ایک درّے سے حملہ آور ہونے کو نکلتا ہوں اور دوسرے درّے سے حملہ آور ہونے کے بعد داخل ہوتا ہوں اور دونوں درّوں کے اُوپر مَیں نے اپنے ایک ایک ہزار ایسے تیر انداز اور بندوقچی متعین کر رکھے ہیں جن کے نشانے بے خطا ہیں اور مرہٹے ان سے بچ کر اس وادی میں داخل نہیں ہو سکتے۔ یہ وادی میرے لیے بہترین پناہ گاہ اور دم لینے کی مناسب جگہ ہے۔ اسے کمین گاہ بنا کر مَیں کئی روز تک سوامی کی پیش قدمی کو روک سکتا ہوں۔

نصرالدین نے اپنے گھوڑے کی پیٹھ تھپتھپاتے ہوئے کہا۔ "میں غلطی پر تھا۔ تمہارے ارادے درست ہیں۔ اب تم میرے ساتھ سوامی کے لشکر پر ایک بھرپور حملہ کرنے کے لیے تیار ہو جاؤ۔ سنو ہیبت جنگ! تم سوامی پر جنوب سے شمال کی طرف حملہ آور ہوئے اپنی اسی کمین گاہ کی طرف چلے آنا۔ مَیں دشمن پر شمال سے جنوب کی طرف حملہ آور ہو کر سیدھا آگے سلطان کی طرف نکل جاؤں گا۔ ہیبت جنگ! اس مشترکہ حملے کے دو فوائد ہوں گے۔ ایک تو سوامی اور اس کے لشکر پر یہ واضح ہو جائے گا کہ یہاں اس کمین گاہ میں اس پر حملہ آور ہونے والے تم اکیلے نہیں بلکہ تمہاری مدد کے لیے یہاں کئی اور لشکر بھی موجود ہیں۔ اس سے اس پر ہماری دہشت اور خوف طاری ہو جائے گا اور اگر یہ جنگ طول بھی پکڑ گئی تو وہ تمہارا تعاقب کرنے کی کوشش نہ کرے گا اس لیے کہ اسے اندیشہ ہو گا اس کی پشت سے کوئی اور لشکر حملہ آور نہ ہو جائے۔

ہمیں دوسرا فائدہ یہ ہو گا کہ مَیں شمال کی طرف حملہ آور ہو کر سلطان سے جا ملوں گا اور مجھے اُمید ہے کہ میں اور سلطان مل کر دشمن کے ہراول لشکر کا صفایا کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ اگر ہم ایسا کرنے میں کامیاب ہو گئے تو یہ دشمن کو ایک کھلی شکست نہ سہی اسے ایک تنبیہہ اور عبرت ضرور ہو جائے گی اور پھر ہراول کے علاوہ بیڈروں اور پنڈاروں کو پسپا کرنے کے بعد سوامی سے مقابلہ کرنے کے لیے ہم پہلے سے بہتر صورت میں ہوں گے۔

گو یہ تینوں لشکر پھر ایک جگہ جمع ہو جائیں گے لیکن ایک بار ہم سے شکست کھانے کے بعد جنگ کرنے میں وہ پہلے جیسے سرگرم اور جنوں خیز نہ رہیں گے اور ان کی یہ حالت ہمارے لیے سود مند ثابت ہو گی۔ کیا تم مجھ سے اتفاق کرتے ہو؟"

ہیبت جنگ نے اطمینان کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ "مَیں پوری طرح آپ سے اتفاق کرتا ہوں" ——— "تو پھر آؤ اپنی مہم کا آغاز کریں۔" ہیبت جنگ نے اپنے گھوڑے کو ایڑ لگاتے ہوئے کہا۔ "چلیے" اور اس کے ساتھ ہی اس نے اپنے لشکر کو کوچ کا حکم دے دیا تھا۔

نصرالدین اور ہیبت جنگ دونوں اپنے لشکروں کے ساتھ اس کوہستانی کمین گاہ سے باہر نکلے۔ تھوڑی دُور آگے جا کر نصرالدین علیحدہ ہو گیا۔ اس نے اپنی رفتار تیز کر لی تھی اور وہ ایک مختصر ترین کاوا کاٹتا ہوا مرہٹہ لشکر کے شمال کی طرف بڑھا تھا۔ جب کہ ہیبت جنگ کا رُخ جنوب کی طرف تھا اور پھر اس وقت سوامی کے لشکر پر لرزہ طاری ہو گیا تھا جب شمال کی طرف سے نصرالدین اور جنوب کی طرف سے ہیبت جنگ تکبیریں بلند کرتے ہوئے ایک ساتھ حملہ آور ہوئے تھے۔ دونوں کے صبا رفتار لشکر ہوا کے جھونکوں کی طرح دشمن کے دائیں بائیں سے اندر گھس کر حملہ آور ہوتے تھے۔

سوامی اپنی زندگی میں پہلی بار اپنے روزِ حساب اور تلخ حقائق کا سامنا کر رہا تھا۔ اس لیے کہ اپنے باپ بالاجی راؤ نانا کی مرگ کے بعد مرہٹوں کے پیشوا کی حیثیت سے مسلمانوں کے خلاف اس کی یہ پہلی جنگ تھی۔

نصرالدین دشمن کو کاٹتا ہوا جنوب کی طرف بڑھتا رہا جس وقت وہ دشمن کے وسطی حصّے میں جنگ کر رہا تھا تو ذرا فاصلے پر اس کی نظر عبدالحکیم خان پر پڑی۔ جو بڑی سرگرمی سے اپنے لشکریوں کے ساتھ مرہٹوں کے دفاع میں نصرالدین کے لشکریوں سے جنگ کر رہا تھا۔ لڑتے لڑتے نصرالدین نے اسے دُور ہی سے چلّا چلّا کر مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "عبدالحکیم خان! کیا یہ تیرے لیے باعثِ عار اور قابلِ شرم نہیں

کہ تو مُسلمان ہو کر ہم مُسلمانوں کے خلاف جنگ کر رہا ہے۔

یاد رکھ عبدالحکیم! بدنور کی جس رانی کی حمایت میں تو ہمارے خلاف اُٹھا ہے اس کے لیے اگر تو ہمارے خلاف ایسے ہزاروں لشکر بھی لے آئے تو بھی رانی کو ہماری گرفت سے چھڑا کر نہیں لے جا سکتا۔ مَیں تیرے لشکر سے پہلو تہی کر کے آگے بڑھ رہا ہوں کہ تو مُسلمان بھائی ہے اور بھائی آپس میں جنگ نہیں کرتے۔"

نصرالدین کے یہ الفاظ عبدالحکیم کے لشکریوں نے بھی سُن لیے تھے ان پر خاطر خواہ اثر ہُوا اور انہوں نے نصرالدین کے لشکر پر بڑھ چڑھ کر حملے کرنے کے بجائے اپنے آپ کو دفاع تک محدود کر لیا تھا۔ عبدالحکیم کے لشکریوں کے اس ردِعمل سے وقت ضائع کیے بغیر نصرالدین نے فائدہ اُٹھایا اس نے فوراً اپنے لشکر کو وسطی حصّے سے سمیٹا اور آگے بڑھ کر آخری حصّے پر جہاں مرہٹے ہی مرہٹے تھے وہ قضا بن کر گرا اور گندھک و کوئلے کا طوفان بن کر پھٹا تھا۔ یوں لگتا تھا اسے جبلت کھینچ کر دُشمن کی طرف لے جا رہی ہو۔

مرہٹہ لشکر کے آخری حصّے کو نصرالدین نے بُری طرح اُدھیڑ کر رکھ دیا تھا پھر وہ اپنے پیچھے سوامی اور اس کے جرنیلوں کے لیے پچھتاوا، حسرت اور پشیمانی چھوڑتا ہُوا اس طرف بڑھ گیا تھا جدھر حیدر علی مرہٹوں کے ہراول لشکر کے ساتھ جنگ میں مصروف تھا۔

دوسری طرف سے ہیبت نے بھی نصرالدین جیسی ہی سرگرمی اور تیزی کا مظاہرہ کرتے ہوئے حملہ کیا تھا۔ اور وہ دُشمن کے بائیں پہلو کو بُری طرح کاٹتا ہُوا اپنی کمین گاہ کے اندر چلا گیا تھا۔ اس دو طرفہ حملے نے سوامی کو بددِل اور شکستہ پا کر دیا تھا نصرالدین کے سارے اندازے درست ثابت ہوئے تھے اور سوامی اس وہم میں پڑ گیا تھا کہ ماگری درگ کے جنگل میں دُشمن کا ایک نہیں اَن گنت لشکر مقیم ہیں۔ لہٰذا اس نے فوراً شمال کی طرف کُوچ کیا۔

ماگری درگ کے جنگل سے نکل کر وہ پانچ میل اور شمال کی طرف بڑھا اور اپنے

لشکر کے ساتھ ایک کوہستان کے اُوپر خیمہ زن ہو گیا تھا۔ اُسے ابھی تک بیڈروں اور پنڈاروں کی شکست کا علم نہ ہُوا تھا اور وہ اسی انتظار میں تھا کہ اس کے ہراول لشکر کے علاوہ پنڈارے اور بیڈرے سرنگاپٹن تک اس کے لشکر کے لیے ہر رکاوٹ کو دُور کر کے اس کا راستہ صاف کر دیں گے۔

گو سوامی کے ہراول لشکر کی تعداد پچاس ہزار کے لگ بھگ تھی اس کے باوجود شیر دل حیدر علی نے اس پر ایسے خوفناک اور مہلک حملے کیے تھے کہ ہراول کے مرہٹے اپنے پاؤں تلے سے زمین سرکتی ہوئی محسوس کر رہے تھے۔ انہوں نے حیدر علی پر قابو پانے کے بہتیرے جتن کیے لیکن حیدر علی ان کے سامنے ایسا ہی کڑا ثابت ہُوا جیسے بھیڑیوں کے سامنے کھڑے مُسلح چوپان، جیسے سمندر میں کھڑی کوئی مضبوط چٹان جیسے تیز طوفانوں کے سامنے کوئی آہنی حصار۔

مرہٹے پہلے ہی اپنے دفاع میں سمٹے ہوئے تھے۔ اب جو اُن کی پشت سے نصرالدین آندھی طوفان اور برق و رعد بن کر حملہ آور ہُوا تو ان کے سارے اوسان خطا ہو گئے تھے۔ وہ مجتمع ہوتے ہوتے بکھر گئے اور ان کی گُتھی صفیں تیز آندھی میں تنکوں کی طرح منتشر اور پراگندہ ہونے لگی تھیں۔ پھر ایک دم مرہٹے سر پہ پاؤں رکھ کر بھاگ کھڑے ہوئے۔ ان کا سالار اس بھاگ دوڑ میں اپنے گھوڑے سے گر پڑا تھا اور اپنے قریب سے گزرتے ہوئے ایک بے زین گھوڑے پر ہی سوار ہو کر وہ جان بچا کر بھاگ کھڑا ہوا تھا۔

حیدر علی اور نصرالدین نے دُور تک دُشمن کا تعاقب کیا یہاں تک کہ وہ ہیبت جنگ سے آملے اور شکست خوردہ مرہٹہ لشکر اس طرف بھاگ گیا جہاں اُن کا پیشوا سوامی انباجی درگ کے کوہستان کے اُوپر پڑاؤ کیے ہوئے تھا۔ جب ہراول کا سالار سوامی کے پاس پہنچا اور اس کی زبانی اسے اپنے ہراول کے علاوہ بیڈروں اور پنڈاروں کی عبرت خیز شکست کا علم ہُوا تو مرہٹوں کے پیشوا سوامی نے غضب ناک ہو کر اپنے اس سالار سے کہا۔ "آہ! تُو نے اپنے پیشوا کی ناک کٹوا دی۔ تُو نے سرنگاپٹن

کو ہمارے لیے ناقابلِ تسخیر بنا دیا ہے۔"

سوامی نے اس سے زیادہ کچھ نہ کہا کیونکہ اسے احساس تھا کہ وہ خود بھی ذرا سی شکست اٹھانے کے بعد اس پہاڑ پر آ کر فروکش ہوا ہے۔

جس جگہ پہلے سوامی اپنے لشکر کے ساتھ جنگ کی حالت میں تھا وہاں حیدر علی، نصرالدین اور ہیبت جنگ اکٹھے ہو کر ایک دوسرے سے ملے۔ حیدر علی کو اس کے جاسوس اسمٰعیل اور شہباز پہلے ہی نصرالدین کی بیڈروں اور پنڈاروں کو شکست کی خبر دے چکے تھے۔ حیدر علی نے توصیفی انداز میں نصرالدین کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"نصرالدین! میں تمہاری کارگزاری سے از حد مطمئن ہوں۔ تم نے جو لائحہ عمل بنایا تھا میری امیدوں سے کہیں بڑھ کر تو نے اس پر عمل پیرا ہو کر دکھا دیا ہے۔ اب اگر تم دونوں تھکاوٹ محسوس نہ کر رہے ہو تو میں نے ایک اور عزم کیا ہے۔ میرا ارادہ ہے کہ یہاں سے ہٹ کر بالاپور شہر پر اچانک حملہ کر کے وہاں مقیم مرہٹوں کو تہ تیغ کر کے شہر پر دوبارہ قبضہ کر لیا جائے۔ اس طرح سوامی پر ہماری اور زیادہ دہشت طاری ہو جائے گی اور وہ واپس جانے پر مجبور ہو جائے گا۔ اس کے پاس اب بھی زبردست قوت ہے۔ اپنے لشکر کو جمع کر کے اور پنڈاروں، بیڈروں کو پھر ساتھ ملا کر اگر وہ دوبارہ جم گیا تو ہمارے لیے کئی مسائل کھڑے کر سکتا ہے۔"

نصرالدین نے حیدر علی کو اطمینان دلاتے ہوئے کہا۔ "آپ ہماری تھکاوٹ اور ماندگی کا کوئی احساس نہ کریں۔ ہم دن رات گھوڑے کی پیٹھ پر آپ کے ساتھ ہیں۔ مرہٹوں کی واضح شکست اب ہماری زندگی کا نصب العین ہے۔"

مطمئن ہو کر حیدر علی نے متحدہ لشکر کے ساتھ سرنگاپٹن کی طرف کوچ کیا۔ شہر سے باہر اس نے اپنے لشکر کو صرف ایک رات آرام کرنے کا موقع دیا۔ دوسرے روز وہ طوفانی انداز میں اٹھا اور راتوں رات دھاوا مارتے ہوئے اس نے بالاپور کلاں کو جا گھیرا تھا۔ آدھی رات کو وہ شہر کے دروازے پر پہنچا۔ سوامی کا جرنیل گوپال راؤ بن کر اس نے شہر کا دروازہ کھلوا لیا پھر اس نے لشکر کے ساتھ شہر میں داخل ہو کر

ایک ایک مرہٹے کو چن چن کر قتل کر دیا اور شہر پر دوبارہ اپنا حاکم مقرر کر کے اس نے ماگری درگ کے جنگل کی طرف کوچ کر لیا تھا۔ شاید تقدیر اس کے حق میں تھی اور قدرت اس کی راہنمائی کر رہی تھی کہ اسی رات سوامی کا ایک جرنیل چھ ہزار سواروں کے ساتھ سوامی کے لشکر کے لیے مقامی لوگوں سے زبردستی خوراک حاصل کرنے کی خاطر اس طرف نکلا ہوا تھا۔

حیدر علی کے جاسوس اسے اس جرنیل کی کارگزاری سے آگاہ کر چکے تھے۔ بالاپور کلاں کو فتح کرنے کے بعد دم لیے اور قیام کیے بغیر ماگری درگ کے جنگل کی طرف جاتے ہوئے حیدر علی پہلے بارہ محل کی طرف بڑھا جہاں سے وہ مرہٹہ جرنیل اس وقت خوراک کا سامان حاصل کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ حیدر علی نے وہاں آ کر اپنے لشکر کو پھیلا دیا۔ جنوب کی طرف سے وہ خود، مغرب کی طرف سے نصرالدین اور مشرق کی طرف سے ہیبت جنگ ان لٹیرے مرہٹوں کی طرف بڑھے تھے۔

بارہ محل شہر سے باہر ان مرہٹوں پر ایسا صف شکن حملہ ہوا کہ ان میں سے کسی کو بھی اپنی جان بچا کر بھاگنے کا موقع نہ ملا اور مسلمانوں نے ایک ایک مرہٹہ چن چن کر موت کے گھاٹ اتار دیا تھا۔ اس کے بعد حیدر علی نے اپنے دونوں جرنیلوں کے ساتھ بارہ محل سے کوچ کیا اور طوفانی انداز میں سفر کرتا ہوا وہ اگلے روز ماگری درگ کے جنگل میں اسی جگہ آ کر فروکش ہو گیا جسے ہیبت جنگ نے اپنے لیے محفوظ کمین گاہ کے طور پر جنگ میں استعمال کیا تھا۔

مرہٹوں کے پیشوا سوامی کو جب بالاپور کلاں کے ہاتھ سے نکل جانے اور چھ ہزار لشکریوں سمیت اپنے جرنیل کے قتل ہونے کی اطلاع پہنچی تو اس پر حیدر علی کی طرف سے ایک خوف سا طاری ہو گیا اور کسی باعزت پسپائی کی خاطر اس نے حیدر علی سے صلح صفائی کی کوششیں شروع کر دی تھیں۔ حیدر علی خود بھی چاہتا تھا کہ مرہٹے کسی طرح واپس لوٹ جائیں اور اپنا وہ علاقہ جو مرہٹوں نے اس سے چھین لیا تھا اسے واپس حاصل کرنے کا موقع مل جائے۔

جب حیدر علی کی طرف سے بھی صلح کے لیے رضامندی کا اظہار ہُوا تو پھر صُلح کی شرائط طے کرنے کے لیے وفود کا تبادلہ ہونے لگا تھا۔ مرہٹوں کے پیشوا کی حیثیت سے سوامی چاہتا تھا کہ اس کی پونا کی طرف واپسی باعزت ہو تاکہ مرہٹوں کے اندر ایک پیشوا کی حیثیت سے اس کی عزت اور ساکھ قائم رہے۔

حیدر علی کو بھی اس کا احساس تھا اس کے علاوہ اس کے سامنے یہ نقطۂ نظر بھی تھا کہ مرہٹوں کے یہاں سے جانے کے بعد ہی وہ اپنے علاقے واپس لے سکتا ہے لہٰذا اس نے سوامی کی طرف پیغام بھجوایا کہ "بے سبب رعایا کی تباہی اور بربادی بہادروں اور حکمرانوں کا شیوہ نہیں ہے۔ جو کچھ ہوا ہو چکا۔ اب تمہاری بڑائی اسی میں ہے کہ خلق اللہ کے کشت وخون سے باز آؤ اور مردم آزاری سے ہاتھ روک کر اپنے ملک کو لوٹ جاؤ۔" ساتھ ہی حیدر علی نے وہ خزانہ بھی سوامی کو بھجوا دیا جو اس نے جنگ کے دوران مرہٹوں سے حاصل کیا تھا۔

سوامی نے اس سودے کو منافع بخش اور اپنی عزت افزائی جانا۔ اس نے فتح کیے ہوئے علاقوں پر اپنے جرنیل گوپال راؤ کو حاکم مقرر کیا۔ گوپال راؤ نے حیدر علی کے شہر سرا کو اپنا مرکز بنایا اور مفتوحہ علاقوں کا نظم ونسق جب اس نے سنبھال لیا تو سوامی اپنے لشکر کو لے کر وہاں سے پونا کی طرف کوچ کر گیا تھا۔

سوامی کی روانگی کے دوسرے روز حیدر علی اپنے لشکر کے ساتھ شام سے تھوڑی دیر قبل سرنگاپٹن میں داخل ہُوا۔ جب لشکر اپنے مستقر کی طرف چلا گیا اور نصرالدین اپنے گھر کی طرف جانے لگا تو حیدر علی نے اُسے پکارتے ہوئے کہا۔ "نصرالدین!

نصرالدین! رُک جاؤ۔"

نصرالدین نے اپنے گھوڑے کو روک لیا اور نیچے اُتر کر کھڑا ہو گیا تھا۔ اس نے دیکھا حیدر علی سرگوشیوں میں اپنے جرنیل محمد علی کمندان، ہیبت جنگ اور اپنے برادرِ نسبتی مرزا حسین بیگ کے ساتھ گفتگو کر رہا تھا۔ نصرالدین کی سمجھ میں نہ آیا کہ معاملہ کیا ہے۔ جب کہ تھوڑی دیر قبل خود حیدر علی اسے گھر جانے کی اجازت دے چکا تھا۔ نصرالدین کے دیکھتے ہی دیکھتے وہ چاروں علیٰحدہ ہو کر اپنے گھوڑوں پر سوار ہو گئے اور اس کی طرف بڑھے۔ نزدیک آ کر حیدر علی نے کہا۔ "تم گھوڑے سے اُتر کیوں گئے ہو؟ بیٹھو! ہم بھی تمہارے ساتھ تمہارے گھر تک جا رہے ہیں۔ کوئی وجہ پوچھے بغیر نصرالدین اپنے گھوڑے پر سوار ہو کر ان کے ساتھ ہو لیا تھا۔

جب حویلی میں وہ سب داخل ہوئے تو صحن میں سمیتا کھڑی تھی۔ شاید وہ دُور سے نصرالدین کو آتے دیکھ چکی تھی اس لیے صحن میں کھڑی ہو کر اس کا انتظار کر رہی تھی۔ شاید وہ نصرالدین سے اس کے گھوڑے کی باگ پکڑ کر اسے اصطبل کی طرف لے جانا چاہتی ہو گی۔ یا وہ اپنے اس مجاہد کو اس کی جنگی کارروائیوں پر مبارک باد دینا چاہتی ہو گی جس سے وہ پوری زندگی کے لیے منسوب ہو چکی تھی۔

نصرالدین کے ساتھ دوسرے لوگوں کو دیکھ کر سمیتا پلٹی پھر کسی جنگلی غزال کی طرح وہ بھاگتی ہوئی حویلی کے اندر چلی گئی تھی۔ حیدر علی نے صحن کے اندر اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "یہیں رُک جاؤ، پہلے نصرالدین کو اندر جانے دو، یہ ماں کے تقدس واحترام کے اظہار میں ایک رسم ادا کرتا ہے۔ پہلے یہ اس سے فارغ ہو پھر ہم اپنے کام کی ابتداء کریں گے۔"

نصرالدین بھی اپنے گھوڑے کو روک کر وہیں کھڑا رہا اور بڑی بے چارگی وبے بسی کے سے انداز میں حیدر علی کی طرف دیکھنے لگا تھا۔ حیدر علی نے اسے مخاطب کرتے ہوئے بڑی شفقت سے کہا۔

"تم رُک کیوں گئے ہو؟ جاؤ اندر جاؤ اور اپنی رسم ادا کرو۔ بخدا میں تمہیں

ماں کے احترام کی اس سعادت سے محروم نہیں کرنا چاہتا۔ مجھے تمہاری یہ رسم پسند اور عزیز ہے۔ کاش میں اپنی ماں کا ایسا ہی احترام اور توقیر کر سکتا۔ جاؤ اندر چلے جاؤ۔

نصرالدین اپنے گھوڑے سے اُتر کر حویلی کے اندر گیا۔ سامنے والے کمرے میں لکڑی کے تخت پوش پر خولہ لیٹی ہوئی تھی۔ سمیتا اس کے پاس بیٹھی اس کی ٹانگیں داب رہی تھی جب کہ سرہانے کی طرف صالحہ کھڑی تھی۔ نصرالدین دروازے پر کھڑا ہو گیا اور غور سے ان کی طرف دیکھنے لگا۔ وہ اُداس اور افسردہ ہو گیا تھا۔ اس نے دیکھا صالحہ خاموش اور مرجھائی کھڑی تھی۔ خولہ کی ٹانگیں داباتی ہوئی سمیتا مغموم اور پریشان حال تھی۔ نصرالدین آگے بڑھا۔ اس کے قدموں کی چاپ سُن کر اسے پکارنے والی ماں آج خاموش اور بے سدھ پڑی تھی۔

نصرالدین آگے بڑھ کر تخت پوش کے قریب گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا اور اپنی ماں کے دونوں پاؤں کو باری باری چومنے کے بعد اس نے پوچھا! "ماں! ماں! کیا تو مجھ سے خفا ہے؟ تُو تو میرے قدموں کی چاپ سُن کر مجھے نصر! نصر! پکارنے لگتی تھی"۔

خولہ کے کچھ کہنے سے قبل ہی سمیتا نے اپنی آنکھوں سے بہہ نکلنے والے آنسو خشک کرتے ہوئے اپنی بکھرتی اور روتی آواز میں کہا۔ "ماں پچھلے کئی روز سے بیمار ہیں آپ کو بہت یاد کرتی رہی ہیں"۔

اتنے میں خولہ نے حرکت کی اور کراہتے ہوئے اس نے کہا۔ "تو آ گیا میرے بیٹے! کیسا ہے تو؟ میری حالت پر فکر مند نہ ہونا۔ پچھلے چند روز سے بخار ہو رہا ہے۔ علاج کرا رہی ہوں اللہ کو منظور ہوا تو ٹھیک ہو جاؤں گی"۔

ماں کی حالت پر ضبط کرتے ہوئے نصرالدین نے کہا۔ "ماں! میرے ساتھ حویلی میں حیدر علی، محمد علی کمندان، ہیبت جنگ اور مرزا حسین بیگ بھی آئے ہیں۔ وہ کسی کام کے سلسلے میں آئے ہیں جس کی نوعیت کا مجھے بھی علم نہیں ہے۔ اگر تم کہو تو میں انہیں اندر لاؤں؟"

خولہ نے مدھم آواز میں کہا۔ "ہاں، انہیں اسی کمرے میں لے آؤ" ساتھ ہی اس نے سمیتا کو بھی مخاطب کرتے ہوئے کہہ دیا۔ "سمیتا! سمیتا! میری بیٹی! تم ساتھ والے کمرے میں چلی جاؤ"۔

نصرالدین اُٹھ کر باہر نکل گیا۔ سمیتا بھی اس کے ساتھ ہی لکڑی کے تخت پوش سے اُٹھی اور درمیانی دروازے سے ہوتی ہوئی وہ ساتھ والے کمرے میں چلی گئی تھی۔

نصرالدین جب باہر آیا تو اپنے گھوڑے کے پاس کھڑے حیدر علی نے پریشان ہو کر پوچھا "اے فرزند! کیا بات ہے تیرا چہرہ اُترا ہوا کیوں ہے"۔

نصرالدین نے شکستہ سی آواز میں کہا۔ "میری ماں پچھلے کئی روز سے بیمار ہے۔ آپ اندر آئیے۔ ماں آپ کو بلا رہی ہیں"۔ حیدر علی کا چہرہ اُتر گیا تھا۔ تاہم وہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ اُس کمرے میں آیا جس میں خولہ تخت پوش پر لیٹی ہوئی تھی۔ محمد علی کمندان، ہیبت جنگ اور مرزا حسین بیگ بائیں ہاتھ بچھے بستر پر بیٹھ گئے۔

حیدر علی تخت پوش کے قریب آیا اور خولہ کو مخاطب کر کے کہا۔ "اے بہن! میں حیدر علی ہوں اور تمہاری عظمت، تمہارے بیٹے کی فرمانبرداری کو سلام کرتا ہوں"۔ خولہ نے کراہتے ہوئے کہا۔ "اے بھائی! میں بیمار ہوں اور اس گھر میں تمہیں خوش آمدید کہتی ہوں"۔ حیدر علی نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔ "اگر تمہاری اجازت ہو تو میں کچھ کہوں"۔

خولہ نے اجازت دیتے ہوئے کہا۔ "بلا توقف کہو کہ تم اس گھر اور اس خاندان کے بھی محسن ہو اور ہر بات کہنے کا حق رکھتے ہو"۔ حیدر علی نے کہا۔ "میری بہن! میں چاہتا ہوں نصرالدین اور سمیتا کی شادی کر دی جائے۔ میں بہت پہلے اس فرض کو نمٹا چکا ہوتا لیکن مرہٹوں کے ساتھ جنگ نے مجھے اُلجھا دیا تھا اور میں کچھ نہ کر سکا تھا"۔

بیمار ہونے کے باوجود خولہ نے خوشی اور اطمینان کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ "میں خود بیٹے کے اس فرض سے سبکدوش ہونے کو بیتاب تھی۔ اب جب کہ تم سب اس گھر میں اکٹھے ہو ہی گئے ہو تو مجھے خوشی ہو گی کہ یہ کام آپ کے ہاتھوں انجام کو پہنچے"۔

حیدر علی نے مسکراتے ہوئے ہوئے کہا۔ "میں خود یہ نکاح پڑھاؤں گا"۔

حیدر علی اسی کمرے میں بیٹھ گیا اور اپنے ساتھیوں کی موجودگی میں اس نے نصرالدین اور سمیتا کا نکاح پڑھا کر دونوں کو رشتۂ زوجین میں باندھ دیا تھا۔ تھوڑی دیر تک وہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ اسی کمرے میں بیٹھا رہا پھر اُٹھ کر چلا گیا تھا۔

حیدر علی نے ایک ہفتہ اپنے لشکر کو آرام کرنے کا موقع دیا اور جب اسے یقین ہو گیا کہ سوامی اپنے لشکر کے ساتھ واپس پونا پہنچ چکا ہے تو اس نے اپنے لشکر کے ساتھ سرنگاپٹن سے کوچ کرنے کی تیاریاں شروع کر دی تھیں۔ خولہ کی حالت سنبھل نہ سکی تھی اور اس کی بیماری پہلے سے بھی زور کر گئی تھی۔ حیدر علی نے نصرالدین کو اپنی بیمار ماں کے پاس رہنے کی اجازت دے دی تھی لیکن خولہ نے بڑی جرأت مندی اور تحمل کا مظاہرہ کیا۔ اس نے نصرالدین کو جنگ میں حصّہ لینے کی اجازت دے اور اپنی بیماری کے متعلق اسے مطمئن اور آسودہ خاطر کر دیا تھا۔

جس روز لشکر نے سرنگاپٹن سے کوچ کرنا تھا اس روز سہ پہر کے قریب جنگ میں شریک ہونے کے لیے خولہ سے اجازت لے کر نصرالدین اصطبل میں اپنے گھوڑے پر زین ڈال رہا تھا اور اس کے پاس سمیتا بے چاری اُداس اور خاموش کھڑی تھی۔ نصرالدین جب زین ڈال چکا تو سمیتا کی طرف دیکھتے ہوئے اس نے پیار سے کہا۔ "سمیتا! سمیتا! میرے بعد ماں کا خیال رکھنا اور بیماری میں اس کی دیکھ بھال کرنا۔"

سمیتا نے چونکتے ہوئے کہا۔ "آپ بے فکر ہو کر کوچ کیجئے، وہ آپ ہی کی نہیں میری بھی ماں ہے اور ان کی خدمت اور دیکھ بھال میرے اوّلین فرائض میں شامل ہے۔ ماں کے معاملے میں میری طرف سے آپ کو کسی قسم کی شکایت محسوس نہ ہو گی۔ اگر جنگ طول پکڑ جائے تو آپ وقت نکال کر گھر کا چکّر ضرور لگائیں۔ جسمانی طور پر میں ماں کی خدمت کے لیے وقف ہوں گی لیکن میرا ذہن آپ کی طرف ہو گا۔ اسمٰعیل اور شہباز اکثر آتے جاتے رہتے ہیں ان کے ذریعے ہمیں اپنی سلامتی سے باخبر رکھیئے گا۔ میں بھی ان کے ذریعے آپ کو ماں کی بیماری سے آگاہ رکھوں گی۔ میں اس اُمید کے ساتھ آپ کو

رخصت کر رہی ہوں کہ ایک روز میں اپنی حویلی کے صحن میں کھڑی ہو کر ایک فاتح کی بیوی کی حیثیت سے آپ کا استقبال کر رہی ہوں گی۔"

نصرالدین کے ہونٹوں پر مسکراہٹ بکھر گئی اور وہ ایک جست کے ساتھ اپنے گھوڑے پر سوار ہو گیا تھا۔ ایک میٹھی اور الوداعی نگاہ اُس نے سمیتا پر ڈالی پھر وہ اپنے گھوڑے کو ایڑ لگا کر حویلی سے باہر نکل گیا تھا۔ سمیتا حویلی کے بیرونی دروازے کے پیچھے کھڑی ہو کر اسے دیکھتی رہی۔ جب وہ اس کی نگاہوں سے اوجھل ہو گیا تو وہ سر جھکائے مضمحل اور بجھی بجھی سی حویلی کے اندر چلی گئی تھی۔

حیدر علی نے اپنے لشکر کے ساتھ سرنگاپٹن سے کوچ کیا۔ اس بار بھی اس نے نصرالدین اور ہیبت جنگ کو اپنے ساتھ رکھا جب کہ محمد علی کمندان اور مرزا حسین بیگ کو اس نے سرنگاپٹن کی حفاظت کے لیے پیچھے چھوڑ دیا تھا۔ وہ اس ارادے سے نکلا تھا کہ جس قدر علاقے مرہٹوں نے اس سے چھینے تھے وہ سب بزورِ شمشیر واپس لے لے۔

جاڑا اپنے عروج پر تھا لیکن موسمی سختی کی پرواہ کیے بغیر وہ قعرِ گمنامی سے اُٹھنے والے اور کروٹیں لیتے طوفان کی طرح نکلا اور ایک کے بعد دوسرا قلعہ اس نے مرہٹوں سے چھیننا شروع کر دیا تھا۔

سوامی مفتوحہ علاقوں پر اپنے جرنیل گوپال راؤ کو حاکم مقرر کر گیا تھا اور اس نے سرا شہر کو اپنا مرکز بنا رکھا تھا۔ جب حیدر علی ایک عجیب ہیولے کی شکل میں ایک ایک کر کے سب قلعوں پر مسلط ہونے لگا تو گوپال راؤ نے مفصّل حالات اپنے پیشوا سوامی کو لکھ کر بھیجے۔ سوامی کو بھی اس بارے میں تشویش ہوئی۔ اس نے بھی ارادہ کر لیا کہ جب تک حیدر علی کی جمعیت منظم ہے اور اس کے لشکر کو پراگندہ اور منتشر نہیں کر دیا جاتا اس وقت تک وہ پونا میں رہ کر بھی اپنے آپ کو محفوظ تصوّر نہیں کر سکتا۔ اس مقصد کے لیے اس نے پہلے سے بھی کہیں بڑا اور منظم لشکر تیار کیا۔ اس بار وہ اَن گنت ہاتھی بھی جنگ میں لے کر آیا تھا اور بڑی برق رفتاری سے کوچ کرتا ہوا وہ بالا گھاٹ سے ہوتا ہوا سادُنور کی طرف بڑھا تھا۔

حیدر علی کا لشکر گو تعداد میں سوامی سے بہت کم تھا لیکن اس بار اس نے اپنی حکمتِ عملی کو بدل دیا تھا۔ اسے جب سوامی کے کوچ کی اطلاع ملی تو اس نے قلعوں کو واپس لینے کا سلسلہ بند کر دیا اور اپنے لشکر کو لے کر وہ سیمو گہ اور لسبوا پٹن سے ہوتا ہوا سوامی کی طرف بڑھا۔ ہری ہر اور رہرنی کے مقامات سے اس نے دریائے تنگ بھدرا کو عبور کیا اور میدک کے علاقے میں اپنے لشکر کے ساتھ اس نے پڑاؤ کیا۔ دو روز بعد سوامی بھی اپنے لشکر کے ساتھ وہاں پہنچ گیا اور آتے ہی حیدر علی پر حملہ کر دیا۔

یہ پہلا موقع تھا کہ حیدر علی کھلے اور چٹیل میدان میں مرہٹوں کے سامنے آن کھڑا ہوا تھا۔ شام تک جنگ ہوتی رہی اور حیدر علی نے نصر الدین اور ہیبت جنگ کے ساتھ مل کر نہ صرف مرہٹوں کی پیش قدمی کو روک دیا تھا بلکہ ان پر اپنے طوفانی حملوں کی دہشت طاری کر دی تھی۔ شام کے قریب موسلا دھار بارش شروع ہو گئی اور جس علاقے کو میدانِ جنگ بنایا گیا تھا وہ دلدل کی صورت اختیار کرنے لگا تھا۔ اب وہاں رہ کر دشمن کو روکنا خطرناک تھا۔ لہٰذا حیدر علی نے وہاں سے کوچ کیا۔

اس عرصے میں گوپال راؤ بھی لشکر لے کر سوامی سے آ ملا تھا۔ حیدر علی پیچھے ہٹا چردلی اور انوٹی کے جنگل میں سے گزرنے کے بعد اس نے ایک بلند ٹیلے پر خندق اور مورچے بنا کر اپنا توپ خانہ نصب کرا دیا اور مرہٹوں کی پیش قدمی کا انتظار کرنے لگا تھا کھلے میدان میں سوامی کو روک کر حیدر علی نے جب اس پر بھرپور ضربیں لگائیں تو سوامی کے ذہن میں یہ اندیشہ جاگزین ہو گیا کہ مبادا حیدر علی کھلے میدان میں اپنے متحدہ لشکر کے ساتھ اسے شکست دے دے لہٰذا اس نے حیدر علی کے لشکر کی اجتماعیت ختم کرنے اور اسے مختلف حصّوں میں بانٹنے کا ارادہ کر لیا تھا۔

اس نے اپنے لشکر کو تین حصّوں میں تقسیم کیا۔ ایک حصّہ اپنے پاس رکھا۔ دوسرے حصّے کو حیدر علی کے ساتھ چھاپہ مار جنگ کے لیے تیار کیا اور تیسرے لشکر کا سالار گوپال راؤ کو بنا کر ان علاقوں میں تباہی مچانے کے لیے روانہ کیا جو حیدر علی نے ان سے چھین لیے تھے۔

حیدر علی کو بھی یہ خبریں پہنچ رہی تھیں۔ گوپال راؤ کی سرکوبی کے لیے اس نے نصر الدین کو مقرر کیا، چھاپہ ماروں سے نمٹنے کے لیے ہیبت جنگ کو لشکر کا یک حصّہ دے کر علیحدہ کر دیا اور خود وہ سوامی کے مقابلے کے لیے تیار ہو گیا تھا۔

گوپال راؤ نے اپنے لشکر کے ساتھ دریائے تنگ بھدرا کو عبور کیا اور بھری بہات میں اس نے اپنے سامنے آنے والے دیہات میں تباہی اور بربادی مچا دی تھی۔ ہرپن اور رائے درگ کے ہندو فوجدار جو حیدر علی کے حامی تھے ان سے اس نے زبردستی خراج کی رقم وصول کی اور کسی زخمی اور آدم خور درندے کی سی غارت گری کرتا ہوا وہ آگے بڑھا اور چیتل درگ کے علاقے میں داخل ہو گیا۔ وہ مطمئن تھا کہ کوئی اس سے مقابلہ کرنے والا نہیں۔ لہٰذا وہ اس سارے علاقے کو اپنی مرضی سے لوٹ کھسوٹ رہا تھا لیکن اسے یہ خبر نہ تھی کہ قدرت اس کے لیے عبرت کا سامان پیدا کر چکی تھی اور نصر الدین غصّے کی حالت میں سائے کی طرح اس کا تعاقب کرتا چلا آ رہا تھا۔

غارت گری اور قزاقی کے اپنے سارے سامان کے ساتھ گوپال راؤ بدرگ کے مقام پر پڑاؤ کیے ہوئے تھا کہ نصر الدین نے اسے آ لیا اور اس پر اپنی پوری خونخواری سے حملہ کیا۔ گوپال راؤ نے اپنے لشکر کو منظم کر کے اس حملے کو روکنا چاہا لیکن نصر الدین نے اسے مہلت نہ دی تھی۔ وہ ایسی سختی اور بے جگری سے حملہ آور ہوا تھا کہ مرہٹے ان کے سامنے جم نہ سکے۔ خود گوپال راؤ لڑتا ہوا نصر الدین کے ہاتھوں مارا گیا۔

اپنے سالار کے قتل ہوتے ہی مرہٹوں میں بدحواسی اور خوف و ہراس پھیل گیا اور وہ پونا کے رخ بھاگنے لگے۔ نصر الدین نے ان کا تعاقب کر کے تباہی مچا دی اور اکثر کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ بہت کم بچے جو جان بچا کر پونا کی طرف بھاگنے میں کامیاب ہوئے تھے۔

نصر الدین واپس لوٹا اور گوپال راؤ کے لشکر کے خیمے، ہتھیار و خوراک اور مقامی لوگوں سے ہتھیایا ہوا مال و دولت اسی دشمن کے گھوڑوں اور ہاتھیوں پر لادا اور جس راستے سے آ کر وہ گوپال راؤ پر حملہ آور ہوا تھا اسی راستے وہ دریائے تنگ بھدرا

کو عبور کرتا ہوا حیدر علی کی طرف روانہ ہو گیا تھا۔

سوامی نے جن چھاپہ ماروں کو حیدر علی کے لشکر پر چھاپے مار کر اسے پریشان رکھنے کے فرائض سونپے تھے ان کی حالت بھی گوپال راؤ سے مختلف نہ ہوئی۔ رات کی تاریکی اور موسلا دھار بارش میں ہیبت جنگ یوں ان کے اندر تک آن گھسا تھا جیسے کوئی تیندوا شکار کی غرض سے ہرنوں اور بارہ سنگوں کے غول میں داخل ہوتا ہے۔

چھاپہ ماروں کو جب یہ خبر ہوئی کہ غنیم ان کے اندر تک گھس آیا ہے تو وہ بھاگ کھڑے ہوئے لیکن اب جب کہ ہیبت جنگ ان کے وسط میں آ کر جنگ کر رہا تھا اس سے بچ کر بھاگ نکلنا کوئی ایسا آسان کام اور سہل فعل نہ تھا۔ ہیبت جنگ نے ان میں سے اکثر کو تہ تیغ کر دیا۔ گنتی کے کچھ چھاپہ مار صحرا میں بھاگنے والے اندھے اونٹ کی طرح جدھر منہ اٹھایا بھاگ کھڑے ہوئے تھے۔

ہیبت جنگ دشمن کے اس چھاپہ مار لشکر سے چھینے ہوئے پانچ ہزار گھوڑے اور سامان سے لدے ہوئے انیس ہاتھی اور نوے اونٹ لے کر حیدر علی کی طرف کوچ کر رہا تھا۔

جس وقت نصر الدین، گوپال راؤ اور ہیبت جنگ چھاپہ مار لشکر کے ساتھ برسرپیکار تھے۔ سوامی اپنے لشکر کے ساتھ حیدر علی پر حملہ آور ہوا۔ حیدر علی اور سوامی کے لشکر میں دس ایک سے بھی زیادہ کا تناسب تھا۔ مرہٹے جوق در جوق آگے بڑھتے رہے اور حیدر علی سے جنگ کرتے رہے۔ اس دوران ہیبت جنگ بھی حیدر علی کے پاس پہنچ گیا۔

دوسری طرف مرہٹوں نے اپنی چند دور مار توپیں ایک پہاڑی کے اوپر نصب کر دیں اور وہاں سے گولے داغ کر وہ حیدر علی کے لشکر کو ناقابل تلافی نقصان پہنچانے لگے تھے۔ حیدر علی کی اپنی توپیں بھی بلندی پر نصب تھیں لیکن مرہٹے ایسی جگہ مقیم تھے جہاں وہ ان توپوں کی زد میں نہ آتے تھے۔

حیدر علی نے غنیم کے توپ خانہ کو خاموش کرنے کے لیے اس پر شب خون

مارنے کا ارادہ کیا۔ ایک رات اس نے ہیبت جنگ کو پڑاؤ میں چھوڑا خود پانچ ہزار بندوقچیوں اور پندرہ سو جانباز سواروں کو چار توپوں کے ساتھ ہمراہ لیا اور دشمن کے توپ خانہ کی طرف بڑھا۔

لیکن وہ گھڑی ہی کوئی ایسی منحوس تھی کہ بارشوں کے باعث راستہ کی خرابی کی وجہ سے جنگل کو کاٹ کر راستہ بنانا پڑا۔ یہاں تک کہ مرہٹوں کے توپ خانہ کے نزدیک پہنچتے پہنچتے رات گزر گئی اور دن نکل آیا۔ مرہٹے حیدر علی کی آمد سے باخبر ہو گئے اور چاروں طرف سے حملے کرتے ہوئے اس پر ٹوٹ پڑے۔

حیدر علی نے توپوں سے گولے داغ کر دشمن کی اس پیش قدمی کو روکنا چاہا۔ لیکن بارش اور سردی میں توپیں ایسی ٹھنڈی ہوئی تھیں کہ لاکھ کوششوں کے باوجود ایک بھی نہ چلی۔ حیدر علی خود فتیلہ لے کر ایک توپ پر چڑھ گیا اور اس سے گولہ داغنا چاہا لیکن اسے ناکامی ہوئی تھی۔ بارش اور ٹھنڈک میں اس کا گولہ بارود بیکار ہو چکا تھا۔ اس دوران اس کے لشکری بڑی تندہی سے دشمن کے حملوں کو روکتے رہے لیکن مرہٹے کوؤں کی طرح ہجوم در ہجوم بڑھتے جا رہے تھے اور چاروں طرف سے انہوں نے بھرپور حملے شروع کر دیئے تھے۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ حیدر علی کا لشکر منتشر ہو کر رہ گیا تھا اور اس کے اکثر ساتھی مارے گئے۔ خود حیدر علی نے بڑی کوشش اور جتن سے جان بچائی اور بھاگ کھڑا ہوا۔ مرہٹے بھی ادھر ادھر تعاقب کرتے ہوئے اس کے حواریوں کو چن چن کر قتل کر رہے تھے۔

حیدر علی چھپتا چھپاتا جنگل میں گھس کر ایک گھنے درخت کے نیچے چھپ کر بیٹھ گیا۔ حسن اتفاق سے ایک طنبورہ بجانے والا وہاں سے گزرا، حیدر علی کو کوئی ترکیب سوجھی اس نے اس طنبورہ بجانے والے کو پکڑ لیا اور اسے کہا کہ وہ زور زور سے اپنا طنبورہ بجائے، وہ مان گیا اور زور زور سے طنبورہ بجانے لگا۔ طنبورے کی آواز سے مرہٹوں نے یہ اندازہ لگایا کہ حیدر علی کو کمک پہنچ گئی ہے لہٰذا وہ لشکر کو سمیٹ کر فوراً پیچھے ہٹ گئے۔

حیدر علی نے جنگل کے اندر اپنے بھاگتے ہوئے لشکریوں کو جمع کیا اور ابھی وہ واپس جانے کی تیاری کر رہا تھا کہ نصرالدین اور ہبیت جنگ اپنے لشکروں کے ساتھ وہاں پہنچ گئے۔ شاید انہیں حیدر علی کے حالات کی خبر ہو گئی تھی۔ حیدر علی فوراً پلٹا۔ نصرالدین اور ہبیت جنگ کو ساتھ لیا اور پیچھے ہٹتے مرہٹوں پر بھرپور حملہ کیا۔

سوامی نے اپنے سارے لشکر کو ایک جگہ جمع کر کے اس حملے کو روکنا چاہا۔ لیکن حیدر علی، نصرالدین اور ہبیت جنگ نے ایسی سختی سے حملہ کیا تھا کہ سوامی کے لشکر کی ساری صفیں اور تنظیم اُدھڑ کر رہ گئی تھی۔ سوامی نے اپنے لشکر کو سنبھالنے کی ہر کوشش کی لیکن ناکام رہا اور پھر جب اس کے لشکر میں یہ خبریں آئیں کہ گوپال راؤ کا لشکر اور چھاپہ مار مارے گئے ہیں تو مرہٹے جی چُرا کر پسپا ہونے لگے جس کے نتیجے میں سوامی کو شکست ہوئی۔ وہ پیچھے ہٹتا ہوا بنکا پور چلا گیا اور وہاں سے پونا روانہ ہو گیا۔

یہ ایک عبرت خیز شکست تھی جو سوامی کو حیدر علی کے ہاتھوں ہوئی تھی۔ سوامی کے چلے جانے کے بعد حیدر علی اپنے پڑاؤ میں واپس آ گیا تھا۔

بارش ابھی تک برس رہی تھی، شاید جھڑی لگ گئی تھی۔ حیدر علی، نصرالدین اور ہبیت جنگ ایک خیمے میں اکٹھے بیٹھے گذشتہ جنگ پر تبصرہ کر رہے تھے جب کہ ان کا لشکر آہستہ آہستہ برستی بارش اور سردی میں اپنے خیموں کے اندر آرام کر رہا تھا۔ آہستہ آہستہ اور تواتر کے ساتھ برستی بارش کے ہمدوش تیز ہوائیں چل رہی تھیں۔ جن سے خیموں کی بھیگی طنابیں ہل رہی تھیں اور سردی میں اضافہ ہو گیا تھا۔ اس موقع پر اسمٰعیل لشکرگاہ میں داخل ہوا۔ بارش اور کیچڑ کے باوجود وہ اپنے گھوڑے کو سرپٹ دوڑاتا ہوا آیا تھا اور اس کا گھوڑا بُری طرح ہانپ رہا تھا۔

اسمٰعیل اس خیمے کے سامنے آ کر اپنے گھوڑے سے اُتر گیا جس کے اندر حیدر علی، نصرالدین اور ہبیت جنگ بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ اسمٰعیل کا چہرہ اُترا ہوا تھا اور وہ سخت پریشانی کی حالت میں تھا۔ حیدر علی نے اُسے دیکھتے ہی پوچھ لیا۔ "کیا بات ہے

کیا تم ہمارے لیے کوئی بُری خبر لائے ہو؟ تمہاری بوکھلاہٹ اور پریشانی بتاتی ہے تم کوئی اچھی خبر نہیں لائے ہو"۔

اسمٰعیل نے کرب کی حالت میں نصرالدین کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "اے امیر! آپ اپنے گھر پہنچنے والی بات کیجیے۔ آپ کی ماں بسترِ مرگ پر پڑی آپ کی منتظر ہے۔ طبیب اس کے مرض سے مایوس ہو چکے ہیں۔ آپ دیر نہ کیجیے۔ کسی وقت بھی کوئی بُری خبر آپ کے لیے آ سکتی ہے۔ جب میں سرنگاپٹن سے روانہ ہوا تھا تو آپ کی ماں بے ہوش پڑی تھیں اور آپ کی اہلیہ ان کے پاس بیٹھی رو رہی تھیں۔ مجھے انہوں نے آپ کو فوراً روانہ کرنے کے لیے کہا تھا۔ اب صرف ماں کا منہ دیکھنے والی بات ہے۔ خدا کرے آپ ایسا کر سکیں"۔

نصرالدین بدحواس ہو کر اُٹھ کھڑا ہوا۔ اس کے چہرے پر ہوائیاں اُڑنے لگی تھیں اور رنگ فق ہو گیا تھا۔ نصرالدین کچھ کہنے والا تھا کہ حیدر علی نے ہبیت جنگ کے کان میں سرگوشی کرتے ہوئے کہا۔ "تم نصرالدین کے گھوڑے پر زین ڈالو، میں اسے لے کر آتا ہوں"۔ ہبیت جنگ بھاگتا ہوا خیمے سے باہر نکل گیا تھا۔

حیدر علی نصرالدین سے قریب ہوا اور اس کے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے اس نے کہا۔ "تم فوراً یہاں سے روانہ ہو جاؤ بیٹے! میں نے اس احتیاط کے ساتھ یہاں چند روز اور قیام کرنے کا اقدام کیا تھا کہ مبادا مرہٹے پلٹ کر پھر ہم پر حملہ آور ہو جائیں لیکن اب میں اپنا ارادہ بدل چکا ہوں اور تمہارے پیچھے پیچھے میں بھی لشکر کے ساتھ سرنگاپٹن کی طرف کوچ کرتا ہوں۔ میں تمہیں اپنے ساتھ ہی لے کر چلتا لیکن لشکر کی رفتار سست ہو گی جب کہ تمہارا فی الفور گھر پہنچنا ضروری اور اہم ہے۔ خدا خاتون کو صحت دے وہ ایک نیک اور عظیم عورت اور ایک شفیق و مہربان ماں ہے"۔

نصرالدین گم صم اور خاموش کھڑا تھا۔ حیدر علی نے اس کا بازو پکڑتے ہوئے کہا۔ "میرے ساتھ آؤ"۔ حیدر علی اُسے لے کر خیمے سے باہر آیا۔ دائیں طرف سے ہبیت جنگ نصرالدین کے گھوڑے پر زین ڈال کر لا رہا تھا۔ نصرالدین نے اپنے آپ کو سنبھالا

حیدر علی، ہیبت جنگ اور اسمٰعیل سے اُس نے مصافحہ کیا پھر وہ ایک زہریلی زقند کے ساتھ اپنے گھوڑے پر سوار ہُوا اور اُسے ایڑ لگا کر مشرق کے رُخ پر سرپٹ دوڑانے لگا تھا۔

آدھی رات کے قریب جب کہ بارش کی رِم جھم جاری تھی اور جاڑے کی سرد ٹھٹھرتی ہوائیں بھیگی فضاؤں میں سائیں سائیں کر رہی تھیں۔ نصرالدین اپنی حویلی کے دروازے پر دستک دے رہا تھا۔ تیز ہواؤں کے دوش پر حویلی کے اندر سے ایک آواز گونجی "کون ہے؟" نصرالدین آواز پہچان گیا وہ صالحہ کی آواز تھی۔ اس نے پھر دستک دیتے ہوئے کہا "دروازہ کھولو بوا! مَیں نصرالدین ہوں"۔

جلد ہی حویلی کا دروازہ کھُل گیا اور صالحہ سامنے کھڑی تھی۔ نصرالدین سے اس کے گھوڑے کی باگ لیتے ہوئے صالحہ نے کہا "تم اندر جاؤ بیٹے! مَیں گھوڑے کو اصطبل میں لے جا کر اور اس کی زین اُتار کر اسے چارہ ڈالتی ہوں۔ نصرالدین آگے بڑھ گیا۔ صالحہ نے حویلی کا دروازہ پھر بند کر دیا اور گھوڑے کو اصطبل کی طرف لے گئی تھی۔

نصرالدین اپنی ماں کے کمرے میں داخل ہُوا۔ سامنے ایک صاف ستھرے پلنگ پر خولہ بے سُدھ پڑی تھی۔ اس کے قریب سمیتا پلنگ پر بیٹھی اپنا سر گھٹنوں میں دبائے ہچکیوں اور سسکیوں میں رو رہی تھی اور کمرے میں آتش دان روشن تھا۔ بارش میں لگاتار سفر کرتے ہوئے نصرالدین کے کپڑے نچڑ رہے تھے۔ جب وہ کمرے میں داخل ہُوا تو سمیتا آہٹ پا کر چونکی۔ نصرالدین کو دیکھتے ہی وہ پلنگ سے اُتر گئی اور اپنے آنسو پونچھتے ہوئے اس نے کہا "آپ آ گئے؟"

نصرالدین نے شکستہ سی آواز میں پوچھا "ماں کیسی ہے؟" بڑی ہی بے بسی کے عالم میں سمیتا نے ہونٹ کاٹتے ہوئے کہا "آپ کے جانے کے بعد ان کی حالت اور زیادہ خراب ہو گئی تھی۔ کافی کافی دیر بے ہوش پڑی رہتی ہیں۔ تھوڑی دیر کے لیے ہوش میں آتی ہیں اور دوبارہ غنودگی سی طاری ہو جاتی ہے۔ جب بھی ہوش میں آتی ہیں سب سے پہلے آپ کا پوچھتی ہیں۔ اس وقت بھی بے ہوش پڑی ہیں"۔

نصرالدین آگے بڑھ کر گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا اور اپنی ماں کے پاؤں چومنے لگا۔ سمیتا بھاگتی ہوئی دوسرے کمرے میں گئی اور نصرالدین کے لیے دُھلا ہُوا ایک صاف ستھرا لباس اور بھاری اُونی کمبل اُٹھا لائی۔ ماں کے پاؤں کے پاس ابھی تک گھٹنوں کے بل بیٹھے ہوئے نصرالدین کا بازو پکڑ کر اُوپر اُٹھاتے ہوئے اس نے اپنی آواز کے رس اور محبت سے کہا "اُٹھیے پہلے دوسرے کمرے میں جا کر کپڑے بدل لیجیے آپ کا لباس بھیگا ہُوا ہے کہیں سردی نہ لگ جائے"۔ نصرالدین چُپ چاپ اُٹھا سمیتا سے کپڑے اور کمبل لے کر دوسرے کمرے میں چلا گیا۔

تھوڑی ہی دیر بعد وہ واپس لوٹا۔ اس نے اپنے بھیگے کپڑے بھی اُٹھا رکھے تھے۔ سمیتا لپک کر آگے بڑھی۔ نصرالدین سے بھیگے کپڑے لے کر اس نے پچھواڑے کے برآمدے میں بندھی ہوئی رسی پر پھیلا کر ڈال دیئے تھے۔ نصرالدین ماں کے پلنگ پر بیٹھ گیا تھا۔

رسّی پر کپڑے ڈالنے کے بعد سمیتا بھی نصرالدین کے پاس پلنگ پر آ کر بیٹھ گئی تھی۔ اتنے میں صالحہ کمرے میں آئی اور نصرالدین کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "بیٹے! تم دونوں بیٹھو مَیں کھانا تیار کرتی ہوں"۔ نصرالدین نے بیزاری سے کہا "رہنے دو بوا! مجھے بھوک نہیں ہے"۔

صالحہ نے بڑی دردمندی سے کہا "سمیتا نے بھی کل کی کوئی چیز منہ میں نہیں ڈالی تمہارے ساتھ یہ بھی کچھ کھالے گی"۔ نصرالدین نے احتجاجی انداز میں سمیتا کی طرف دیکھا پھر صالحہ سے کہا "پھر کھانا تیار کرو بوا! مَیں بھی کھاؤں گا اور میرے ساتھ سمیتا بھی کھالے گی"۔ صالحہ مُڑ کر باورچی خانے کی طرف چلی گئی۔ نصرالدین اور سمیتا دیر تک خولہ کے ہوش میں آنے کا انتظار کرنے لگے تھے۔

تھوڑی ہی دیر میں خولہ نے حرکت کی۔ ساتھ ہی اس نے باریک، مدھم اور ڈوبتی آواز میں پکارا "سمیتا! سمیتا!" ——— سمیتا آگے ہوئی اور اپنا منہ خولہ کے چہرے کے قریب لے جاتے ہوئے کہا "کہو ماں! کیا بات ہے؟" خولہ کی پھر ڈوبتی آواز

سنائی دی "میری بچی! اس گھر میں ہوش سے رہنا ۔ نصرالدین نہیں آیا ؛"

نصرالدین نے خولہ کا ہاتھ تھامتے ہوئے خود ہی کہا "میں آگیا ہوں ماں"

خولہ چند ثانیئے کھینچ کھینچ کر لمبے سانس لیتی رہی پھر بڑی مشکل سے کہا "تم دونوں ایک دوسرے کا خیال رکھنا، میری روح خوش ہوگی ۔ صالحہ کو اپنے سے علیحدہ نہ کر، وہ ایک اچھی ——— اس سے آگے خولہ کچھ نہ کہہ پائی ۔ اس کی گردن ایک طرف ڈھلک گئی اور وہ دم توڑ گئی تھی ۔

سمیتا خولہ سے لپٹ گئی اور دھاڑیں مار مار کر رونے لگی تھی ۔ پھر اس نے علیحدہ ہو کر جب نصرالدین کی طرف دیکھا تو وہ بے چاری پس کر رہ گئی تھی ۔ رعد و برق سے کھیلنے والا اور طوفان و آندھی سے ٹکرا جانے والا نصرالدین بت کی طرح خاموش بیٹھا تھا ۔ اس کی آنکھیں بند تھیں اور ان سے موسلا دھار بارش کی طرح آنسو گر رہے تھے ۔ سمیتا یہ سب کچھ برداشت نہ کر سکی ۔ وہ بڑی طرح نصرالدین سے لپٹ گئی اور اس کی چھاتی پر سر رکھ کر بلک بلک کر رونے لگی تھی، اب وہ اس کی بیوی جو تھی ۔

دونوں میاں بیوی رو رہے تھے ۔ سمیتا کے آنسو نصرالدین کا دامن بھگو رہے تھے جب کہ نصرالدین کے آنسو سمیتا کے سر پر گر رہے تھے ۔ باہر اسی طرح جاڑے کی ٹھٹھری ہوائیں سائیں سائیں کر رہی تھیں اور بارش کی رم جھم جاری تھی

صحرا کا ابلیس

اسلم راہی

ایم ۔ اے

صحرا کی وہ رات گہری اور خاموش تھی ۔ جاڑے کی تیز اور سرد منجمد مون سونی ہوائیں صحرا میں چیخ چلا رہی تھیں ۔ دریائے فرات کے کنارے کنارے جنوب کی طرف ایک سوار اپنا گھوڑا سرپٹ دوڑاتا جا رہا تھا ۔ اس کی سفید عبا اور عمامہ تیز ہواؤں میں پھریرے لیتے ہوئے اڑ رہے تھے ۔

وہ ایک حسین اور تنا ور درختوں کی طرح مضبوط عرب تھا ۔ اس کے ہاتھ درندوں کے پنجوں کی طرح مضبوط تھے اور اس کی بھیڑیے جیسی بھوری آنکھیں اس پتلی سی پگڈنڈی پر جمی ہوئی تھیں جس پر اس کا گھوڑا بھاگ رہا تھا اور یہ پگڈنڈی دریائے فرات کے کنارے جنگلی درختوں اور جھاڑیوں میں سے ہو کر گزرتی تھی ۔

دفعتاً اس نے اپنے گھوڑے کی باگیں کھینچ لیں ، جیسے صحرا کے اندر اچانک وہ خطرے کی بو پا گیا ہو ۔ اس کا گھوڑا اگلی دونوں ٹانگیں اوپر اٹھاتے ہوئے احتجاجاً ہنہنایا اور رک گیا ۔

اپنے گھوڑے کی پیٹھ پر وہ اس انداز سے بیٹھ گیا جیسے کچھ سننے کی کوشش کر رہا ہو پھر رات کی پُراسرار تنہائی میں اس کے کانوں میں ایک آواز پڑی طنبورے کی لے پر کسی کے گانے کی دھیمی دھیمی آوازیں ۔ اس نے اپنے گھوڑے کو ایک ڈنڈی سے تاکر دریائے فرات کے کنارے کنارے جنگلی درختوں کو عبور کیا ۔ چاندنی رات میں اُفق تک نظر آنے والے سفید صحرا میں داخل ہوا اور آواز کی سمت اپنے گھوڑے کو سرپٹ دوڑانے لگا ۔ طنبورے کی آواز اب لمحہ بہ لمحہ تیز ہوتی جا رہی تھی ۔

وہ ابھی تھوڑی دور ہی گیا تھا کہ اسے اپنے سامنے چاندی کی طرح چمکتے ہوئے سفید صحرا میں کھجوروں کا ایک جھنڈ دکھائی دیا جس کے اندر خیمے نصب تھے خیموں کے سامنے ایک الاؤ روشن تھا جس کے گرد اَن گنت مرد اور عورتیں جمع تھے اور درمیان میں ایک لڑکی رقص کر رہی تھی ۔

کھجوروں کے جھنڈ کے پاس جا کر وہ اپنے گھوڑے سے اترا اور گھوڑے کی باگ پکڑ کر ایک کھجور کا سہارا لے کر کھڑا ہو گیا ۔ وہ خانہ بدوشوں کا کوئی قبیلہ تھا جس نے دریائے فرات کے کنارے کھجوروں تلے پڑاؤ کر رکھا تھا ۔

آگ کے جلتے ہوئے الاؤ کے گرد بے شمار عورتیں مرد کھڑے تھے ان کے درمیان چٹائی پر ایک دیو قامت اور خشخشی داڑھی والا نوجوان بیٹھا تھا جو شاید ان کا سردار تھا ۔ اس کے چہرے پر درندگی اور آنکھوں میں شعلے تھے ۔ سردار کے پاس ہی ایک نوجوان طنبورہ بجا رہا تھا جس کی لے پر ایک حسین خانہ بدوش لڑکی رقص کر رہی تھی ۔ اس کا جسم بھرا بھرا ، آنکھیں چمکیلی اور چہرے پر کنوارپنے کی تازگی تھی ۔ اس کا جسم پکے ہوئے لسوڑے کی طرح بھرپور اور رس دار تھا اور اس کی آنکھوں میں ایک پُراسرار تنہائی تھی ۔ اس کے ایک ہاتھ میں کھجور کی ٹہنی اور دوسرے ہاتھ میں لمبے لمبے ڈنٹھلوں والے بسنتی رنگ کے جنگلی پھول تھے ۔

آگ کے جلتے ہوئے الاؤ میں لکڑیاں چٹخ رہی تھیں ۔ پھر وہ نوجوان جو طنبورہ بجا رہا تھا جس کا چہرہ پتھر کی طرح سخت اور آگ کے روشن الاؤ کے سامنے تانبے کی طرح دمک

رہا تھا حرکت میں آیا۔ اس کے ہونٹ کھلے پھر وہ طنبورے کی لَے اور لڑکی کے رقص کی تال پر گانے لگا۔ اس کا گانا عربی میں تھا جس کا مفہوم کچھ یوں بنتا تھا۔

"ہماری نوائیں گرم صحرا کا گیت ہیں۔
سورج جب اپنی آب و تاب سے فروزاں ہوتا ہے۔
ہم تندرست جسم واحد کی طرح صحرا کا سینہ چیرتے سفر کرتے ہیں۔
چمکتی اور جوت پھیلاتی دھوپ ہمیں ایسی ہی عزیز ہے۔
جیسی ان کو نیلوں کو جو سورج کی گرم شعاعوں کو پیتی ہیں۔
ہماری نوائیں گرم صحرا کا گیت ہیں۔
ہم مستقل آباد ہونے کے لیے زمین کا ٹکڑا خریدنے کے لیے پیسے کیوں جمع کریں۔
جب کہ رات کی تاریکی صحرا میں ایک ماں کی طرح ہماری حفاظت کرتی ہے۔
ہم لالچ اور بیکراں آرزوؤں کے سرسام کا شکار نہیں ہوتے۔
صحرا سے ہماری محبت جھاگ سے آشنا اور بلور کی طرح شفاف لہروں جیسی ہے۔
ہماری نوائیں گرم ہوا کا گیت ہیں۔

مغنی طنبورہ بجاتے ہوئے گاتا رہا۔ آگ جل رہی تھی گیت جاری تھا۔ خانہ بدوش لڑکی رقص کر رہی تھی اور آگ کے شعلے پیچ و تاب کھا رہے تھے اور اوپر اٹھ رہے تھے۔ چاند کھجوروں کے جھنڈ پر آ کر جیسے رُک گیا تھا۔ طنبورے، گانے کی آواز اور لڑکی کے جواں رقص نے ایسا سماں باندھا تھا جیسے آواز کی وہ جھنکاریں پوری کائنات کی موسیقی بن گئی ہوں۔ رات دم بخود تھی۔ ہوا ساکن، ستارے خاموش اور کھجوروں کے دل دھڑک رہے تھے۔ آوازوں اور رقص کی اس گھلاوٹ پر گویا دن بھر کا تھکا ہارا صحرا اپنے ذرّے ذرّے کے ساتھ جاگ اُٹھا تھا۔

وہ اجنبی کھجور کے کسی تنہا درخت کی طرح وہاں کھڑا لڑکی کے جسم کا جستہ جستہ جائزہ لے رہا تھا۔ لڑکی بھی بار بار ارد گرد بیٹھے لوگوں سے نظریں چُرا کر اس حسین اجنبی کی طرف دیکھ کر ہلکے ہلکے مسکرا دیتی تھی۔

اچانک مغنی کے ہونٹ ساکن ہو گئے اور طنبورے پر کھیلتی ہوئی اس کی انگلیاں رُک گئیں۔ رقص کرتی ہوئی لڑکی نے بھی رقص ختم کر دیا اور روشن الاؤ کے قریب جا کر کھڑی ہو گئی۔ اسی دم خشخشی داڑھی اور مضبوط جسم والا سردار اُٹھا اور بڑی مشغن آمیز چال کے ساتھ وہ کھجور سے ٹیک لگا کر کھڑے اس اجنبی کی طرف بڑھا جو ابھی تک اپنے ماحول سے بے خبر حسین خانہ بدوش رقاصہ کو دیکھ رہا تھا۔

خانہ بدوش سردار نے بھاری رعب دار آواز میں پوچھا۔

"کون ہو تم؟"

اجنبی چونک پڑا اور اپنا ہاتھ اپنی تلوار کے دستے پر لے جاتے ہوئے بولا "مسافر ہوں۔ دریا کے کنارے سفر کر رہا تھا، گانے کی آواز سن کر چلا آیا۔"

سردار نے خشک کھردرے لہجے میں کہا۔

"جاؤ چلے جاؤ۔"

اجنبی کے چہرے پر گھلے ہوئے رنگوں کی طرح سختی بکھر گئی۔ اپنی بپھرتی ہوئی آواز میں اس نے کہا۔

"اگر میں نہ جاؤں پھر؟"

سردار نے فیصلہ کُن انداز میں کہا۔ "تمہارا سر کاٹ دیا جائے گا۔"

اجنبی کے چہرے پر درندگی پھیل گئی تھی۔ وہ اپنی تلوار بے نیام کرنے لگا تھا کہ اس کی اور خانہ بدوش لڑکی کی نگاہوں میں تصادم ہوا۔ لڑکی آنکھوں میں ایک بے کسی اور التجا تھی جیسے وہ اس سے چلے جانے کی بھیک مانگ رہی ہو۔ اجنبی نے اپنی تلوار کے دستے سے ہاتھ ہٹا لیا اور اپنے گھوڑے کی طرف بڑھا اور رکاب میں پاؤں جماتے ہوئے سردار کی طرف شوخ نگاہوں اور مسکراتے چہرے کے ساتھ گھورتے ہوئے کہا۔

"میں بنو ایاد کا عدی بن نصر ہوں اور اب روزانہ یہاں آتا رہوں گا۔"

سردار نے کڑکتی آواز میں کہا۔ "تو اپنے ساتھ ایسے آدمی بھی لے کر آنا جو

تمہاری لاش اُٹھا کر لے جائیں"۔

اجنبی نے ایک بھرپور غیر مانوس قہقہہ لگایا۔

"تمہاری غلط فہمی ہے۔ مَیں جنگ کے اندر ہزاروں میں اُتر جانے کی جرأت رکھتا ہوں۔ مَیں اکیلا آؤں گا اگر تم بزدل نہیں ہو تو اپنا پڑاؤ یہیں رکھنا۔ مَیں کل رات کو پھر آؤں گا۔ رات کے اسی وقت اگر روک سکو تو روک لینا لیکن ایک بات ذہن میں رکھنا مَیں بنو ایاد کا وہی پہلوان ہوں جس کی شجاعت اور بہادری کی داستانیں خوشبوؤں کی طرح صحراؤں میں پھیلی ہوئی ہیں۔ مَیں بنو ایاد کے سردار کا بھانجا عدی بن نصر ہوں"۔

سردار نے ہونٹ کاٹتے ہوئے کہا۔

"مَیں کل رات تمہارا انتظار کروں گا اگر تم بزدل نہیں ہو تو تم ضرور آؤ گے اور یہ بات ذہن میں رکھ کر ہمارے پڑاؤ کا رُخ کرنا کہ میں اس خانہ بدوش قبیلے کا سردار ہوں اور میری ساری زندگی صحرا کے طوفانوں اور پہاڑوں کی کٹھنائیوں سے لڑتے ہوئے گزری ہے۔ یاد رکھو جو شخص فطرت کے اِن سرکش عناصر سے بھڑ جانے کی قدرت رکھتا ہو۔ اس کے سامنے تمہاری حیثیت کھنڈرات میں اُگے ہوئے خس و خاشاک سے زیادہ نہ ہوگی۔ مَیں تمہیں یقین دلاتا ہوں آنے والی رات تمہاری زندگی کی آخری رات ہوگی۔

اجنبی جس نے اپنا نام عدی بن نصر بتایا تھا گھوڑے پر سوار ہو گیا۔ اس کے چہرے پر بے شمار اُبھار نے، اُکسانے اور مزاج میں برہمی کا خلجان پیدا کرنے والے رنگ بکھرے ہوئے تھے تاہم اس نے اِس خانہ بدوش لڑکی پر ایک اچٹتی سی نگاہ ڈالی اپنے گھوڑے کی باگیں موڑیں اور جس طرف سے آیا تھا اُدھر ہی روانہ ہو گیا۔

جب وہ دریائے فرات کے کنارے جنگل سے گزر کر اس پتلی جگہ

اپنے گھوڑے کی باگیں کھینچ لیں۔ جنگل میں بکھرے ہوئے خشک پتوں پر کسی کے قدموں کی آواز سُنائی دی تھی جیسے سرما کی تیز طوفانی ہوائیں خشک پتوں کو روندتے ہوئے گزر گئی ہوں۔ اس نے اپنی تلوار نیام سے کھینچ لی اور مقابلہ کرنے کے لیے چیتے کی طرح مستعد ہو کر اپنے گھوڑے پر بیٹھ گیا۔

جب چند لمحوں تک کوئی ردِ عمل ظاہر نہ ہوا تو اس نے اپنی غراتی دھاڑتی آواز میں کہا۔

"سامنے آ کر میرا راستہ روکو تاکہ مَیں دیکھوں میرا دشمن کون ہے"۔

اس کے ساتھ ہی اس نے اپنے گھوڑے کی خرجین سے خود نکال کر سر پر پہن لیا اور بائیں ہاتھ میں اپنی ڈھال پکڑتے ہوئے اس نے دوبارہ چنگھاڑ کر کہا۔

"اگر تم چھپ کر تیر چلانا چاہتے ہو تو تمہیں مایوسی ہوگی۔ میرے جسم پر ذرہ اور سر پر خود ہے جنہیں تیر چیر پھاڑ نہیں سکتے"۔

ہکلاتی ہوئی ایک بدحواس آواز سُنائی دی "مَیں تمہارا دوست ہوں"۔

عدی بن نصر نے اس بار ملائم آواز میں کہا۔ "اگر تم دوست ہو تو سامنے آؤ۔ مَیں تمہاری قدر کروں گا"۔

خشک پتوں پر کسی کے چلنے کی آوازیں سُنائی دیں پھر جھاڑیوں کے ایک جھنڈ سے ایک بوڑھا نمودار ہوا اور عدی کے سامنے کھڑے ہوتے ہوئے وہ اُسے التجا بھری نظروں سے دیکھنے لگا۔ عدی نے اُسے حوصلہ دلاتے ہوئے پوچھا

"تم کیا چاہتے ہو؟"

بوڑھا چند قدم آگے چل کر بولا۔

"سنو! میرا نام عوف ہے۔ میرا تعلق اس خانہ بدوش قبیلے سے ہے جس سے تم لوٹ رہے ہو اگر تم بنو ایاد کے عدی بن نصر ہو تو مَیں جانتا ہوں، تم بہادر اور شجاع ہو اور اس صحرا کی ساری بستیوں اور نخلستانوں میں کوئی بھی تمہاری تلوار کے آگے نہیں ٹھہر سکتا۔ اس کے باوجود مَیں تمہیں متنبہ کروں گا، کہ

کل رات ہمارے پڑاؤ میں مت آنا۔ اگر تم رقص کرنے والی لڑکی کو پسند کر کے اسے اپنانے کا عہد کر چکے ہو تو پھر آنے والی رات ہمارے سردار سے اپنی پوری ہوشمندی کے ساتھ مقابلہ کرنا۔ وہ چیتے کی طرح خونخوار اور چیتل کی طرح تیز اور طرار ہے"۔

عدی نے زرد آنکھ والے چیتے اور زہریلے سیاہ ناگ کی طرح بوڑھے عوف کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"جب کہ تمہارا تعلق اسی خانہ بدوش قبیلے سے ہے تم اپنے سردار کے خلاف میری حمایت میں کیوں بول رہے ہو"۔

بوڑھے عوف کی گردن جھک گئی۔

"مجھے اس سے نفرت ہے"۔

"کیوں؟"

"تم نے دیکھا جو لڑکی طنبورے کی لے پر الاؤ کے پاس قدیم جنگلی رقص کر رہی تھی سردار عنقریب اس سے شادی کرنے والا ہے۔ جس لڑکی کو بھی وہ پسند کرتا ہے اور اس سے شادی کرنے کا ارادہ رکھتا ہے وہ کچھ عرصہ اسی طرح اس کے سامنے رقص کرتی رہتی ہے پھر وہ اس سے شادی کر لیتا ہے۔ سردار نے اسی طرح میری لڑکی سے بھی شادی کی تھی اور جب اس خون آشام بھیڑیے کی طبیعت اس سے اکتا گئی تو اس ظالم نے اسے قتل کر کے صحرا کی تپتی ریت میں دفن کر دیا۔ بس اسی روز سے میں اس درندے کے خلاف ہوں"۔

"اگر میں تمہارے سردار سے تمہاری بیٹی کے قتل کا انتقام لوں پھر؟"

"میں تمہارے ساتھ ہوں گا"۔

"تمہارے سردار کے ساتھ میرے مقابلے کی صورت میں تمہارے خانہ بدوش قبیلے کا کیا ردِ عمل ہو گا"۔

"قبیلے کے زیادہ تر لوگ سردار کے خلاف ہیں۔ مقابلے کی صورت میں یقیناً ان کا رویہ غیر جانبدارانہ ہو گا۔ پر رات کے اس وقت تم اپنے قبیلے سے نکل کر کہاں جا رہے ہو؟"

"بنو قسطورا میں۔ ان کی ملکہ الزباء نے مجھے اپنے قبیلے کے سب سے ماہر تیغ زن کے ساتھ لڑنے کی دعوت دی ہے۔ اگر میں یہ مقابلہ جیت گیا تو مجھے پانچ ہزار دینار سرخ ملیں گے"۔

عوف نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"اتنی بڑی رقم کا کیا کرو گے؟"

"میرے قبیلے میں میٹھے پانی کی کمی ہے اس رقم سے میں اپنے پڑوسی قبیلے بنو لخم سے پانی کے چشمے خرید دوں گا جن سے میرے قبیلے کی پیاسی زمین سیراب ہو سکے گی"۔

بوڑھے عوف نے پھر پوچھا۔ "کیا تم کل رات ہمارے قبیلے میں آنے پر سنجیدہ ہو"۔

"ہاں میں ضرور آؤں گا"۔

"تو میں انتظار کروں گا"۔

بوڑھا عوف اپنے پڑاؤ کی طرف چلا گیا۔ عدی دریائے فرات کے کنارے آیا اور دوبارہ وہ اس تنگ جنگلی پگڈنڈی پر اپنا گھوڑا دوڑا رہا تھا۔ چاندنی رات میں جب کہ ہر چیز پر تنہائی اور خود فراموشی برس رہی تھی اور دہقانی ہوائیں تیز ہو گئی تھیں۔ وہ اپنا گھوڑا جنوب کی طرف بگٹٹ دوڑاتا جا رہا تھا۔

یہ زمانہ قبل از اسلام کا وہ دور تھا جب حضرت عیسٰیؑ کو رخصت ہوئے پچاس برس گزر گئے تھے۔ حضرت عیسٰیؑ سے قبل یمن سے کچھ عرب قبائل ہجرت کر کے عراق میں حیرہ اور فرات کے درمیان اطراف انبار تک آباد ہو گئے تھے ان قبائل میں بنو ارم بنو ازد، بنو ایاد، تنوخ، نمارہ لخم، تمیم، کلب اور ہم کے قبائل شامل تھے۔

جب عراق میں طوائف الملوکی کا دور شروع ہوا تو ان عرب قبائل نے اس سے پورا پورا فائدہ اٹھایا اور وسیع علاقوں پر قبضہ کر کے اپنی خود مختار حکومتیں قائم کر لیں۔

بنوازدکے سردار مالک بن فہم نے عمان سے لے کر مشرق میں دور دور تک پھیلے ہوئے نخلستان پر اپنی حکومت قائم کر لی - یہ وہی مالک بن فہم ہے جس نے منجنیق ایجاد کی تھی - بنوازد کے مقابلے میں بنوقسطورا کے سردار عمر بن انطراب نے دریائے فرات سے ملحقہ علاقوں پر قبضہ کر کے اپنی حکومت جمالی اور خابور و قرقیسیا کے درمیان ایک خوبصورت وادی میں اپنا دارالحکومت تعمیر کر لیا -

اِن دو بڑے قبیلوں کے درمیان دوسرے عرب قبائل نخلستانوں میں آباد ہو چکے تھے اور یہ سب بُت پرست تھے - بنوازد اور بنوقسطورا اکثر آپس میں جنگ کرتے رہتے تھے - بنوازد کے حکمران مالک بن فہم کے مرنے پر اس کا بیٹا جذیمہ بنوازد کا حکمران بنا اور اس نے بنوقسطورا سے نہ ختم ہونے والی جنگوں کی بساط لپیٹ دی - جذیمہ کے ہاتھوں ایک جنگ میں بنوقسطورا کے حکمران عمرو بن انطراف مارا گیا اور اس کی جگہ اس کی بیٹی جس کا نام نائلہ تھا ملکہ الزباء کے نام سے حکومت کرنے لگی -

تخت نشین ہوتے ہی اس لڑکی نے اس دیوتا پر ہاتھ رکھتے ہوئے جس کی پوجا کرتی تھی قسم کھائی کہ وہ بنوازد کے حکمران جذیمہ سے اپنے باپ کے قتل کا بدلہ لے گی - ملکہ الزباء ایک جوان اور حسین ترین لڑکی تھی اور لوگ اُسے گرم صحراؤں کا حسین گلاب کہہ کر پکارتے تھے - اس کی عمر اس وقت صرف چودہ برس تھی -

بنوایاد کا عدی بن نصر ایک تاریخی شخصیت تھی - وہ بے حد حسین، شجاع اور ایک ہی وقت میں وہ کئی سپاہیوں سے مقابلہ کر سکتا تھا - اس لیے جذیمہ اور ملکہ الزباء دونوں کی کوشش تھی کہ وہ عدی کو اپنی افواج کا سپہ سالار بنا کر اپنی قوت میں اضافہ کر لیں اور اب عدی ملکہ الزباء کی دعوت پر اس کے تیغ زنوں اور پہلوانوں سے لڑنے جا رہا تھا -

صرف ایک ساعت کے سفر کے بعد وہ ملکہ الزباء کے دارالحکومت کی فصیل کے مغربی دروازے پر دستک دے رہا تھا - پہریداروں نے چھوٹا دروازہ کھولا اور مشعلوں کی روشنی باہر پھینکتے ہوئے پوچھا -

"کون ہو تم ؟"

عدی اپنے گھوڑے سے اُتر کر بولا -

"مَیں بنوایاد کا عدی بن نصر ہوں - تمہاری ملکہ نے مجھے اپنے پہلوانوں سے مقابلہ کرنے کی دعوت دی تھی مَیں اسی دعوت پر آیا ہوں" -

پہریداروں نے دروازہ کھول دیا اور بڑی گرمجوشی سے اس کا استقبال کرتے ہوئے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا اور اسی وقت اسے اپنی ملکہ کے پاس لے گئے - عدی نے اپنا گھوڑا باہر کھڑا کیا اور ایک رہبر کے پیچھے پیچھے وہ محل میں داخل ہوا -

ملکہ الزباء کو عدی کے پہنچنے کی اطلاع ہو چکی تھی لہٰذا اس نے اپنی خواب گاہ سے باہر آ کر بڑی خوشدلی سے مُسکراتے ہوئے اِس کا استقبال کیا اور اس کا ہاتھ تھام کر وہ اسے اپنی خواب گاہ میں لے گئی - الزباء کو اسے اپنی خواب گاہ میں لے جانا عدی کے لیے ایک بہت بڑا اعزاز تھا کیونکہ الزباء ایک ایسی حسین اور خودسر لڑکی تھی جسے صحرا کا کوئی بھی جوان سَر نہ کر سکا تھا اور اس نے اَن گنت تڑپتے دِلوں کو آج تک اپنا حسین اور چمکتا ہوا چہرہ نہ دکھایا تھا -

الزباء کے کہنے پر عدی ایک جگہ بیٹھ گیا اور کافوری شمعوں کی روشنی میں اس نے پہلی بار غور سے الزباء کی طرف دیکھا - اس کا فرجمال حسینہ کا شباب اُمنگوں کا اُبلتا ہوا ایک چشمہ تھا - اس کے آلوچے جیسے ہونٹوں اور گہری سیاہ آنکھوں میں ایک سحرکاری تھی -

عدی اپنے ذہن میں الزباء اور اس خانہ بدوش لڑکی کا موازنہ کرنے لگا - اس خانہ بدوش لڑکی کے مقابلے میں الزباء اسے ہلکی محسوس ہوئی - خانہ بدوش لڑکی کے جسم کا ہر ذرہ جو پوری طرح بیدار اور بلور کی طرح چمکتا تھا اپنے اندر خلوص اور محبت کا پیغام رکھتا تھا - جب کہ الزباء کی آنکھوں میں اسے مطلب پرست مکّاری دکھائی دے رہی تھی اس خانہ بدوش لڑکی کا پکا ہوا جسم قدرت کے پُراسرار رموز کا امین تھا اور وہ صحرا کا ایک اچھوتا حُسن تھی جب کہ الزباء کی آنکھوں میں خودستائشی کی اندھی بھوک تھی -

عدی ایک دم چونک پڑا - الزباء کی ہیجان خیز آواز بلند ہوئی - وہ عدی سے مخاطب ہوئی تھی -

"کیا سوچ رہے ہو؟"

عدی نے سر کو خفیف سا جھٹکا دیا۔ "کچھ نہیں"۔

"تم کب تک مقابلہ کرنے کے لیے تیار ہو سکتے ہو؟"

"جب اور جس وقت بھی تم چاہو؟"

"کل سارا دن آرام کرو۔ پرسوں کھلے میدان میں عام لوگوں کے سامنے بنو ازد کے ایک ایسے جوان کے ساتھ تمہارا مقابلہ ہوگا جس کا نام حرث ہے اور وہ تلوار کے فن میں یکتا و بے مثل ہے"۔

عدی نے سمندر کی سی گہری آواز میں کہا۔

"میں ہر جگہ اور ہر وقت اس سے مقابلے کے لیے تیار ہوں۔ میں اسے اس طرح ماروں گا جس طرح گرم صحراؤں کا ساربان سرکش اونٹ کو درخت سے باندھ کر مارتا ہے"۔

الزباء مسکراتی ہوئی اٹھی، بلور کی ایک صراحی سے شراب کے دو جام بھرے ایک اس نے خود اپنے سرخ ہونٹوں سے لگایا اور دوسرا عدی کے سامنے رکھ دیا۔

عدی نے شراب کا جام پیچھے ہٹاتے ہوئے کہا۔

"میں شراب نہیں پیتا"۔

الزباء نے تعجب سے کہا "میں نے عربوں میں کوئی ایسا جوان نہیں دیکھا جو شراب نہ پیتا ہو اور بتوں کی پوجا نہ کرتا ہو"۔

"میں بتوں کی پوجا بھی نہیں کرتا"۔

"کیا تم اپنا پرانا اور قدیمی مذہب چھوڑ کر عیسائیت قبول کر چکے ہو؟"

"نہیں، میں ابراہیمی مذہب کا پیروکار ہوں"۔

"کیا تمہاری طرح بنو ایاد میں اس مذہب کو ماننے والے اور بھی ہیں؟"

"میرے قبیلے میں ایسے لوگ بے شمار ہیں"۔

الزباء نے اپنا خالی خام میز پر رکھتے ہوئے کہا "رات کافی جا چکی ہے اب

تم آرام کرو۔ تمہارے رہنے کا انتظام مہمان خانے کے بجائے میں نے اپنے محل کے ایک کمرے میں کیا ہے اور ہمارے ہاں ایک اجنبی کے لیے یہ سب سے بڑا اعزاز ہے"۔

الزباء کھڑی ہو گئی۔ اس کے شب خوابی کے لباس سے ہلکی ہلکی سی سوندھی مہک اٹھ رہی تھی۔ عدی بھی کھڑا ہو گیا۔ دونوں اس کمرے سے باہر آئے۔ برآمدے میں ایک شمشیر زن پہریدار کھڑا تھا۔ الزباء نے اسے مخاطب کر کے کہا۔

"عربی کو اس کے کمرے میں لے جاؤ اور ایک سپاہی کا وہاں پہرا لگا دو جو اس کی ہر ضرورت کا خیال رکھے"۔

عدی اس پہریدار کے ساتھ آگے بڑھ گیا اور الزباء اپنی طلسمی خواب گاہ میں چلی گئی۔

عدی اس پہریدار کے ساتھ محل کے ایک کمرے میں داخل ہوا جو بالکل الزباء کے کمرے کی طرح سجا ہوا تھا۔ رات کا کافی حصہ چونکہ وہ صحرا کے اندر زمستانی ہواؤں کی تیز مار میں سفر کرتا رہا تھا لہٰذا اطلسی رضائی میں گھستے ہی وہ گہری نیند سو گیا تھا۔

دوسرے روز شام کے دھندلکے میں وہ الزباء کے شہر سے نکلا اور تھوڑی دور تک وہ اپنے گھوڑے کو سست رفتاری سے چلاتا رہا۔ پھر دریائے فرات کے کنارے آ کر اس نے اپنے گھوڑے کو ایک غصیلی ایڑ لگائی اور اسے شمال کی طرف سرپٹ دوڑانے لگا۔

دریا کے کنارے اس جگہ آ کر جس کی سیدھ میں دائیں طرف صحرا کے اندر ان خانہ بدوشوں کا پڑاؤ تھا اس نے اپنے گھوڑے کو روک لیا۔ گھوڑے کے منہ سے دہانہ نکال کر اسے جنگل میں چرنے کے لیے کھلا چھوڑ دیا اور خود ایک پتھر پر بیٹھ گیا۔ شاید وہ صحرا کے اندر طنبورہ بجنے اور رقص شروع ہونے کا انتظار کرنے لگا تھا۔

تھوڑی دیر بعد اسے کسی کے قدموں کی آواز سنائی دی وہ چونک پڑا اور فوراً پتھر سے اٹھ کر جھاڑیوں کے ایک جھنڈ کی اوٹ میں ہو کر بیٹھ گیا۔ چاند اور ستاروں کی ملگجی اور میلی چاندنی جیسی روشنی میں اس نے دیکھا کہ کچھ خانہ بدوش لڑکیاں برتن اٹھائے فرات کی طرف پانی بھرنے جا رہی تھیں ان میں وہ حسین ساحرہ اور رقاصہ بھی تھی جسے وہ

پچھلی رات پسند کر چکا تھا۔ وہ جھاڑیوں کی اوٹ میں بیٹھ کر خاموشی سے انہیں دیکھنے لگا۔

لڑکیاں جب اپنے برتن پانی سے بھر کر لوٹیں تو اس نے دیکھا وہ رقاصہ ان سے پیچھے رہ گئی تھی۔ وہ بہت آہستہ آہستہ چل رہی تھی اور اس طرح اپنے اور دوسری لڑکیوں کے درمیان فاصلہ زیادہ کرتی جا رہی تھی شاید وہ عدی کا گھوڑا پہچان گئی تھی۔

لڑکیاں جب جنگل کی چھوٹی سی پٹی سے نکل کر صحرا میں داخل ہوئیں، تو اس رقاصہ نے پانی کا برتن ایک درخت کے پاس رکھ دیا۔ کچھ دیر تک بدحواسی کے عالم میں وہ اپنے چاروں طرف خوفزدہ اور بدکی ہوئی جنگلی ہرنی کی طرح دیکھتی رہی پھر آہستہ آہستہ اور دبے پاؤں وہ عدی کے گھوڑے کے پاس آئی وہاں بھی چند لمحوں تک وہ پریشانی کے عالم میں اپنے چہار سُو دیکھتی رہی۔ عدی اس کی حرکات سے محظوظ ہو رہا تھا پھر جنگل کے اندر پُراسرار موسیقی جیسی اس کی مدھم آواز اُبھری۔

"اجنبی! اجنبی!" اس کی آواز میں ویرانی اور ملال تھا۔

عدی جھاڑیوں سے نکل کر اس کے قریب آ کھڑا ہوا۔ اس نے محسوس کیا لڑکی کے جسم سے صندل کے تازہ کٹے ہوئے درخت کی مہکی مہکی سی خوشبو اُٹھ رہی تھی اور اس کے چہرے پر ایک دِل پسند سا رسیلاپن تھا۔ عدی نے اسے مخاطب کیا۔

"تم نے مجھے پکارا؟"

اس لڑکی نے سرد اور ویران آواز میں کہا۔

"جس ارادے سے تم یہاں آئے ہو اس سے باز رہو، واپس لوٹ جاؤ اجنبی! نہیں تو نقصان اُٹھاؤ گے"۔

عدی نے پریشان ہو کر پوچھا۔ "کیا تم مجھ سے نفرت کرتی ہو جب کہ میں تمہیں پسند کر چکا ہوں"۔

لڑکی نے بڑی جرأت کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔

"میں تم سے نفرت نہیں کرتی لیکن یاد رکھو اجنبی! پردیسی، خوشبو، خوبصورتی رنگ، سحر، طلوع، غروب، شام اور آوازیں ایسے عناصر ہیں جو بڑے حسین اور زندگی

...پورے رسیلے پن کے ساتھ ملتے ہیں لیکن جب بچھڑتے ہیں تو کبھی دوبارہ لوٹ کر ...یں آتے اور اِن سے محبت کرنے والا اپنے کندھوں پر اپنی صلیب اُٹھائے پھرتا ...ے۔ جاؤ اجنبی! جہاں سے آئے ہو اُدھر ہی لوٹ جاؤ۔ تم خوشبو کا ایک آوارہ جھونکا ...جس سے کوئی بھی دِل لگانا پسند نہیں کرے گا"۔

عدی نے آگے بڑھ کر بڑی بیباکی سے لڑکی کے دونوں ہاتھ تھام لیے۔

"میں تمہیں اپنے ساتھ اپنے قبیلے میں لے جاؤں گا جہاں میرا بوڑھا باپ ...ڑا کے اندر بڑی بیتابی سے میری واپسی کا انتظار کر رہا ہو گا۔ وہاں میں تم سے بیاہ ...روں گا"۔

لڑکی کا سر جھک گیا تھا۔ اس نے اپنے ہاتھ چھڑانے کی کوشش نہیں کی تھی۔ ...ں کا کنوارا جسم کانپ رہا تھا اور چہرہ حیا کی آب و تاب سے فروزاں ہو کر تمتما اٹھا تھا۔ ...اتھ ہی اس کی پانی کی ریشمی چھپ چھپ جیسی مگر مغموم آواز سنائی دی۔

"لیکن سردار تمہیں اس کی اجازت نہ دے گا"۔

"میں اُسے اپنی راہ سے ہٹا دوں گا"۔

لڑکی کی آواز بیٹھتی چلی گئی۔ "آج تک کوئی بھی اِس سے مقابلے میں نہیں ...ہت سکا۔ وہ صحرا کے قدیمی انسانوں کی طرح وحشی اور خونخوار ہے"۔

"اگر میں اس وحشی کو زیر کر لوں تو کیا تم میرے ساتھ میرے قبیلے میں چلو گی"۔

لڑکی نے اپنی گردن آہستہ آہستہ اُوپر اُٹھائی اس کی آنکھوں میں پُراسرار اشارت ...ٹمٹماتی جوت پھیلاتی ہوئی ایک روشنی تھی پھر اثبات میں اس نے اپنی گردن ہلا دی۔

عدی نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "میں تمہارے مُنہ سے کچھ سُننا پسند کروں گا"۔

لڑکی نے حیا اور بشاشت آمیز شائستگی میں کہا۔

"میں تمہاری بیوی بننا پسند کروں گی"۔

عدی نے خوشی میں جھوم کر اس کے دونوں ہاتھ چُوم لیے۔

"تمہارا نام؟"

"ربیعہ"۔ ساتھ ہی اس نے اپنے ہاتھ چھڑا لیے ۔ "مجھے اب جانے دو۔"
عدی نے اس کے ہاتھ چھوڑ دیئے ۔ ربیعہ پیچھے ہٹی ۔ پانی کا برتن اُٹھایا اور نسیمِ سحر کی طرح چاندنی رات میں صحرا کی چاندنی کی طرح چمکتی ریت میں نگاہوں سے اوجھل ہو گئی ۔
عدی دوبارہ اسی پتھر پر بیٹھ کر انتظار کرنے لگا تھا ۔

خاموش اور دن بھر کا تھکا ہارا صحرا پوری طرح جاگ اُٹھا تھا تاروں بھری چمکیلی رات ملا کے موتی برسانے لگی تھی ۔ دریائے فرات کی ننھی ننھی لہریں ایک دوسرے سے ٹکراتے ہوئے سرگوشیاں اور اٹکھیلیاں کر رہی تھیں ایسا محسوس ہوتا تھا گویا فطرت کی ساری تخلیقی قوتیں حرکت میں آگئی ہوں اور صحرا کے جنگل اور کائنات کی ہر چیز پُر نور سکون و طمانیت میں سحر کے بے آواز ترانے گانے لگی ہو ۔

پتھر پر بیٹھا ہُوا عدی چونک پڑا ۔ صحرا کی طرف طنبورے کی ملائم مگر کرب آشنا آواز سُنائی دی تھی ۔ عدی اپنے گھوڑے کی طرف بھاگا ۔ جلدی جلدی گھوڑے کو دہانہ چڑھایا ۔ ایک ہی جست میں وہ گھوڑے پر سوار ہوا اور ایڑ لگا کر وہ اُسے سرپٹ دوڑانے لگا ۔

صحرا کو روندتا ہوا وہ خانہ بدوشوں کے پڑاؤ کے پاس آیا اور گزشتہ روز کی طرح وہ کھجور کے ایک درخت سے ٹیک لگا کر کھڑا ہو گیا وہاں کھڑے سب مرد اور عورتیں بڑی پریشانی سے اس کی طرف دیکھ رہے تھے ۔ پتھر کی طرح سخت چہرے والا نوجوان مغنّی اسی طرح طنبورے کی لَے پر وہی پُرانا اور تاریخ کے کسی قدیم ترین دور سے تعلق رکھنے والا گانا گا رہا تھا ۔ ربیعہ ناچ رہی تھی ۔ آج اس نے عدی کی طرف آنکھ اُٹھا کر نہ دیکھا تھا ۔ تاہم اس کے چہرے پر طمانیت تھی جیسے وہ اپنے جسم کو امانت کے طور پر کسی کو سونپ چکی ہو ۔ اس کے جوان اور پکے ہوئے بدن کا ہر ذرہ بیدار تھا یوں محسوس ہو رہا تھا ۔ گویا وہ رقص کرتے کرتے گرم صحراؤں کے گیت کا سنگیت کر نیلی فضاؤں میں تیز بازگشت کی طرح بکھر جائے گی ۔

آگ کا الاؤ اِسی طرح روشن تھا اور تیز شعلے زہریلے سانپوں کی طرح لپک رہے تھے ۔ الاؤ کے قریب ہی خانہ بدوشوں کا وحشی سردار بیٹھا ہُوا تھا اس نے

یاہ اور خوفناک آنکھوں کی ایک سیدھی نگاہ عدی پر ڈالی ۔ اس کے چہرے پر موت کی مکراہٹ بکھر گئی تھی اور آنکھیں کسی غصیلے درندے کی طرح اُبل پڑی تھیں پھر اس نے اپنے قریب رکھی شراب کی بلوری صراحی اُٹھائی اور ایک لمبی دھار کے ساتھ اس نے یونانی شراب اپنے جام میں انڈیلی اور ایک ہی سانس میں پورا جام غٹا غٹ پی کر وہ اپنی مونچھیں پونچھتا ہُوا اٹھا اور عدی کی طرف بڑھا ۔ اس کی آنکھیں غصّے اور قہر میں آگ برسا رہی تھیں ۔

نوجوان مغنّی نے خوفزدہ ہو کر گانا بند کر دیا اور طنبورے پر اس کی اُنگلیاں ساکت ہو گئیں ۔ ربیعہ بھی رقص کرتے کرتے رُک گئی تھی اور وحشت زدہ ہرنی کی طرح وہ عدی کی طرف بڑھتے ہوئے اپنے سردار کو دیکھنے لگی تھی ۔

خانہ بدوشوں کا وحشی سردار عدی کی طرف بڑھا اور اپنی بھاری آواز میں زہریلے سانپ کے پھنکارنے کے انداز میں اس نے پوچھا ۔

"تو تم آ گئے ہو؟"

عدی نے سپاٹ آواز میں جواب دیا ۔

"تم جانتے ہو میرا نام عدی بن نصر ہے اور میں کیا ہُوا وعدہ ضرور پورا کرتا ہوں"۔۔۔۔۔۔ سردار نے ایک جھٹکے کے ساتھ اپنی تلوار کھینچ لی ۔

"شاید پیاسے صحرا کا یہ حصّہ جہاں ہم نے اس وقت پڑاؤ کر رکھا ہے انسانی خون مانگتا ہے ۔"

عدی کی آواز بھی بپھرتی جا رہی تھی ۔

"تمہارا اندازہ درست ہے ۔ یہ ریت یقیناً تمہارے خون کی پیاسی ہے ۔"
اس کے ساتھ ہی عدی نے اپنی تلوار بے نیام کر کے اپنے سامنے فضا میں لہرائی ۔ وہ پیتل کے دستے والی ایک چوڑی، بھاری، خمدار اور خوبصورت صیقل کی بنی ہوئی تلوار تھی ۔ ۔۔ت سے ہٹ کر وہ سردار کی بڑھا تھا ۔

پھٹے ہوئے لباس والا ایک خانہ بدوش اُٹھا اور آگ کے جلتے ہوئے الاؤ میں ۔۔ا اور لکڑیاں ڈال دیں ۔ آگ کا الاؤ اور تیزی سے بھڑک اُٹھا تھا اور رقص کرتے ہوئے

شعلے اور زیادہ بلندی تک پرواز کرنے لگے تھے۔ الاؤ کے قریب ہی عدی اور خانہ بدوش سردار ایک دوسرے کے سامنے آکر رُک گئے۔ دونوں اس وقت وحشی لگ رہے تھے اور تیز آگ کے حلقے میں ان کے چہرے تانبے کی طرح چمک رہے تھے۔

صرف چند لمحوں تک انہوں نے ایک دوسرے کو غور سے دیکھا پھر دو وحشی درندوں اور بھوکے درندوں کی طرح ایک دوسرے پر ٹوٹ پڑے اور پے در پے اور تواتر کے ساتھ وہ ایک دوسرے پر خطرناک وار کرنے لگے۔

کچھ دیر تک دونوں آگ کے الاؤ کے پاس جم کر لڑتے رہے اور پھر عدی کے حملوں میں تیزی آگئی اور یوں محسوس ہونے لگا جیسے اس نے میدان میں چھانا شروع کر دیا ہو۔

دفعتاً عدی کے لڑنے کا انداز بدلا وہ وحشیوں کی طرح اپنے منہ سے خوفناک چیخیں اور بھیانک آوازیں نکالتے ہوئے بپھر بپھر کر حملہ آور ہونے لگا تھا اور خانہ بدوش سردار اپنے اُلٹے پاؤں اس کے آگے دفاعی جنگ کی ابتداء کر چکا تھا۔

الاؤ کے قریب آکر جب کہ سردار اُلٹے پاؤں عدی کے آگے آگے بھاگ رہا تھا عدی نے اس کے شانے پر وار کیا۔ جونہی اس خانہ بدوش نے اپنی تلوار وہاں لاکر اپنے شانے کا دفاع مکمل کیا عدی نے فوراً پینترا بدلا۔ تلوار کو مناسب انداز میں لاکر اس نے سردار کے جسم کو پیٹ کے پاس سے کاٹ دیا اور اس کا جسم دو حصّوں میں بٹ کر الاؤ کے پاس گر گیا۔ عدی وہیں کھڑا رہا اور ہاتھ میں خون ٹپکتی ہوئی تلوار لیے وہ اپنے چاروں طرف بیٹھے خانہ بدوشوں کی طرف دیکھنے لگا تھا۔

سردار کی موت پر خانہ بدوشوں میں کوئی ردِ عمل ظاہر نہ ہوا تھا۔ پتھر کے سخت چہرے والا مغنی پُرسکون انداز میں عدی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ خانہ بدوش مرد عورتیں کچھ اس انداز میں ایک دوسرے سے گفتگو کر رہے تھے۔ جیسے کوئی زلزلہ آیا ہو اور اس کے اثرات عین ان کی خواہشات اور آرزوؤں کے مطابق ہوں۔

عدی اپنی خون آلود تلوار فضا میں بلند کیے ابھی تک جلتے ہوئے الاؤ کے پاس کھڑا تھا۔ اس کے قریب ہی ربیعہ کھڑی تھی، جو اب مطمئن تھی جنگل کے اس آہو کی طرح جو کسی درندے

کا شکار ہوتے ہوتے بچ نکلا ہو۔

اسی دوران حلقے کی صورت میں کھڑے مرد عورتوں کے اندر سے وہی بوڑھا عوف نکلا جو ایک بار پہلے فرات کے کنارے جنگل کے اندر عدی سے مل چکا تھا۔ اس کے ساتھ ایک اور بوڑھا عرب بھی تھا جس کی کمر جھکی ہوئی تھی، سر اور داڑھی کے بال میلی چاندی جیسے ہو رہے تھے۔ عوف عدی کے قریب آیا اور اس کا شانہ تھپتھپاتے ہوئے کہا۔

"تم مقابلہ جیت چکے ہو۔ یہ خانہ بدوش قبیلہ اب تمہیں اپنا سردار تسلیم کرتا ہے"

عدی نے فضا میں بلند اپنی تلوار نیچی کرتے ہوئے کہا۔

"صرف تمہارے کہنے سے پورا قبیلہ مجھے اپنا سردار کیسے تسلیم کرے گا؟"

بوڑھا عوف بڑی تیزی سے اپنی جگہ پر گھوما اور قبیلے کے مرد عورتوں کو مخاطب کرکے پوچھا۔

کیا تم عدی بن نصر کو جو بنو ایاد کے سردار کا بھانجا ہے اور جس کی شجاعت کی داستانیں اندھے پرندوں کی طرح عراق و عرب کے صحراؤں میں بکھری ہوئی ہیں، تم لوگ اپنا سردار تسلیم کرتے ہو؟

اب میں سارے مرد عورتوں نے اپنے ہاتھ فضا میں بلند کرتے ہوئے کہا

"اب سے عدی بن نصر ہمارا سردار ہے۔ اس نے ایک ظالم سے ہمیں نجات دلائی ہے جو اپنی ہر خواہش اور آرزو کو قانون سمجھتا تھا۔"

عوف نے پھر عدی سے کہا۔

"کیا اب بھی تمہیں میری باتوں پر شک ہے"؟

عدی مسکرا رہا تھا۔ "نہیں"۔

عوف نے اپنے ساتھ کھڑے دوسرے بوڑھے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا

"یہ ربیعہ کا باپ سامرہ ہے اور تم سے ملنا چاہتا ہے۔" عدی نے اپنا ہاتھ مصافحہ کے لیے آگے بڑھایا۔ سامرہ نے عدی کی گانٹھ دار بھاری ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیتے ہوئے پوچھا۔

"مجھے معلوم نہیں، تمہارے مستقبل کے کیا ارادے ہیں تاہم اگر تم میری بیٹی ربیعہ

کو پسند کرتے ہو تو وہ آج سے تمہاری ہے اگر تم چاہو تو میں آج ہی ربیعہ کو تم سے بیاہ دوں گا۔ عدی کے قریب ہی کھڑی ربیعہ کے ہونٹوں پر ملائم اور رات کے پہلے پہر کے کنوارے خوابوں کی سی دل کشی تھی۔ وہ کچھ اس طرح میٹھی نگاہوں سے عدی کی طرف دیکھ رہی تھی جس طرح برسوں کا تھکا ہارا مسافر اچانک اپنی منزل کو سامنے دیکھ کر مطمئن، پُرسکون اور خراماں دکھائی دیتا ہے۔

پتھر کی طرح سخت اور تانبے کی طرح چمکتے ہوئے چہرے والا نوجوان مغنی اپنے ہاتھ میں طنبورہ تھامے اُٹھا اور آہستہ آہستہ طلسمی انداز میں چلتا ہوا عدی کے قریب آیا۔ اپنی کمر کو ذرا سا خم دے کر وہ تعظیماً تھوڑا سا جھکا اور مؤدب ہو کر عدی سے کہا۔

"میں اپنے سردار کو اپنی وفاداری پیش کرتا ہوں"۔

بوڑھے عوف نے عدی کا ہاتھ پکڑ کر ایک طرف کھینچتے ہوئے کہا۔

"آؤ میرے ساتھ سردار کا خالی خیمہ تمہارا انتظار کر رہا ہے۔ عدی اس کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ اور ان کے پیچھے ربیعہ اس کا باپ سامرہ اور نوجوان مغنی تھا۔

عدی ان چاروں کے ساتھ سردار کے سُرخ بانات کے خیمے میں داخل ہوا۔ کھجور کی چٹائی پر سُرخ اُونٹ کے بالوں کی دبیز قالین بچھی ہوئی تھی۔ خیمے کے اندر جگہ جگہ ہرن اور بھیڑوں کی پوستینیں، فولاد اور پیتل کے چمکتے ہوئے ہتھیار لٹک رہے تھے ایک طرف سردار کا بستر لگا تھا اور دوسری طرف اُونٹ کے کوہان کی ہڈی سے بنے ہوئے برتن رکھے تھے۔

چاروں خیمے میں بیٹھ گئے۔ عوف نے عدی کو مخاطب کرتے ہوئے پوچھا۔

"تم کب ربیعہ سے شادی کرنا پسند کرو گے؟ اپنی شادی کا ذکر سن کر وہ معصوم پنکھڑی کی طرح گلنار ہو گئی۔ عدی کے جواب دینے سے قبل ہی وہ اُٹھی اور بھاگتی ہوئی باہر نکل گئی۔ خیمے کے اندر عدی کی آواز بلند ہوئی۔

"ملکہ الزباء کے ہاں کل میرا مقابلہ ہے۔ وہاں سے فارغ ہو کر میں ربیعہ

کو بیاہ کر اپنے ساتھ اپنے قبیلے میں لے جاؤں گا"۔

عوف نے حیرت سے پوچھا "کیا تم سردار کی حیثیت سے ہم میں نہیں رہو گے"۔

"نہیں۔ میں واپس اپنے قبیلے میں جاؤں گا۔ میں اپنے بوڑھے باپ کا واحد سہارا ہوں اور وہ صحرا کے اندر کسی بلند ٹیلے پر کھڑے ہو کر ہر روز میری راہ تکتا ہو گا۔ میں اپنی طرف سے تمہیں قبیلے کا سردار مقرر کرتا ہوں اُمید ہے تم ہر ایک سے انصاف کرو گے"۔

عوف ملول سا ہو گیا۔ دُکھ سے اس نے کہا۔

"تمہارے جانے سے ہمیں دُکھ ہو گا"۔

عدی اپنی جگہ پر کھڑا ہوتا ہوا بولا۔ "کچھ فیصلے ایسے ہی ہوتے ہیں جنہیں اپنی مرضی کے خلاف قبول کرنا پڑتا ہے"۔

عوف نے پریشان ہو کر پوچھا۔

"اب کہاں چلے ہو"؟

"میں واپس الزباء کے پاس جاؤں گا۔ اگر میں واپس نہ گیا تو وہ مجھے رات بھر ڈھونڈتے رہیں گے اور مجھے اپنے کمرے میں نہ پا کر یہ خیال کریں گے کہ میں مقابلے سے بچنے کے لیے بزدلوں کی طرح بھاگ گیا ہوں"۔

عوف خاموش رہا۔ چاروں خیمے سے باہر آئے۔ عدی نے ان تینوں سے مصافحہ کیا اور اپنے گھوڑے پر سوار ہو کر وہ اسے دریائے فرات کی طرف دوڑانے لگا صحرا میں گزرتے ہوئے ستاروں کی روشنی اور رات کے چوکنے سکوت میں عدی کو ریت پر کسی کے پاؤں کی نرم نرم سرسراہٹ سنائی دی تھی۔ اس نے فوراً گھوڑے کی باگیں کھینچ لیں اور ایک جگہ رُک کر اس نے اپنی تلوار بے نیام کر لی تھی۔

پھر صحرا کی سفید ریت سے بغلگیر منجھی دُھلی چاندنی میں عدی نے دیکھا تین اور طلسماتی جاذبیت رکھنے والی ربیعہ ایک ٹیلے کی اوٹ سے نکل کر اس کے سامنے آ کھڑی ہوئی تھی۔ عدی اپنے گھوڑے سے اُتر کر بولا۔

"ربیعہ! تم یہاں؟"

ربیعہ اس سے قریب ہو کر بولی: "میں جانتی تھی تم واپس چلے جاؤ گے۔ اسی لیے میں یہاں آ کر کھڑی ہو گئی۔ ربیعہ آگے بڑھی اور سیمابی کیفیت میں عدی سے پوچھا

"واپس کب آؤ گے؟"

عدی نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ "کل شام سے ذرا پہلے مقابلہ ہو گا۔ اس کے بعد میں تمہارے پاس پھر آؤں گا اور رات تمہارے قبیلے میں بسر کروں گا اور اس سے اگلے روز تمہیں بیاہ کر میں اپنے بوڑھے باپ کے پاس لے جاؤں گا۔ وہ تمہیں دیکھ کر خوش ہو گا"

"کیا تم بُت پرست ہو؟"

"نہیں، میں دین ابراہیمؑ کا پیروکار ہوں اور تم؟"

"میں بھی تمہاری ہم مذہب ہوں۔"

"کیا تمہارے قبیلے میں ایسے اور لوگ بھی ہیں جو بُت پرست نہ ہوں؟"

"میرا باپ، بوڑھا عوف، نوجوان مغنی اور کئی دوسرے لوگ ہیں جو ابراہیمؑ کے دین کو جانتے ہیں۔ میرا باپ کہا کرتا ہے کہ توریت اور انجیل کی پیش گوئی کے مطابق عرب کے صحرا میں ایک آخری نبیؐ پیدا ہو گا۔ کیا تم جانتے ہو یا تم نے سُن رکھا ہے کہ وہ کہاں پیدا ہو گا؟"

عدی نے احتراماً اپنے دونوں ہاتھ اپنی چھاتی پر باندھتے ہوئے کہا۔ "میں نے پرانے منجموں اور قدیم راہبوں سے سُن رکھا ہے کہ عرب کے صحراؤں میں اس دُنیا کے آخری نبیؐ پیدا ہوں گے جن کا نام محمدؐ (صلی اللہ علیہ وسلم) ہو گا۔ کاش میں اُن کے زمانے تک زندہ رہوں اور اُن کے پاؤں دھو کر پیوں۔"

دونوں کہیں کھو گئے۔ عدی نے چونکتے ہوئے کہا۔

"مجھے اب چلنا چاہیے۔"

ربیعہ نے مغموم آواز میں کہا۔ "میں ابراہیمؑ کے رب سے تمہاری کامیابی کی دُعا کرتی ہوں۔ کل رات اسی وقت اسی ٹیلے پر میں تمہارا انتظار کروں گی۔"

عدی نے گھوڑے کو ایڑ لگا کر اسے دریائے فرات کی طرف سرپٹ دوڑا دیا۔ ربیعہ ریت کے ایک ٹیلے پر چڑھ گئی اور صبیح چاندنی میں عدی کو اس وقت تک دیکھتی رہی جب تک وہ دریا کے کنارے گھنے جنگل میں داخل نہ ہو گیا۔

دوسرے روز الزباء کے محل سے باہر ایک کھلے میدان میں اَن گنت اور بے شمار لوگ جمع تھے۔ محل کی طرف ایک اُونچی شہ نشین پر حسین اور نازک بدن الزباء بیٹھی ہوئی تھی اور شہ نشین کے سامنے کرسیوں پر الزباء کے مشیر بیٹھے ہوئے تھے۔ الزباء کے اشارے پر بنو قسطورا کے ایک بزرگ نے اُٹھ کر مقابلہ شروع کرانے کا حکم دیا۔

میدان کے دائیں طرف سے بنو قسطورا کا ایک کوہ اندام جوان جو سر سے پاؤں تک لوہے میں غرق تھا میدان میں اُترا۔ اس کے ہاتھ میں ننگی تلوار تھی جس کی چمک پچھلے پہر کے سورج کی روشنی میں دُور دُور تک چمکارے دے رہی تھی۔ بائیں جانب سے عدی میدان میں اُترا وہ اپنا بہترین جنگی لباس پہنے ہوئے تھا۔ وہ اس درندے جیسی چال کے ساتھ میدان میں آگے بڑھ رہا تھا جیسے جنگلی جانوروں کو جب اور جہاں چاہے شکار کرنے کی استطاعت رکھتا ہو۔

دونوں ایک دوسرے کے قریب آ کر رُک گئے۔ اپنے اپنے خود کے سوراخوں میں سے انہوں نے اپنے اپنے مدِ مقابل کو دیکھا پھر وہ اپنی اپنی تلواریں لہراتے ہوئے ایک دوسرے کے گرد یوں چکر لگانے لگے جس طرح بھوکا درندہ بے بس اور شکار کیے جانے والے جانور کے گرد غرا غرا کر چکر لگاتا ہے۔

بنو قسطورا کا تیغ زن اچانک بپھر گیا اور عدی پر حملہ کرنے میں پہل کر دی۔ عدی نے اس کا حملہ بڑے پُرسکون انداز میں اپنی ڈھال پر لیا اور جواب میں وہ بھی اپنے حریف کے طوفانی انداز میں ایک تواتر کے ساتھ حملہ آور ہوا تھا۔

میدان سے باہر بیٹھے ہوئے کچھ من چلے اور زندہ دِل جوان عدی کے لڑنے کے انداز پر اُسے داد دے رہے تھے۔ کچھ لوگ بنو قسطورا کے تیغ زن کو چلا چلا کر پیچ بتا

رہے تھے۔ پر عدی تو اب بپھر چکا تھا اور ایک طرح سے اس نے اپنے مدِ مقابل کے سارے دفاعی حصار توڑ کر رکھ دیئے تھے۔ اس کی چمکتی ہوئی بھاری تلوار فضا میں صاعقہ آسمانی کی طرح اُبھر ڈوب رہی تھی۔

بنو قسطورا کا تیغ زن اب بوکھلائے ہوئے انداز میں صرف اپنے دفاع پر اکتفا کیے ہوئے تھا جب کہ عدی اپنی تلوار اور ڈھال سے اس پر دہلا دینے والی ضربیں لگا رہا تھا۔ وہ اس آہن گر کی طرح پورا پورا فائدہ اُٹھا رہا تھا جو لوہے کو سُرخ دیکھ کر اپنی مرضی کے مطابق ڈھالنے کا تہیّہ کر چکا ہو۔

عدی اپنے مدِ مقابل کو اپنے آگے بھگاتا ہوا اس شہ نشین کے پاس لے آیا تھا جس پر الزباء بیٹھی ہوئی تھی۔ وہاں آ کر اس نے ایسا خطرناک وار کیا جسے الزباء کا تیغ زن بڑی مشکل سے روک سکا اسی لمحہ عدی نے اس کے سر پر اپنی ڈھال دے ماری اور اس کے سر سے خود اُتار دیا۔ پھر عدی اس طرح آندھی اور طوفان بن کر حملہ آور ہوا کہ بنو قسطورا کا پہلوان بدحواس ہو کر پیلا پڑ گیا۔ ذرا پیچھے ہٹتے ہوئے اس نے اپنی تلوار زمین پر پھینک دی اور اپنے دونوں ہاتھ اُوپر اُٹھاتے ہوئے اس نے اپنی شکست تسلیم کر لی تھی۔ وہ اس مسافر کی طرح کھڑا کپکپا رہا تھا۔ جس کے قریب اچانک آسمان سے بجلی گر پڑی ہو۔ عدی اس کی حالت دیکھ کر چند لمحوں تک مسکراتا رہا۔ پھر اس نے اپنی تلوار نیام میں کر لی تھی۔

شہ نشین پر بیٹھی ہوئی الزباء نے اپنے قریب بیٹھے ہوئے بنو قسطورا کے ایک بزرگ سے سرگوشی میں کچھ کہا اور پھر وہ اُٹھ کر چلی گئی۔ وہ بوڑھا میدان میں اُترا اور آہستہ آہستہ چلتا ہوا وہ عدی کے قریب آیا اور اس کی پیٹھ تھپتھپاتے ہوئے کہا۔

"تم مقابلہ جیت چکے ہو۔ بیشک تمہارا لڑنے کا انداز اور دفاع توڑ کر جارحیت سے حملہ آور ہونے کے اطوار نئے اور موثر ہیں۔ تم یقیناً ناقابلِ شکست ہو اور بنوایاد ٹھیک ہی تم پر ناز کرتے ہیں۔ میرے ساتھ آؤ الزباء تم سے کچھ کہنا چاہتی ہے۔"

عدی اس بوڑھے کے ساتھ ہو لیا۔ میدان سے نکل کر وہ ملکہ کے محل میں

داخل ہوئے، ایک جگہ بوڑھا رک گیا اور ایک دروازے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"اس کمرے میں چلے جاؤ۔ اندر الزباء تمہارا انتظار کر رہی ہے وہ تم سے کسی فیصلہ کن موضوع پر بات کرنا چاہتی ہے۔" بوڑھا واپس چلا گیا اور عدی دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا۔ اندر الزباء بیٹھی شاید اسی کا انتظار کر رہی تھی کیونکہ جب عدی اندر داخل ہوا تو وہ اپنی جگہ پر کھڑی ہو گئی اور مسکراتے ہوئے عدی کا استقبال کیا۔

"آؤ عدی! اس نے اپنے سامنے ایک کُرسی کی طرف اشارہ کیا بیٹھو۔"

عدی بیٹھ گیا۔ الزباء نے اپنے قریب پڑی ہوئی نقدی کی تھیلیوں میں سے ایک اٹھائی اور اسے عدی کی گود میں رکھتے ہوئے کہا۔

"یہ پانچ ہزار سُرخ دینار ہیں جن کا تم سے وعدہ کیا تھا کیونکہ تم مقابلہ جیت چکے ہو اگر تم گِننا چاہو تو گن لو۔"

عدی نے تھیلی سنبھالتے ہوئے کہا۔ "مجھے تم پر اعتماد اور بھروسہ ہے۔"

الزباء نے عدی کے الفاظ سے فوراً فائدہ اُٹھایا۔ "اگر اعتماد اور بھروسہ ہے تو میری دو باتوں پر اعتماد کرو۔"

عدی نے چونکتے ہوئے پوچھا۔ "کیسی دو باتیں؟"

الزباء نے اپنی مسحور کر دینے والی آنکھیں عدی کی آنکھوں میں ڈالتے ہوئے کہا۔

"اوّلاً میری افواج کا سپہ سالار بننا قبول کر لو۔ ثانیاً مجھ سے شادی کر لو مجھ سے حسین بیوی تمہیں کہیں نہ مل سکے گی اور تم جیسا خوبرو اور شجاع ترین شوہر مجھے بھی کبھی نہ مل سکے گا۔ میں فخر سے کہہ سکوں گی کہ میں اس عدی کی بیوی ہوں جس کی شجاعت اور بہادری کے گیت صحراؤں اور نخلستانوں میں دُور دُور گائے جاتے ہیں۔"

عدی نے کوئی جواب نہ دیا۔ اس کی گردن جھکی ہوئی تھی۔ الزباء نے پھر سے ٹہوکا دیا۔

"کیا سوچنے لگے ہو تم؟"

عدی نے نرم اور دھیمی آواز میں کہا۔ "یہ دونوں باتیں ایسی ہیں جن کا فیصلہ

باپ ہی کر سکتا ہے۔"

"کیا تم اپنے حق میں اپنا بُرا بھلا نہیں سوچ سکتے؟"

عدی نے اس بار کچھ بیزاری سے کہا۔

"مَیں اپنا بھلا بُرا سوچ سکتا ہوں لیکن ایسے فیصلے میرا باپ ہی کرے گا۔"

"تو پھر تم یہیں رہو۔ مَیں تمہارے باپ کو بلوائے لیتی ہوں۔"

"نہیں ایسا نہیں ہو سکتا۔ مَیں ایک بار ضرور واپس جاؤں گا۔ اس مقابلے میں جو رقم مَیں نے جیتی ہے اس سے میں اپنے قبیلے کے لیے بنو لخم سے میٹھے پانی کا ایک کنواں خریدوں گا۔ پھر تمہاری ان دو باتوں پر اپنے بوڑھے باپ سے مشورہ کروں گا۔"

الزباء نے خدشہ ظاہر کیا۔ "اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ تم واپس آجاؤ گے۔"

عدی نے خفگی سے کہا۔

"تمہارے پاس اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ تم میرے واپس آنے تک زندہ بھی رہ سکو گی یا نہیں۔"

الزباء خجل سی ہو گئی اور ندامت میں کہا۔

"مَیں تمہیں اس التجا کے ساتھ واپس جانے کی اجازت دیتی ہوں کہ تم جلد واپس لوٹ آنا۔" الزباء نے اپنے قریب پڑی ہوئی ایک اور نقدی کی تھیلی اُٹھا کر عدی کی گود میں رکھتے ہوئے کہا۔

"یہ چھ ہزار سُرخ دینار اور لے لو۔ یہ مَیں تمہیں اپنی خوشی سے دے رہی ہوں مَیں چاہتی ہوں تم آج ہی اپنی بستی کی طرف روانہ ہو جاؤ اور سارے کام نمٹا کر کل تک میرے پاس چلے آؤ۔"

عدی نے نقدی کی دونوں تھیلیاں سنبھالیں اور کھڑے ہو کر دروازے سے باہر نکلتے ہوئے بولا۔

"میں بہت جلد لوٹوں گا۔"

اصطبل میں آکر اس نے اپنے گھوڑے پر زین ڈالی۔ دونوں تھیلیاں خرجین میں

ڈال کر وہ گھوڑے پر سوار ہوا اور شہر سے باہر نکل گیا۔

وہ دیارِ فرات کے کنارے برق رفتاری کے ساتھ فاصلوں کو سمیٹتے ہوئے دریا کے کنارے کا جنگل عبور کیا اور صحرا کے اس حصّے میں داخل ہوا جہاں ربیعہ کا خانہ بدوش قبیلہ آباد تھا لیکن کھجوروں کے اس جھنڈ میں آکر حیران رہ گیا۔ وہ جگہ ویران اور سنسان پڑی تھی جگہ جگہ راکھ بکھری ہوئی تھی۔ ٹوٹے چولہے اور خیموں کی ٹوٹی ہوئی بوسیدہ سی طنابیں اِدھر اُدھر دکھائی دے رہی تھیں۔ عدی نے بڑی بے بسی کے عالم میں اپنے آپ سے کہا۔

"تو کیا وہ خانہ بدوش قبیلہ یہاں سے کوچ کر گیا ہے؟ کیا بوڑھے عوف نے میرے ساتھ دھوکہ کیا ہے۔ کیا اس حسین ربیعہ کی محبت ایک سراب اور فریب تھا۔"

عدی نے ایک بار پھر اپنے ذہن سے سوال کیا۔ "کیا مَیں نے الزباء کے محل میں ہوتے ہوئے اس خانہ بدوش قبیلے کے متعلق کوئی خواب دیکھا تھا۔ کیا اس صحرا میں اس خانہ بدوش قبیلے کا کوئی وجود نہ تھا لیکن جلد ہی وہ سنبھلا اور اپنے سر کو زور کا ایک جھٹکا دے کر اس نے ذہن میں جنم لینے والے ہر خیال اور خدشے کو ٹھکرا دیا۔

نہیں خانہ بدوش قبیلہ ایک حقیقت تھا اور اس سردار سے مقابلہ کر کے مَیں نے اسے قتل کیا تھا۔ عدی گھوڑے سے اُترا اور اس جگہ گھومنے لگا جہاں کبھی خانہ بدوشوں کے خیمے نصب تھے۔ اس نے دیکھا اَن گنت اونٹوں کے پاؤں کے تازہ نشانات صحرا کی ایک طرف جا رہے تھے۔ شاید قبیلے نے صحرا کے اندر اسی سمت کو کوچ کیا تھا۔ عدی فوراً اپنے گھوڑے پر سوار ہوا اور صحرا کی انجانی بھول بھلیوں اور وسعتوں کی طرف جانے لگا اور اونٹوں کے پاؤں کے نشانات کے تعاقب میں بڑی تیزی سے آگے بڑھنے لگا۔

پوری رات دم لیے اور قیام کیے بغیر وہ اس اندھے اور لامتناہی صحرا کے اندر

سفر کرتا رہا۔ اونٹوں کے نقشِ پا آگے ہی آگے بڑھتے جا رہے تھے اور کہیں بھی اپنے آگے اسے خانہ بدوش جاتے ہوئے دکھائی نہ دیئے تھے۔

عدی کا خیال تھا کہ صحرا کے اندر کہیں نہ کہیں اسے ضرور کوئی نخلستان دکھائی دے گا جہاں وہ خانہ بدوش قبیلہ فروکش ہوگا لیکن یہ اس کی خوش فہمی تھی۔ دوسرے روز کافی دن چڑھے تک اسے نخلستان تو ایک طرف ایسی جھاڑیاں تک دکھائی نہ دیں جو صرف اونٹ ہی کی خوراک ہو سکتی ہیں۔ اس کے پاس خوراک کا کوئی انتظام نہ تھا۔ پانی کا مشکیزہ خالی ہو چکا تھا۔ اس کے باوجود ایک جذبے کے تحت وہ بڑی ثابت قدمی سے سفر کرتا رہا۔

دوپہر کے قریب اچانک صحرا کے اندر سرد اور ٹھٹھری ہوئی تیز ہواؤں کے جھکڑ چل نکلے۔ ریت کے بگولے صحرا کے اندر اڑتے ہوئے ہر چیز کو ڈھانپنے لگے تھے۔ قافلے کے وہ نقشِ پا جن کا عدی تعاقب کر رہا تھا مٹ گئے۔ تیز ہواؤں نے ٹیلوں کی شکست و ریخت کا کھیل شروع کر کے ایک جگہ کے ٹیلے دوسری جگہ کھڑے کرنا شروع کر دیئے تھے۔

پیاس کے باعث عدی کا حلق تپتے صحرا کی طرح خشک ہو گیا تھا۔ اسے ایسا محسوس ہونے لگا تھا کہ اس کے ہونٹ خشک ہو کر پھٹ جائیں گے اور وہ صحرا کے اس حصے میں ریت کے تلے دب کر ابدی نیند سو جائے گا۔ ان مشکلات کے باوجود وہ آگے بڑھتا رہا لیکن وہ محسوس کر رہا تھا کہ اس حالت میں وہ ریت کے طوفان میں وہ زیادہ دیر تک سفر نہ کر سکے گا۔ اس کے علاوہ وہ اپنے اندازے کے مطابق ایک سمت پر سفر جاری رکھے ہوئے تھا جب کہ اس کے راہنما پاؤں کے نشانات طوفان نے مٹا دیئے تھے۔

ایک جگہ اس کے گھوڑے نے ریت کے ایک نئے بنتے ہوئے ایک چھوٹے سے ٹیلے سے ٹھوکر کھائی اور ریت پر گر گیا۔ عدی جس نے اپنے گھوڑے کی باگ اپنے بائیں بازو کے گرد لپیٹ رکھی تھی منہ کے بل ریت کے اس ٹیلے پر گر گیا۔ دوبارہ اسے اٹھنے کی ہمت نہ ہوئی۔ اس پر غشی سی طاری ہو گئی تھی اور ریت بڑی تیزی سے اسے ڈھانپنے لگی تھی۔

عدی کو جب ہوش آیا تو اس نے دیکھا وہ دریائے فرات کے کنارے لیٹا

ہوا تھا اور دو آدمی اس پر جھکے ہوئے تھے جن میں سے ایک اس کے حلق میں پانی انڈیل رہا تھا۔ عدی نے ان دونوں کی طرف دیکھا۔ وہ اس کے اپنے قبیلے کے دو جوان تھے۔ عدی نے ان کی طرف دیکھتے ہوئے حیرت سے پوچھا۔

"تم دونو یہاں کیسے؟"

"تمہارا ماموں مر چکا ہے اور اس کی جگہ اب تمہارا باپ قبیلے کا سردار ہے۔ تمہاری روانگی سے ایک روز بعد بنو ازد کے حکمران جذیمہ کے دو قاصد ہمارے قبیلے میں آئے اور انہوں نے تمہیں طلب کیا۔ جذیمہ کو کسی طرح یہ خبر ہو گئی تھی کہ تم ملکہ الزباء کی طرف روانہ ہو گئے ہو۔ یہ بات شاید اسے ناگوار گزری کیونکہ جذیمہ اور الزباء دونوں ازلی دشمن ہیں۔

اب جذیمہ نے ہمارے قبیلے کے نام پیغام بھیجا ہے کہ عدی کو میرے پاس بھیج دیا جائے ورنہ میں بنو ایاد پر حملہ کر دوں گا۔ تمہارے باپ نے جو اب قبیلے کا سردار ہے۔ ان قاصدوں کو یہ کہہ کر روک رکھا ہے کہ میرا بیٹا لوٹ آئے پھر تمہیں کوئی فیصلہ کن جواب دیا جائے گا۔

ہم الزباء کے پاس گئے تھے۔ اس نے ہمیں بتایا تھا کہ عدی اب یہاں سے مقابلہ جیت کر جا چکا ہے۔ جب ہم اس کے شہر سے باہر نکلے تو ایک ہمدرد بوڑھے نے بڑی رازداری سے ہمیں کہا تھا کہ ملکہ الزباء کے جاسوسوں نے اسے خبر دی تھی کہ تم ایک خانہ بدوش لڑکی سے محبت کرتے ہو۔ الزباء چونکہ خود تمہیں پسند کرتی ہے لہٰذا یہ بات اسے ناگوار گزری وہ بوڑھا کہہ رہا تھا۔ الزباء نے اس خانہ بدوش لڑکی کو قتل کرا دیا ہے اور اس کے قبیلے کو بڑی سختی سے صحرا کے اس حصے سے کوچ کر جانے کا حکم دیا ہے۔

اس بوڑھے نے کہا تھا عدی ضرور اس خانہ بدوش قبیلے کا تعاقب کرے گا۔ لہٰذا ہم دونوں بھی تمہاری تلاش میں تمہارے تعاقب میں لگ گئے۔ تم ہمیں صحرا کے اندر بے ہوش پڑے ملے تھے۔ تمہارا بایاں ہاتھ تمہارے گھوڑے کی باگ سے بندھا ہوا تھا اور گھوڑا تمہیں لیے ادھر اُدھر پھرتا رہا۔ ورنہ تم ریت تلے دب کر ختم ہو چکے ہوتے۔ اب سنبھلو اور ہمارے ساتھ قبیلے میں چلو۔ سردار بڑی بے چینی سے تمہارا انتظار کر رہا ہے۔"

ربیعہ کے مرنے کا سن کر عدی اداس ہو گیا تھا۔ چند لمحوں تک وہ کھویا کھویا سا

رہا پھر اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ کچھ سوچا اور اس کے بعد فوراً اس کا چہرہ غصّے میں سُرخ ہو کر تب اُٹھا جنونی کیفیت میں وہ اپنا ہاتھ تلوار کے دستے پر لے گیا اور زخم خوردہ درندے کی طرح غراتے ہوئے کہا۔

"مَیں الزباء سے ربیعہ کا انتقام ضرور لوں گا۔ اس نے ربیعہ کو قتل نہیں کیا بلکہ عدی بن نصر کے دل میں زہریلا خنجر گھونپ دیا ہے۔ مَیں اسے سرکش اونٹ اور مینڈھے کی طرح باندھ کر ماروں گا۔" عدی اُٹھ کر اپنے گھوڑے پر سوار ہُوا اور اِن دونوں جوانوں کے ساتھ وہ اپنے قبیلے کی طرف کُوچ کر گیا۔

ایک روز سہ پہر کے قریب عدی اپنے دونوں ساتھیوں کے ساتھ صحرا کے اس حصّے میں داخل ہُوا جہاں اس کا قبیلہ آباد تھا۔ جہاں تک نگاہ کام کرتی تھی صحرا کے اندر نخلستانوں کا ایک سلسلہ پھیلا ہُوا تھا۔ جگہ جگہ انگور اور کھجوروں کے گھنے اور بہار دیتے ہوئے باغات تھے اور میٹھے پانی کے کنوؤں کے قریب قریب گندم اور جَو کی فصلیں پھیلی ہوئی تھیں۔

اپنے ساتھیوں سے علیحدہ ہو کر عدی ایک سادہ سے کچّے مکان میں داخل ہُوا صحن کے اندر دُھوپ میں اس کا بوڑھا باپ اور بنو ایاد کا سردار نصر بیٹھا تھا اور اس کے پاس قبیلے کے کچھ اور سرکردہ لوگ بھی بیٹھے ہوئے تھے۔ عدی کو دیکھتے ہی سردار اپنی جگہ سے اُٹھ کھڑا ہُوا اس نے اپنے دونوں بازو پھیلا دیئے اور میرا بیٹا! میرا بچّہ! پکارتا ہُوا وہ عدی کی طرف بڑھا۔ عدی نے اپنے گھوڑے کی باگیں چھوڑ دیں اور اپنے بوڑھے باپ کی طرف بھاگا۔ اس کے باپ نے اسے اپنے بازوؤں میں لے لیا اور اس کی پیشانی چُومنے لگا۔ عدی نے بھرائی ہوئی آواز میں پوچھا۔

"بابا! میرے ماموں کو کیا ہُوا؟"

بوڑھے سردار نے دلگیر سی آواز میں جواب دیا۔

"نہ وہ بیمار ہُوا، نہ اسے کوئی حادثہ پیش آیا۔ اچانک موت نے آلیا۔ مرنے سے پہلے اس نے تمہیں بہت یاد کیا تھا۔"

عدی نے اپنے آنسو پونچھتے ہوئے پوچھا۔

"بنو ازد کے حکمران جذیمہ کے جو قاصد مجھے لینے آئے تھے وہ کہاں ہیں؟"

باپ نے بیٹے کی پیٹھ پر پیار سے ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

"مَیں نے انہیں اس وعدے کے ساتھ واپس لوٹا دیا ہے کہ میرا بیٹا ملکہ الزباء کے پاس اس کے پہلوانوں سے مقابلہ کرنے گیا ہُوا ہے۔ جب وہ لوٹے گا تو اُسے تمہارے پاس بھیج دوں گا۔"

عدی نے حیرت اور پریشانی میں پوچھا۔

"کیا مجھے جذیمہ کے پاس جانا چاہیئے؟"

نصر افسردہ ہو گیا۔ کوئی باپ اپنے بیٹے کو یوں اپنے آپ سے علیحدہ کرنا نہیں چاہتا۔ بنو ازد کا حکمران جذیمہ تمہیں مجھ سے خریدنا چاہتا ہے لیکن مَیں اپنے بیٹے کو کیونکر بیچ سکتا ہوں۔ جذیمہ سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لیے میرے ذہن میں ایک ترکیب ہے شاید تم بھی اسے پسند کرو۔"

عدی نے باپ سے علیحدہ ہوتے ہوئے کہا۔

"جلدی کہہ دو بابا! جو کچھ تم نے سوچ رکھا ہے۔ اگر میرے بس میں ہُوا تو مَیں اسے ضرور پورا کروں گا۔"

باپ نے بیٹے کے شانے پر پیار سے ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

"سنو! جذیمہ اور اس کے قبیلے والے دو بتوں کی پوجا کرتے ہیں اور ان دونوں بتوں کو اپنا خدا مانتے ہیں۔ اگر تم کسی طرح ان دونوں بتوں کو اُٹھا لاؤ تو ہم جذیمہ کو کہلا بھیجیں گے کہ اگر تم نے ہم پر حملہ کیا اور عدی کو ہم سے مانگا تو ہم دونوں بتوں کو توڑ دیں گے۔ ایسی صورت میں جذیمہ ہمارے سامنے جھکنے پر مجبور ہو جائے گا۔

سنو میرے بیٹے! وہ دونوں بُت جذیمہ کے شہر کے شمالی حصّے میں ایک معبد کے اندر رکھے گئے ہیں اور وہ پتھر کے اتنے بڑے اور بھاری بُت ہیں کہ کئی آدمی مِل کر بھی انہیں

اُٹھا نہیں سکتے لیکن مَیں جانتا ہوں تم طاقتور ہو اور جنگلی گھوڑوں جیسا زور رکھتے ہو۔ اگر تم کوشش کرو تو تم انہیں معبد سے نِکال کر اونٹ پر لاد کر لا سکتے ہو۔ اس مقصد کے لیے تمہیں قبیلے کا ایک ایسا سرکش اونٹ مہیا کیا جائے گا جو ان دونوں بتوں کو لاد کر بڑی آسانی سے صحرا عبور کرے گا۔ کیا تم میری اس سوچ سے اتفاق کرتے ہو"۔

عدی نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔

"مَیں جذیمہ کے دونوں بتوں کو ضرور اُٹھا کر لاؤں گا"۔

"تو پھر آج آرام کرو اور کل نبوازد کی طرف روانہ ہو جاؤ۔ تمہارے ساتھ قبیلے کے دو ایسے جوان بھی جائیں گے جو تمہارے بعد قبیلے کے طاقتور ترین جوان ہونے کا دعویٰ کر سکتے ہیں۔ تم تینوں جذیمہ کے شہر میں بنو لخم کے تاجروں کے بھیس میں داخل ہونا۔ رات کی تاریکی میں معبد کے اندر داخل ہونا اور دونوں بُت اُٹھا کر لے آنا"۔

عدی پیچھے ہٹا اپنے گھوڑے کو اس نے کھجور کے پتوں سے بنے ہوئے ایک چھپر تلے باندھا۔ خرجین سے نقدی کی دونوں تھیلیاں نِکال کر اس نے باپ کو تھماتے ہوئے کہا۔

"بابا! یہ گیارہ ہزار سُرخ دینار ہیں جو مَیں نے بنو قسطورا کی حکمران الزباء کے پہلوان سے مقابلہ جیت کر حاصل کیے ہیں۔ ان سے تم اپنے قبیلے کے لیے بنو لخم سے میٹھے پانی کے دو چشمے خرید سکتے ہو اور ایسا کرنے سے ہمارا قبیلہ بھی دوسرے عرب قبائل کی طرح خوشحال ہو جائے گا اور ہم ان سے کہیں بہتر اور اچھی فصلیں پیدا کر سکیں گے"۔

بوڑھے نصر نے نقدی کی دونوں تھیلیاں تھام لیں اور اپنے دونوں ہاتھ دُعا کے انداز میں آسمان کی طرف اُٹھاتے ہوئے کہا۔

"ابراہیمؑ کا رب تمہیں تمہارے ہر کام اور مقصد میں کامران اور کامیاب نکالے گا"۔

نصر نے نقدی کی دونوں تھیلیاں اپنے ایک چوبی صندوق میں رکھ دیں۔ اور باہر آ کر عدی سے کہا۔

"مَیں کل تمہارے ساتھ روانہ ہونے والے اِن دونوں جوانوں کو مطلع کرنے اور تین اچھے صحت مند اور جفاکش اونٹوں کا بندوبست کرنے جاتا ہوں۔ تم

تھوڑی دیر تک نہا لو، پھر کھانا کھاتے ہیں"۔

نصر مکان سے نِکل گیا۔ عدی بھی اپنے گھوڑے پر سوار ہو کر مکان سے نِکلا اور نہانے کے لیے چشمہ کی طرف چلا گیا۔

الزباء کو اس کے جاسوسوں نے خبر دی تھی کہ عدی ایک خانہ بدوش قبیلے کی لڑکی سے محبت کرتا ہے جس کا نام ربیعہ ہے۔ الزباء چونکہ خود بھی عدی کو پسند کرتی تھی لہٰذا وہ اپنے راستے میں یہ دیوار برداشت نہ کر سکی۔ اس نے سپاہیوں کا ایک دستہ خانہ بدوش قبیلے کی طرف یہ حکم دے کر روانہ کیا کہ ربیعہ کو قتل کر دیا جائے اور خانہ بدوشوں کو مجبور کریں کہ وہ وہاں سے پڑاؤ ہٹا لیں اور کبھی صحرا کے اس حصّے کا رُخ نہ کریں۔ الزباء کا وہ فوجی دستہ جب خانہ بدوش قبیلے میں داخل ہوا اور ربیعہ کو قتل کرنا چاہا تو اتفاق سے دستے کا کمانڈر اس خانہ بدوش مغنّی کا جاننے والا نِکلا۔ اس کی التجا پر ربیعہ قتل ہونے سے بچ گئی تھی تاہم اس دستے کے کمانڈر نے اس مغنی کو سمجھایا کہ اپنے قبیلے کے ساتھ یہاں سے کُوچ کر جائے اور یہ مشہور کر دیا جائے کہ ربیعہ قتل ہو گئی ہے۔

اس نے مغنّی کو یہ بھی مشورہ دیا کہ یہاں سے کُوچ کر کے صحرا کے کسی ایسے دشوار گزار راستے سے ہو کر کہیں اور پڑاؤ کرے تاکہ الزباء کا کوئی اور دستہ اگر ان کی تلاش میں روانہ ہو تو وہ انہیں تلاش نہ کر سکیں۔ انہوں نے خانہ بدوشوں کو یہ بھی بتایا کہ الزباء عدی سے عنقریب شادی کرے گی۔

یہ خبر ربیعہ پر بجلی بن کر گری تھی۔ اس کا دِل نہیں مانتا تھا کہ عدی اس سے دھوکہ کرے گا تاہم اس نے صحرا میں تپتے کسی تنہا اور اکیلے درخت کی طرح چُپ

سادھ لی تھی - اس کی مسکراہٹیں مُرجھائے ہُوئے پھُولوں کی پتّیوں کی مانند بکھر گئی تھیں اور اس کے ہونٹ سِل گئے تھے - صحرا کے اندر وہ جہاں بھی پڑاؤ کرتے اور مغنّی جب طنبورہ بجاتا تو وہ خاموش کھڑی آنسو بہاتی ہوئی اس ماحول کو دیکھتی رہتی - اس کی نگاہوں ، اس کے دِل اور اس کے ذہن کو عدی کا انتظار تھا اور اب اس کی التجا پر اور بوڑھے عوف کے کہنے پر قبیلہ اس دشوار گزار صحرا کا ایک لمبا چکّر کاٹ کر نبوایاد کی طرف بڑھ رہا تھا -

ربیعہ کو یقین تھا عدی ضرور اپنے قبیلے میں چلا گیا ہوگا لہٰذا وہ اس کے قبیلے میں جا کر اس سے مِلنا چاہتی تھی - اس طرح وہ خانہ بدوش قبیلہ سفید ریت کے اس اندھے صحرا میں قیام و کُوچ کرتا ہوا اپنی منزل کی طرف بڑھ رہا تھا -

مغرب کی پُراسرار فنا گاہوں میں سُورج غروب ہو چکا تھا اور ایشیا کا سبز آسمان ستاروں سے بھرا ہُوا تھا - چاندی کی سنہری رتھ اپنا سفر طے کر رہی تھی - تین شُتر سوار اپنے اُونٹوں کو بھگاتے ہوئے صحرا کی بیکراں وسعتوں کو سمیٹ رہے تھے - ان میں سے ایک عدی تھا جو ایک سُرخ رنگ کے سرکش اونٹ پر سوار تھا اور دوسرے دو اس کے ساتھی تھے -

صحرا کے اندر چاندنی کے پُراسرار جنگلی رنگ بکھر گئے تھے - بُھوکے گیدڑوں کی کربناک چیخیں بلند ہو رہی تھیں - سرمائی ہوا میں صحرا کی جھاڑیوں کی خوشبو اور اوس کی نمی تھی - اچانک عدی کے ایک ساتھی نے حدی گانا شروع کی ، اُونٹ بلبلائے اور حدی کے سنگیت پر انہوں نے اپنی رفتار تیز کر دی تھی - حدی کے پُرسوز بول اور اونٹوں کے گلوں میں بندھی ہوئی کانسی کی گھنٹیوں کی آئینے کی طرح پُرسکون صحرا میں دُور دور تک بکھرنے لگی تھیں -

اگلے روز سہ پہر کے قریب عدی اور اس کے دونوں ساتھی نبوازد کے شہر میں داخل ہوئے اور شہر کی ایک شمالی سرائے میں قیام کیا - انہوں نے سوداگروں کے

سے رنگین چُغے پہن رکھے تھے جن کے نیچے ان کے بہترین اور چمکتے ہوئے ہتھیار سجے ہوئے تھے -

آدھی رات کے قریب جب کہ کائنات کی ہر چیز اونگھ رہی تھی ، عدی اپنے ساتھیوں کے ساتھ اُٹھا - اصطبل سے انہوں نے اپنے اونٹ کھولے اور سرائے سے باہر نکل گئے - اونٹوں کی گردنوں سے بندھی ہوئی کانسی کی بڑی بڑی گھنٹیاں انہوں نے اُتار دی تھیں تاکہ رات کے سناٹے میں آواز پیدا نہ ہو - تینوں بڑی رازداری سے نبوآزد کے معبد کے پاس آئے اور ایک بلند دیوار کے سائے میں انہوں نے اُونٹ کھڑے کر دیے - عدی معبد کے دروازے کے پاس آیا اور اسے پیچھے دھکیلا - لکڑی کے موٹے تختوں کا بھاری دروازہ اندر سے بند تھا -

عدی اپنے ساتھیوں کے پاس واپس آیا اور رات کے سناٹے میں ان سے سرگوشی میں کہا -

" مَیں کمند کے ذریعے معبد میں داخل ہو کر دروازہ کھولتا ہوں تم دونوں چوکس اور چوکنے رہنا - اگر تمہیں کوئی دیکھ لے اور یہاں کھڑے ہونے کی وجہ پوچھے تو کہنا مسافر ہیں معبد کے پاس سے گزرتے ہوئے دُعا مانگنے کے لیے یہاں رُک گئے ہیں "

عدی نے اپنے اونٹ سے کمند کھولی - وہ ایک مضبوط رسّی تھی جس کے ایک سِرے پر لوہے کی خمیدہ کئی سلاخیں بندھی ہوئی تھیں جن کی شکل شاہین کے پنجوں سے ملتی جلتی تھی - عدی نے لوہے کے ان پنجوں کو اپنے ہاتھ میں تھاما ، کمند کا کچھ حصّہ ایک گول چکر میں دوہرا کیا پھر اپنے ہاتھ کو لہرایا اور خوب زور سے اس نے کمند معبد پر پھینکی - لوہے کے مضبوط پنجے معبد کی عمارت میں کہیں پھنس گئے تھے - عدی نے دو ایک بار کمند کھینچ کر اس کی پختگی کا جائزہ لیا پھر وہ بڑی تیزی سے معبد کی دیوار پر چڑھنے لگا تھا -

معبد کے اُوپر جا کر عدی نے کمند نکال کر نیچے پھینکی جسے اس کے ساتھیوں نے لپیٹ کر اس کے اونٹ سے باندھ دیا - عدی معبد کے اندر اُترا ، لکڑی کا وزنی دروازہ کھولا - اس کے دونوں ساتھی اپنے تینوں اونٹوں کے ساتھ معبد میں داخل ہو گئے اور

عدی نے پہلے کی طرح معبد کا دروازہ پھر بند کر دیا۔

تینوں نے مل کر اونٹ ایک جگہ باندھ دیئے اور معبد کے کمروں کا جائزہ لینے لگے۔ انہوں نے اپنی چمکتی ہوئی تلواریں بے نیام کر لی تھیں اور بد سے بدترین حالات کا مقابلہ کرنے کے لیے مستعد ہو گئے تھے۔ انہوں نے دیکھا ایک کمرے میں معبد کے محافظ سوئے ہوئے تھے۔ تینوں ایک ساتھ اُن پر ٹوٹ پڑے بالکل اس طرح جیسے شاہین کرگسوں پر حملہ آور ہوتے ہیں۔ آن کی آن میں انہوں نے محافظوں کو قابو کر کے ان کے ہاتھ پاؤں باندھ کر ان کے مُنہ میں کپڑے ٹھونس دیئے تھے۔

محافظوں سے فارغ ہو کر وہ اس کمرے میں داخل ہوئے جس کے اندر بُت تھے وہ سنگ مرمر اور قیمتی سُرخ پتھر سے بنا ہُوا ایک بہت بڑا کمرہ تھا جس میں شمالی دیوار کے ساتھ ایک بلند شہ نشین پر دو بہت بڑے اور وزنی پتھر کے بُت ایستادہ تھے۔ کمرے کے اندر جلتے ہوئے لوبان کی تیز خوشبو بکھری ہوئی تھی۔ عدی نے اپنے ایک ساتھی سے سرگوشی کی

"میرا اونٹ اس کمرے کے سامنے لا کر بٹھا دو۔"

وہ جوان پیچھے ہٹا اور عدی کا اونٹ کھول کر وہ وہاں لایا اور نکیل کی رسی اونٹ کے گھٹنوں پر مار کر اس نے اونٹ کو اس کمرے کے سامنے بٹھا دیا۔

عدی کمرے میں داخل ہُوا اس کے دونوں ساتھی اس کے پیچھے تھے۔ عدی نے مُڑ کر ان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"تم دونوں باہر ہی رکو۔ میرے باپ نے کہا تھا ان بُتوں کو کئی جوان مل کر بھی نہیں اُٹھا سکتے۔ اس نے مجھ سے یہ بھی کہا تھا تم طاقتور ہو شاید تم وہ بُت اُٹھا لو۔ میں دیکھتا ہوں میرے باپ نے مجھ سے جو اُمیدیں وابستہ کی تھیں کیا میں اُن پر پورا اُترتا ہوں۔"

عدی پھر آگے بڑھا اس کے دونوں ساتھی کمرے سے باہر نکل گئے۔ بُتوں کے پاس آ کر دُعائیہ انداز میں دونوں ہاتھ فضا میں بلند کرتے ہوئے عدی نے بڑی رقت آمیز آواز میں کہا۔

"اے ابراہیمؑ کے رب آزمائش کی اس گھڑی میں میری مدد کر۔" پھر کمرے

کے اندر جلتی ہوئی مشعلوں کی تیز روشنی میں عدی کے دونوں ساتھیوں نے دیکھا عدی کے چہرے پر جنگلی جلال اور وحشی ہیبت چھا گئی تھی۔ اس نے اپنے دونوں مضبوط اور آہنی بازو بُت کی کمر کے گرد لپیٹے جُھک کر اس نے زور لگایا اور بُت کو اُوپر اُٹھا لیا۔

اس کے دونوں ساتھی بڑی حیرت سے یہ منظر دیکھ رہے تھے۔ عدی بُت کو اُٹھا کر باہر لایا اور اونٹ کے کجاوے کے ساتھ اسے رکھتے ہوئے وہ دوبارہ اندر گیا اور دوسرے بُت کو اُٹھا کر اس نے کجاوے کے دوسری طرف رکھ کر اپنے ساتھیوں سے کہا۔

"جلدی جلدی انہیں رسّیاں پھیر کر باندھ دو۔ ان پر کپڑے ڈال کر انہیں ڈھانپ دو اور فوراً یہاں سے کُوچ کی تیاری کرو۔"

بنو ایاد کے اِن دونوں جوانوں نے عدی کی مدد سے دونوں بُتوں کو اونٹ پر لادا اور اُنہیں رسیوں سے خوب کس کر باندھ دیا اور کپڑوں سے دونوں بُتوں کو اچھی طرح ڈھانپ دیا گیا۔ پھر عدی نے اُونٹ کو اُٹھایا۔ اس کے ساتھیوں نے بھی اپنے اُونٹ کھول لیے تھے۔ معبد سے نکل کر عدی نے اپنے اونٹ کو ایک جگہ کھڑا کیا۔ معبد کا دروازہ بند کیا اور اپنے اُونٹ کی گردن میں ہاتھ ڈال کر وہ اُونٹ پر سوار ہو گیا۔ اس کے دونوں ساتھی بھی اپنے اونٹوں پر سوار ہو چکے تھے اور عدی کی رہنمائی میں وہ بڑی تیزی سے شہر سے باہر نکلنے لگے۔

تین سواروں اور اُونٹوں کا یہ مختصر ترین کاروان کہیں رُکے بغیر صحرا میں دُھول اُڑاتا ہوا اپنے قبیلے میں داخل ہُوا۔ بوڑھے سردار نصر نے مکان سے باہر نکل کر بیٹے کا استقبال کیا۔ جب عدی کا اُونٹ مکان کے سامنے بٹھایا گیا اور بُتوں کے گرد لپٹے ہوئے کپڑے ہٹائے گئے تو نصر نے آگے بڑھ کر بیٹے کو لپٹاتے ہوئے اس کی پیشانی چُوم لی۔

"مجھے پختہ یقین تھا تم ضرور ان بُتوں کو اُٹھا لو گے"

عدی نے دونوں بُت اُٹھا کر اپنے گھر میں رکھ دیئے۔ اسی وقت بنو ایاد کے حکمران نے جذیمہ کے نام ایک خط لکھا اور ایک تیز رفتار گھڑ سوار کو دے کر جذیمہ کی طرف روانہ کر دیا۔

نوازد کا حکمران جذیمہ اپنے صحرائی محل میں اپنے وزیر قصیر بن سعد کے ساتھ بتوں کی چوری ہو جانے کے متعلق بات کر رہا تھا۔ ان دونوں کے پاس جذیمہ کی جوان اور حسین بہن رقاش بیٹھی ہوئی تھی۔ یہ ایک خوبصورت ترین لڑکی تھی اور عرب قبیلوں کے کئی سردار اس سے شادی کرنے کا پیغام دے چکے تھے لیکن جذیمہ سب کی خواہش کو ٹھکرا چکا تھا۔ رقاش اس کی اکلوتی بہن تھی اور وہ اسے کسی بڑی سلطنت کے حکمران کے ساتھ بیاہنے کی خواہش رکھتا تھا۔

بت چوری ہو جانے پر جذیمہ سخت پریشان تھا کیونکہ وہ اور نوازد والے ان دونوں بتوں کو اپنا خدا مان کر ان کی پوجا کرتے تھے اور بت چوری ہو جانے سے ان کے مذہبی عقیدے کو سخت دھچکا لگا تھا۔ پچھلے پورے دن سے نوازد کے کھوجی بت چرانے والوں کو تلاش کر رہے تھے اور ابھی تک صحرا کے اندر ہی بھٹک رہے تھے۔ تاہم صحرا کے اندر ان کھوجیوں کا رُخ نبوایاد کی طرف تھا۔

جذیمہ، اس کی بہن رقاش اور وزیر قصیر بن سعد اسی طرح بحث میں مصروف تھے کہ نوازد کا ایک نوجوان نبوایاد کے سردار نصر کے قاصد کو لے کر اندر آیا اور جذیمہ کو مخاطب کیا۔

"نبوایاد کا ایک قاصد آپ کے نام کوئی پیغام لایا ہے۔"

نبوایاد کا قاصد خود آگے بڑھا اور سفید رنگ کا لپٹا ہوا ایک کپڑا جذیمہ کو تھما دیا جس پر نبوایاد کے سردار کی طرف سے جذیمہ کے نام پیغام لکھا تھا۔ جذیمہ نے کپڑا کھول کر پڑھا، نصر نے لکھا تھا۔

"تمہارے دونوں بت اٹھا کر ہم اپنے قبیلے میں لے آئے ہیں اگر تم نے

میرے بیٹے کو حاصل کرنے کے لیے میرے قبیلے پر حملہ کیا تو یاد رکھو ہم تمہارے دونوں بت توڑ کر صحرا میں پھینک دیں گے۔ تمہاری بہتری اسی میں ہے کہ ہماری طرف صلح کا ہاتھ بڑھاؤ۔" جذیمہ نے کپڑے پر لکھا ہوا وہ خط اپنے وزیر قصیر کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

"اسے پڑھو اور بتاؤ ہمیں اب کیا اقدام کرنا چاہیے۔"

قصیر بن سعد نے وہ خط پڑھا اور کپڑے کو تہ کرتے ہوئے اس نے قاصد سے پوچھا۔ "ہمارے بت کون اٹھا کر لے گیا تھا۔"

قاصد نے مڑ کر قصیر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"ہمارے سردار کا بیٹا اور ان صحراؤں کا طاقتور ترین انسان عدی بن نصر۔"

قصیر نے حیرت کا اظہار کیا۔

"وہ اکیلا بتوں کو اٹھانے میں کس طرح کامیاب ہو گیا جب کہ ان بتوں کو دس آدمی بھی مل کر نہیں اٹھا سکتے اور وہ معبد کے کمرے میں بڑی مضبوطی سے ایستادہ تھے۔"

قاصد نے فخر سے چھاتی تانتے ہوئے کہا۔

"عدی بن نصر صحراؤں کا بیٹا ہے۔ لوگ جانتے ہیں وہ دس جنگلی گھوڑوں جیسی طاقت رکھتا ہے۔ اگر بت اس سے بھی بھاری ہوتے تو بھی وہ انہیں اکھاڑ اور اٹھا کر لے جاتا اور پھر تم جانو جو شخص چٹانوں کو اکھاڑ پھینکنے کی طاقت رکھتا ہو اس کے سامنے ان دو بتوں کی کیا حیثیت تھی۔"

جذیمہ اور قصیر دونوں خاموشی سے ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔ قاصد نے ان سے پھر سوال کیا۔

"تم عدی کو کیوں ہم سے مانگتے ہو؟"

جذیمہ نے جواب دیا۔ "اس لیے کہ وہ بہادر، جنگجو اور طاقتور ہے۔"

قاصد نے مسکرا کر کہا۔ "یہ کیونکر ممکن ہے؟"

جذیمہ نے سر کے اشارے سے اپنے آدمی کو حکم دیا کہ وہ قاصد کو باہر لے جائے نوازد کا وہ جوان جو قاصد کو لے کر آیا تھا اُسے پکڑ کر باہر لے گیا۔ جذیمہ نے اب اپنے وزیر

قصیر سے پوچھا۔

"اب ہمیں کیا کرنا چاہیے؟"

قصیر نے بڑے اطمینان سے کہا۔

"میں آج ہی دو سرکردہ سرداروں کے ساتھ اس قاصد کے ہمراہ بنو ایاد کی طرف روانہ ہو جاؤں گا اور میں آپ کو یقین دلاتا ہوں میں اپنے دونوں بتوں کے ساتھ عدی کو بھی اپنے ساتھ لانے میں کامیاب ہو جاؤں گا۔"

جذیمہ نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔

"اگر تم ایسا کر سکو تو میں سمجھوں گا دنیا میں تم جیسا کوئی عقلمند انسان نہ ہوگا۔"

قصیر اپنی جگہ پر کھڑا ہو گیا۔

"میں اب روانگی کی تیاری کرتا ہوں۔"

جذیمہ نے اثبات میں گردن ہلائی اور قصیر باہر نکل گیا۔

تیسرے روز شام کے وقت جذیمہ کا وزیر قصیر بن سعد اپنے قبیلے کے دو سرکردہ سرداروں کے ساتھ بنو ایاد میں داخل ہوا۔ عدی اور اس کے باپ نے ان کا بڑی گرمجوشی سے استقبال کیا۔ سورج جب غروب ہو گیا تو قصیر نے بنو ایاد کے بوڑھے سردار پر اپنی آمد کا مقصد ظاہر کیا اس نے سردار کو یقین دلایا کہ اگر ہمارے دونوں بت واپس کر دیئے جائیں اور عدی کو میرے ساتھ روانہ کر دیا جائے تو جذیمہ کسی صورت بنو ایاد پر حملہ آور نہ ہوگا۔ قصیر نے بوڑھے سردار کو یہ بھی یقین دلایا کہ جذیمہ عدی کو اپنے پاس بلا کر کوئی گزند نہ پہنچائے گا وہ اس کی شجاعت اور طاقت سے متاثر ہے۔ وہ عدی کو اپنی افواج کا سپہ سالار بنا کر بنو قسطورا کی ملکہ الزباء سے ایک فیصلہ کن جنگ لڑنا چاہتا ہے اسی لیے وہ عدی

کو تم سے مانگ رہا ہے۔

ملکہ الزباء کا ذکر آتے ہی عدی کا خون کھول گیا۔ گو ربیعہ ابھی زندہ تھی تاہم اسے یہی بتایا گیا تھا کہ ربیعہ کو الزباء نے قتل کرا دیا ہے لہذا اس نے انتقامی جذبے کے تحت قصیر کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"اگر جذیمہ مجھے اپنی افواج کا سپہ سالار بنا کر الزباء کے خلاف جنگ کرنے کے لیے بھیجے تو میں تمہارے ساتھ جانے کو تیار ہوں۔"

قصیر نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔

"میں تمہیں اس کی ضمانت دیتا ہوں۔"

عدی کا باپ شاید عدی کو قصیر کے ساتھ بھیجنے پر رضامند نہ ہوتا لیکن خود عدی کے ہاں کر لینے پر وہ عدی کو بھیجنے کے لیے آمادہ ہو گیا۔ دوسرے روز قصیر عدی اور اپنے دونوں بتوں کے ساتھ اپنے قبیلے کی طرف روانہ ہو گیا تھا۔

سہ پہر کے قریب بنو ازد کے شہر میں قبیلے کے جاسوس یہ خبر لے کر آئے کہ قصیر اپنے دونوں بتوں اور عدی بن نصر کے ساتھ آ رہا ہے اور تھوڑی دیر بعد شہر میں داخل ہونے والا ہے۔ شہر کے لوگ کیا مرد کیا عورتیں عدی کو دیکھنے کے لیے اس شاہراہ کے گرد جمع ہو گئے تھے جو صحرا سے نکل کر شہر میں داخل ہوتی تھی۔

چار اونٹوں پر مشتمل ایک کارواں شہر میں داخل ہوا۔ ایک اونٹ پر قصیر سوار تھا۔ دوسرے دو اونٹوں پر اس کے قبیلے کے بزرگ سردار تھے۔ چوتھا اونٹ عدی کا تھا اس پر وہ خود بھی بیٹھا ہوا تھا اور بنو ازد کے دونوں بت بھی لدے ہوئے تھے۔ شہر کے لوگ عدی پر پھول پتیاں نچھاور کر رہے تھے لیکن اس کی گردن جھکی ہوئی تھی شاید اس ندامت کے باعث کہ وہ ان کے دونوں بت اٹھا کر لے گیا تھا۔

معبد کے سامنے جذیمہ اپنی حبشی رقاصہ کے ساتھ کھڑا تھا اس کے اشارے پر چاروں اونٹ معبد کے سامنے رک گئے۔ لوگوں کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر سا معبد کے گرد جمع ہو گیا۔ قصیر کے اشارے پر عدی اپنے اونٹ سے نیچے کودا۔ قصیر نے

اِس کا ہاتھ تھاما اور جذیمہ کے پاس لے جا کر اس نے دونوں کا تعارف کرایا۔

جذیمہ نے عدی کو گلے لگا لیا اور اِس کی پیٹھ تھپتھپاتے ہوئے اس نے کہا۔

"تم ایک بہادر اور طاقت ور ترین انسان ہو۔ معبد کے گرد کھڑے ہوئے میرے قبیلے کے سب لوگ یہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ تم ہمارے بت کس طرح اُٹھا کر لے گئے۔ تو اپنے اُونٹ کو بٹھاؤ اور بتّوں کو اُٹھا کر اسی جگہ رکھو جہاں سے تم نے اُٹھائے تھے۔ اس طرح میرے قبیلے کے لوگوں کو اطمینان ہو جائے گا کہ مَیں نے تمہیں اپنی افواج کا سپہ سالار بنانے کا جو فیصلہ کیا ہے وہ دُرست اور مناسب ہے"۔

جذیمہ کے پاس سے عدی اپنے اونٹ کے پاس آیا نکیل کی رسّی پکڑ کر اس نے اُونٹ کی اگلی ٹانگوں پر مارتے ہوئے مُنہ سے عجیب آوازیں نکالنا شروع کیں اونٹ نے اپنی اگلی ٹانگوں کو خم کر دیا اور زمین پر بیٹھ گیا۔

عدی اس رسّی کے بَل کھولنے لگا جس سے دونوں بُت بندھے ہوئے تھے ہزاروں لوگوں کے دیکھتے ہی دیکھتے عدی نے اپنے آہنی بازو ایک بُت کی کمر کے گرد ڈالے ذرا سا جھک کر زور لگایا اور وزنی بُت کو اُوپر اُٹھا لیا۔ اِرد گرد کھڑے سب مرد عورتیں تالیاں بجا کر خوشی کا اظہار کر رہے تھے۔ دونوں بُت باری باری اُٹھا کر عدی نے معبد کے اندر اسی جگہ رکھ دیئے تھے جہاں سے اس نے اُٹھائے تھے۔

جب وہ دوسرا بُت اندر رکھ کر معبد سے باہر آیا تو جذیمہ دونوں بتوں کو دیکھنے معبد کے اندر چلا گیا۔ اِس دوران میں جذیمہ کی حسین بہن رقاش عدی کے پاس آئی اور خوشبو میں بسا ہوا اپنا سفید رومال عدی کی ناک کے سامنے لہراتے ہوئے مُسکرا کر سنگیت کی لہروں جیسی آواز میں کہا۔

"میرا نام رقاش ہے، مَیں جذیمہ کی چھوٹی بہن ہوں اور تمہیں پسند کرتی ہوں"

عدی نے ایک بار آنکھیں اُٹھا کر رقاش کی طرف دیکھا۔ اس کے بدن اور چہرے پر نوعمر درختوں جیسی تازگی تھی۔ جذیمہ کے وزیر قصیر نے رقاش کے یہ الفاظ سن لیے تھے اس لیے کہ وہ قریب ہی کھڑا تھا نہ جانے کیا سوچتے ہوئے اس کے چہرے پر

...ہری مسکراہٹ اُبھر گئی تھی۔ عدی نے اپنی گردن جھکا لی تھی اور رقاش اس کے سامنے کھڑی مسکرا رہی تھی۔

جذیمہ معبد سے باہر نکلا۔ عدی کی پیٹھ تھپتھپائی اور اسے اپنے ساتھ اپنے صحرائی محل میں لے گیا۔ بہت جلد جذیمہ عدی سے کچھ اس قدر مانوس ہو گیا کہ وہ عدی کو رزم بزم اور اکل و شرب میں ہر وقت اپنے ساتھ رکھنے لگا۔ دوسری طرف جذیمہ کی بہن بھی بُری طرح عدی سے محبّت کرنے لگی تھی اسی حالت میں کئی روز گزر گئے۔ رقاش اس کوشش میں تھی کہ عدی سے علیحدگی میں بات کرے لیکن جذیمہ ہر وقت اُسے سائے کی طرح اپنے ساتھ رکھتا تھا۔

ایک روز عدی نے شہر کے مضافاتی چشموں اور نخلستانوں میں گھومنے کے لیے جذیمہ سے اجازت لی۔ وہ جذیمہ کے اصطبل میں آیا اور ایک گھوڑے پر زین ڈالے جب وہ اسے لے کر اصطبل سے نِکلا تو اس نے دیکھا وہاں جذیمہ کی بہن رقاش کھڑی تھی جب اس کے پاس سے گزرنے لگا تو رقاش نے اپنا نازک بازو اس کے سامنے پھیلاتے ہوئے اسے روک دیا۔

عدی نے نظر بھر کر رقاش کی طرف دیکھا اس وقت اسے ایسا محسوس ہوا جیسے رقاش کا جوان حسین اور پکا ہوا بدن قدرت کے رموز کا شاہد ہو۔ پھر رقاش کی آواز بلند ہوئی گویا تپلے تپلے نازک نقرئی برتن آپس میں ٹکرائے ہوں۔

"جب تم پہلے روز ہمارے دونوں بُت لے کر اس شہر میں داخل ہوئے تو معبد کے باہر مَیں نے تم سے ایک سوال کیا تھا جس کا تم نے ابھی تک کوئی جواب نہیں دیا"۔

عدی نے حیرت سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"مَیں نہیں جانتا تم نے کیا سوال کیا تھا"۔

"مَیں نے کہا تھا مَیں تمہیں پسند کرتی ہوں"۔

عدی نے بے اعتنائی برتتے ہوئے کہا۔ "یہ سوال نہیں اپنے جذبات کا کھلا
اظہار ہے"۔

رقاش نے مایوسی سے کہا۔

"چلو یونہی سہی۔ پھر تم یک طرفہ اظہار پہ کیا کہتے ہو؟"

"کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ تم مجھے کس قدر پسند کرتی ہو؟"

رقاش نے اُلٹا اس پہ سوال کر دیا۔ "کیا تم رات کے وقت نیلے آسمان
پر نمودار ہونے والے ستاروں کو شمار کر سکتے ہو؟"

"نہیں ——"

"جس طرح تم ستاروں کو شمار نہیں کر سکتے ویسے ہی تم میری محبت کا اندازہ
بھی نہیں کر سکتے ہو"۔

عدی نے بڑی سنجیدگی سے کہا۔

"میں ایک اجنبی ہوں اور اجنبیوں سے دِل لگانا دھوکہ اور فریب کھانا
رقاش کا جواب سُنے بغیر عدی گھوڑے پر سوار ہُوا اور اسے ایڑ لگاتا ہُوا آگے
بڑھ گیا تھا۔

عدی جب واپس آیا اور گھوڑے کو اصطبل میں باندھ کر وہ اس کمرے
داخل ہُوا جس میں اُسے ٹھہرایا گیا تھا تو اس نے دیکھا کمرے کے اندر قصیر اور رقاش
بیٹھے تھے۔ عدی کو دیکھتے ہی قصیر کھڑا ہو گیا اور اپنے قریب بیٹھی ہوئی رقاش کی طرف
اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"میں تمہارے پاس رقاش کا وکیل بن کر آیا ہوں"۔

عدی اس کے پاس بیٹھتا ہُوا بولا۔ "کس بات کا وکیل؟"

"تم جانتے ہو رقاش تمہیں پسند کرتی ہے"۔

"کرتی ہو گی؟"

"میں چاہتا ہوں تم اِس سے شادی کر لو اس میں تمہاری اور ہمارے قبیلے

کی بہتری ہے۔ رقاش کی شادی کے بعد جذیمہ تمہیں فوج کا سپہ سالار ہی نہیں
اعلیٰ عہدہ بھی بنائے گا اور تمہارا فائدہ یہ ہے کہ اس عہدے سے فائدہ اُٹھا کر تم اپنے
قبیلے کے لوگوں کی مدد کر سکو گے"۔

عدی نے گردن جُھکا لی اور سوچنے لگا۔

قصیر پھر بولا۔ "ایسے موقعوں پر لمبی سوچیں اکثر سودمند نہیں ہوتیں۔ میں چاہتا
ہوں تم آج رات جذیمہ سے رقاش کو اپنے لیے مانگو"۔

عدی نے سر اُوپر اُٹھاتے ہوئے فیصلہ کن انداز میں کہا۔

"تم دونوں خود رشتے کی بات کرو"۔

"ہم دونوں کی طرف سے شادی کی بات کرنا مناسب نہیں۔ تم جانتے ہو میں
تمہیں اپنا بھائی خیال کرتا ہوں اور میں تمہیں کوئی ایسا مشورہ نہ دوں گا جس میں تمہارا
نقصان ہو۔ جذیمہ کے ہاں تمہاری بڑی وقعت اور شرف ہے۔ میں تمہیں اپنے بھائی
کی حیثیت سے مشورہ دیتا ہوں کہ آج رات جب جذیمہ نے شراب پی رکھی ہو تم اس سے
رقاش کو اپنے لیے مانگ لو۔ میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ وہ تمہیں انکار نہ کرے گا"۔ قصیر
یہ بات کہہ کر چلا گیا اور عدی سوچوں میں کھو گیا۔

اس رات جب جذیمہ نے خوب شراب پی رکھی تھی قصیر کے مشورہ کے مطابق
عدی نے اس سے رقاش اپنے لیے مانگی۔ جذیمہ نے فوراً ہاں کر لی اور اسی رات رقاش
کی شادی عدی سے کر دی۔

دوسرے روز جب نشہ اُترا اور لوگوں کی زبانی اسے رقاش اور عدی کے عقد
کا علم ہُوا تو غصّے میں بپھر گیا۔ اس نے عدی کو فوراً اپنے محل کے ایک کمرے میں قید کر کے لوہے
کی بھاری زنجیروں میں جکڑ دیا اور قبیلے کے کچھ بزرگ سرداروں سے مشورہ کر کے اس
نے فیصلہ کر دیا کہ آنے والی صبح کو معبد کے اندر دونوں بتوں کے قدموں میں عدی کی گردن کاٹ
دی جائے۔

رقاش اور قصیر دونوں نے اس کی منّت سماجت کر کے عدی کو رہا کرنے کو

کہا لیکن جذیمہ نے ان دونوں کو جھڑک دیا اور اپنے فیصلے پر قائم رہا۔ حالانکہ وہ رقاش کو
اس قدر عزیز رکھتا تھا کہ کبھی اس کی بات رد نہ کرتا تھا۔

رات کے وقت جب کہ ہر طرف اندھیرا پھیل گیا تھا اور جذیمہ نے اس کمرے
کے دروازے پر دو سپاہیوں کا پہرہ لگا دیا تھا جس کے اندر عدی زنجیروں میں جکڑا ہوا
تھا کہ قصیر اور رقاش اس کمرے کے پاس آئے اور دونوں پہریداروں سے عدی سے
ملنے کا بہانہ کیا اور اس کمرے میں داخل ہوئے انہوں نے دیکھا عدی لوہے کی زنجیروں
میں جکڑا ہوا تھا اور زنجیروں کے سرے کمرے کی دائیں بائیں طرف کی دیواروں میں گڑے
ہوئے لوہے کے مضبوط کڑوں سے ملے ہوئے تھے۔ رقاش بھاگ کر آگے بڑھی اور علیحدگی
مل کر رونے لگی۔

قصیر نے رقاش کو خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور عدی کے کان میں سرگوشی کی۔

"جن زنجیروں میں تم جکڑے ہوئے ہو۔ ان کی چابی جذیمہ نے اپنے پاس رکھی
ہے۔ میں نے وہ چابی حاصل کرنے کی بہت کوشش کی مگر ناکام رہا ہوں۔ تم اگر ان زنجیروں
کو توڑ دو تو تمہاری رہائی کا بندوبست ہو سکتا ہے ورنہ آنے والی صبح جذیمہ تینوں کے
سامنے تمہاری قربانی دینے کا عہد کر چکا ہے"۔

عدی نے چونکا دینے والی آواز میں پوچھا۔

"اگر میں ان زنجیروں کو توڑ دوں ——— ؟"

قصیر نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔

"اگر تم ان زنجیروں کو توڑ سکو تو ان کی مدد سے دونوں پہریداروں کو ہلاک
کر کے اس کمرے کی پشت پر پہنچ جاؤ جس میں پچھلی شب تم نے رقاش کے ساتھ میاں
بیوی کی حیثیت سے گزاری تھی وہاں تمہارا اونٹ کھڑا ہے اور رات کی تاریکی میں اونٹ پر
ڈھانپ کر تم بھاگ سکتے ہو تمہارے بھاگنے کا الزام بھی کسی پر نہ آئے گا کیوں کہ زنجیریں
ٹوٹی ہوں گی اور پہریدار ہلاک ہو چکے ہوں گے۔

عدی نے چھاتی تانتے ہوئے کہا۔ "میں ابھی تمہارے سامنے زنجیروں کو توڑ

ہوں"۔

رقاش اور قصیر دونوں بڑی حیرت سے عدی کی طرف دیکھنے لگے تھے۔ عدی نے
بروں کو اپنے دونوں بازوؤں کے گرد لپیٹ کر اپنے بازوؤں کو سمیٹا اور جسم کو دوہرا
ے اس نے زور لگایا۔ تھوڑی دیر تک وہ زور آزمائی کرتا رہا اس کا جسم پسینے پسینے
یا تھا پھر ایک تیز چھناکے کے ساتھ زنجیریں ٹوٹ گئی تھیں۔

دونوں پہریدار زنجیروں کے ٹوٹنے کی آوازوں پر بھاگتے ہوئے کمرے میں
ل ہوئے۔ ان کے ہاتھوں میں ننگی تلواریں تھیں جو انہوں نے اپنے سامنے سونت
تھیں۔ جونہی وہ کمرے میں داخل ہوئے عدی نے بڑی تیزی سے ان پر ہاتھ
پکڑی ہوئی زنجیر برسا کر دونوں کو ہلاک کر دیا۔ زنجیر اس نے پھینک دی اور
پہریدار کی تلوار اٹھا کر وہ کمرے سے باہر آیا۔ قصیر اور رقاش بھی اس کے ساتھ تھے۔

تینوں بھاگتے ہوئے اس جگہ آئے جہاں عدی کا اونٹ کھڑا تھا۔ اونٹ کو
نے کی بجائے عدی نے چھلانگ لگائی اور کجاوے کا ہتھ پکڑ کر اس نے اپنے بدن کو
ا اور کجاوے کے اندر بیٹھ گیا۔

رقاش نے روتی ہوئی آواز میں کہا۔

"شہر میں سے بڑی احتیاط سے گزرنا مجھے امید ہے میں چند دنوں تک جذیمہ
ں بات پر آمادہ کر لوں گی کہ وہ تم سے اپنے رویے کی معافی مانگ کر تمہیں واپس بلا
اگر وہ نہ مانا تو میں خود تمہارے پاس چلی آؤں گی اس کے بعد اگر جذیمہ نے تمہارے
پر حملہ کیا تو وہ اپنی بہن کی لاش سے گزرنے کے بعد عدی تک پہنچ سکے گا۔ اب تم
قت ضائع نہ کرو۔ اگر ادھر سے کوئی گزرا تو جذیمہ کو فوراً اطلاع ہو جائے گی۔ میں
ت پرست ہوں اور جانتی ہوں کہ تم ابراہیمؑ کے مذہب پر ایمان رکھتے ہو مگر اب
میں تمہاری بیوی ہوں اس لیے میں ابراہیمؑ کے رب سے تمہاری سلامتی کی دعا
ارہوں گی"۔

رقاش نے اپنی وہ عبا جس پر قرمزی اور سنہری تاروں کا کام تھا اتار کر عدی

کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

"یہ اُوپر لے لو اور اپنا چہرہ اس سے ڈھانپ لو۔"

عدی نے عبا لے کر اوڑھ لی۔ اونٹ کی نکیل کھینچ کر اسے ایڑ لگائی اور اُونٹ بلبلاتا ہُوا بھاگ کھڑا ہُوا۔

عدی بڑی رازداری کے ساتھ شہر سے نکل کر صحرا میں داخل ہو گیا۔ آسمان پر اب رات چھا گئی تھی۔ صحرا میں تیز طوفان چل رہا تھا اور فطرت کے حرب آزما اور خشمگین عناصر طوفانی شکل میں ایک دوسرے سے برسرِ پیکار تھے۔ قفس کی سی پُراسرار تاریکی میں تیز طوفان کی قہرمانیت کے سامنے سنسان اور ژولیدہ صحرا کراہ اُٹھا تھا۔

ہر طرف خاموشی کی لہریں بکھری ہوئی تھیں اور صحرائی جھاڑیوں کی سوندھی سوندھی اور کریناک خوشبو محسوس کی جا سکتی تھی۔ چاروں طرف اُڑتی ہوئی ریت دکھائی دے رہی تھی بالکل یوں گویا وہ صحرا کی ریت نہیں انسانی نسلوں کی اُڑتی ہوئی خاک ہو۔

صحرا میں الوہیت کے اس طوفانی منظر میں عدی کا اُونٹ کسی تیز رفتار ستارے کی مانند بھاگا جا رہا تھا۔ عدی اُونٹ کی رہبری نہ کر رہا تھا اس نے اس کی نکیل ڈھیلی کر رکھی تھی اِس لیے کہ صحرا میں سفر کرنے والا اُونٹ جانتا ہے کہ اِس کی منزل کس طرف ہے تاہم وہ اسے مہمیز پہ مہمیز لگائے جا رہا تھا۔

عدی جب صحرا کا کافی حصّہ عبور کر چکا اور فضائے بعید کے قہقہوں کے اندر شفق کے پیچھے سے چاند نمودار ہو چکا۔ تو اس نے دیکھا کہ صحرا کے اندر بالکل اس کے سامنے تین شتر سوار نمودار ہوئے انہوں نے اپنے چہرے ڈھانپ رکھے تھے اور طوفانی ریت سے بچنے کی خاطر انہوں نے اونٹوں کے مُنہ پر ڈھالے چڑھا رکھے تھے جب وہ عدی کے قریب آئے تو اِن میں سے ایک نے زور سے چلّاتے ہوئے پوچھا۔

"اے شخص! تم کون ہو؟"

عدی نے احتیاط سے کام لیتے ہوئے کہا۔

"تم کون ہو؟"

"ہمارا تعلق بنو ایاد سے ہے۔"

عدی نے چلّا کر کہا۔

"میں بنو ایاد کا عدی بن نصر ہوں"

انہوں نے اپنے اونٹ عدی کے قریب لا کر عدی سے مصافحہ کیا پھر ان میں ایک جوان جو خوب قوی ہیکل تھا عدی سے مخاطب ہُوا۔

"ہم تمہارے لیے دو قسم کی خبریں لائے ہیں۔ ایک خوشخبری دوسری بدبختی اور ژولیدگی کی اطلاع۔ کہو پہلے کون سی خبر سُننا پسند کرو گے۔ ہم تم سے ملنے بنو ازد جا رہے تھے اچھا ہُوا تم راستے میں مِل گئے ہو۔"

عدی نے سنجیدہ ہو کر کہا۔

"پہلے خوشخبری کہو۔"

وہ جوان پھر بولا۔

"کیا تم کسی خانہ بدوش لڑکی سے محبت کرتے تھے جس کا نام ربیعہ ہے۔"

عدی چونک پڑا۔ "ہاں۔ کیا وہ زندہ ہے۔"

"ہاں، وہ زندہ ہے اور اس کا قبیلہ ہمارے نخلستانوں کے اندر خیمہ زن ہے اور وہ بڑی بے تابی سے تمہارا انتظار کر رہی ہے۔"

عدی پھول کی طرح خوشی سے کِھل اٹھا۔

"کیا وہ زندہ ہے اور اس کے قتل ہونے کی خبر ایک دھوکہ تھی۔"

"ہاں وہ زندہ ہے اور دن رات تمہیں یاد کرتی ہے۔"

عدی دوبارہ سنجیدہ ہو گیا۔

"اب وہ ژولیدہ خبر کہو۔"

اس جوان کا سر جھک گیا اور سسکتے ہوئے اس نے کہا۔

"تمہارا بوڑھا باپ اور قبیلے کا سردار تمہاری جدائی برداشت نہیں کر سکا اور مر گیا ہے۔"

عدی پر اس خبر سے سکتہ طاری ہوگیا۔ وہ کچھ نہ کہہ سکا۔ اس کے چہرے پر صدیوں کی تاریک اور گہری اُداسیاں بکھر گئی تھیں، اس کی حالت بجھے ہوئے شعلے جیسی ہوگئی تھی اور وہ چُپ سادھے اپنے اِن تین ساتھیوں کے ساتھ پہلے کی طرح اپنے قبیلے کی طرف سفر کرنے لگا۔

تینوں اپنے اونٹوں کو تیزی سے ہانک کر صحرا کے اندر سفر کرتے ہوئے جب اپنے قبیلے سے چند میل کے فاصلے پر رہ گئے تو صحرا کی سفید ریت سے چاندی کی طرح چمکتی ہوئی چاندنی میں اُنہوں نے دیکھا۔ بیس سے بھی زائد سوار ان کا راستہ روکے کھڑے تھے۔ اِن کے قریب جا کر رعد کی طرح گرجتی ہوئی آواز میں عدی نے پوچھا۔

"تم کون ہو؟"

ان میں سے ایک نے اپنے اونٹ کو چند قدم آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

"ہم ملکہ الزباء کے آدمی ہیں اور تمہیں لینے آئے ہیں۔"

عدی بُری طرح گرجا ——— "کیوں؟"

"تم جانتے ہو الزباء تم سے محبت کرتی ہے۔ تم نے جذیمہ کی بہن رقاش سے شادی کرکے اس کی آرزوؤں کو پامال کیا ہے۔ جب کہ تم جانتے ہو جذیمہ ہمارے قبیلے کا ازلی دشمن ہے۔ الزباء کا حکم ہے کہ تمہیں پکڑ کر اس کے سامنے پیش کیا جائے۔ ہم کئی روز سے تمہارے قبیلے کے نخلستانوں کے گرد منڈلا رہے ہیں کیونکہ ہمیں اُمید تھی کہ تم اپنے باپ کی موت کا ذکر سُن کر ضرور آؤ گے اور ہم راستے ہی سے تمہیں الزباء کے پاس لے جانا چاہتے ہیں۔"

عدی نے اور زیادہ خونخواری سے پوچھا۔

"اگر مَیں نہ جاؤں؟"

پھر اسی جوان نے جواب دیا۔ "الزباء کا حکم ہے کہ اگر تم انکار کرو تو تمہارا سر کاٹ کر اس کے سامنے پہنچا دیا جائے۔"

عدی نے اپنی تلوار کھینچ لی۔ "مَیں الزباء کے پاس جانے سے انکار کرتا ہوں سنو! الزباء صحرا کی ایک خاردار جھاڑی ہے اور مَیں اس کے ساتھ رہنے پر بھیڑیوں اور لومڑیوں کے غاروں میں رہنے کو ترجیح دیتا ہوں۔"

ان سب نے بھی اپنی تلواریں نکال لیں اور عدی کے گرد گھیرا تنگ کرنے لگے عدی کے ساتھی ابھی تک شش و پنج میں کھڑے تھے کیونکہ ملکہ الزباء کے آدمی ان سے کوئی تعرض نہ کر رہے تھے قبل اس کے وہ دونوں کوئی فیصلہ کرتے ایک ساتھ کئی تلواریں اُونٹ پر بیٹھے ہوئے عدی پر برس گئیں۔

عدی کا اونٹ زور زور سے بلبلاتا ہوا۔ ایک گول چکر کی صورت میں گھومنے لگا تھا اور یوں عدی ان سب حملہ آوروں کا مقابلہ کرنے لگا تھا جو اُسے گھیرے ہوئے تھے وہ اپنی تلوار کے ساتھ غراتا ہوا جس طرف بھی حملہ کرتا اپنے سامنے آنے والے کو خون میں نہلا کر نکل جاتا تھا۔ اس کی حالت اس بھیڑیے کی تھی جسے بے شمار لومڑیوں کے بھٹ میں بند کر دیا گیا ہو۔

لیکن الزباء کے آدمیوں کی تعداد زیادہ تھی۔ عدی ان کے سامنے زیادہ دیر تک نہ ٹھہر سکا۔ الزباء کے آدمی اس کے گرد اپنا گھیرا تنگ کر چکے تھے اور پھر ایک ساتھ کئی تلواریں اس پر برسنے لگیں۔ وہ زخموں سے چُور ہوگیا۔ اس کا پورا بدن لہولہان ہو چکا تھا پھر اس کے ہاتھ سے تلوار چھوٹ گئی اور وہ اپنے اُونٹ سے صحرا کی ریت پر گر گیا۔

آدھی رات کے آسمان پر تابندہ ستارے جھلملا رہے تھے۔ تیز طوفانی ہوائیں رندوں کی طرح دھاڑ رہی تھیں۔ آسمان کی بنات النعش زمین کی طرف جھک کر صحرا کے اندر فطرت کے جنگجو اور حرب آشنا عناصر کو ایک دوسرے پر ضربیں لگاتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔

خانہ بدوشوں کا قبیلہ بنو ایاد کے ایک نخلستان میں خیمہ زن تھا جو عدی کے گھر سے قریب تھا۔ خیموں کے باہر وہی پہلے کی طرح الاؤ روشن تھا۔ پتھر کی طرح سخت چہرے اور بھوری آنکھوں والا مغنی طنبورہ بجاتے ہوئے گا رہا تھا اور حسین ربیعہ اس

کے سامنے رقص کر رہی تھی۔ پہلے وہ سردار کے کہنے پر رقص کیا کرتی تھی لیکن آج وہ جانتی تھی کہ عدی آنے والا ہے لہٰذا وہ اپنے منسوب اور اپنے حبیب کے انتظار کی خوشی میں رقص کر رہی تھی۔

مغنّی گا رہا تھا۔

ہماری نوائیں گرم صحرا کا گیت ہیں۔

سورج جب آب و تاب سے فروزاں ہوتا ہے۔

ہم تندرست جسم واحد کی طرح صحرا کا سینہ چیرتے سفر کرتے ہیں۔

ربیعہ آج اعضائے بدن کا وجد آفریں رقص کر رہی تھی بالکل یوں جیسے کوزہ گر اپنی پوری قوت اور جوش ولولہ کے ساتھ چاک کو چکر دیتا ہے۔ ربیعہ کے ہونٹوں پر چلبلاہٹ مسکراہٹ اور گھلاوٹ تھی۔ وہ عدی کے نخلستانوں میں پہنچ کر اس کا انتظار جو کر رہی تھی۔

عدی جو اس کا محبوب تھا

جو اس کے دل کی وادیوں کا حکمران تھا۔

بنو ایاد کے نخلستانوں میں آ کر وہ محسوس کر رہی تھی گویا وقت کی ڈھول چھٹ گئی ہو اور فاصلوں کی زنجیریں ٹوٹ چکی ہوں۔ رقص جاری تھا اور جلتے ہوئے الاؤ کے شعلے بلند سے بلند تر ہوتے جا رہے تھے۔ الاؤ کے گرد بیٹھے ہوئے خانہ بدوش اور بنو ایاد کے لوگ مغنّی کی آواز، ربیعہ کے رقص اور طنبورے کی فریاد کرتی ہوئی صداؤں سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ ان میں عدی کا دوسرا ماموں بھی تھا جو عدی کے باپ کی موت پر اب بنو ایاد کا سردار تھا۔ اچانک صحرا کے اندر چند شتر سوار نمودار ہوئے۔ وہ آگ کے جلتے ہوئے الاؤ کے قریب آئے اور ان میں سے ایک نے اونٹ کے کجاوے پر بیٹھے بیٹھے ہی بھیڑیوں کی طرح دھاڑتی اور چنگھاڑتی ہوئی آواز میں کہا۔

"بند کر دو یہ گانا اور رقص۔"

مغنی نے گانا بند کر دیا اور طنبورے پر اس کے ہاتھ ساکت ہو گئے۔ ربیعہ نے بھی رقص بند کر دیا اور الاؤ کے قریب کھڑی ہو گئی۔ اتنی دیر تک نووارد شتر سوار اونٹوں

سے اُتر پڑے تھے۔ عدی کا ماموں اور بنو ایاد کا سردار ان جوانوں کی طرف بڑھا اور ان میں سے ایک جو خوب قوی ہیکل تھا مخاطب کر کے پوچھا۔

"تم تینوں عدی کو لینے گئے تھے، واپس کیوں لوٹ آئے ہو؟"

وہ جوان آگے بڑھا اور سر جھکاتے ہوئے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

"سردار! ہم عدی کی لاش لائے ہیں جو پچھلے اونٹ پر رکھی ہے۔ اس کے دشمنوں نے اسے قتل کر دیا ہے۔"

ربیعہ دیوانہ وار اس اونٹ کی طرف بھاگی جس پر عدی کی لاش رکھی تھی۔ سردار کی گھٹی گھٹی سی آواز سنائی دی۔

"عدی قتل ہو گیا، کیسے، کس نے اسے قتل کیا؟"

"ملکہ الزباء کے آدمیوں نے۔ ہم اپنے قبیلے کی طرف آ رہے تھے کہ انہوں نے ہماری راہ روک لی اور عدی کو زبردستی ساتھ لے جانا چاہا۔ عدی نے انکار کر دیا اور انہوں نے اس پر حملہ کر کے اسے قتل کر دیا۔ وہ ہمیں بھی مار ڈالتے لیکن صحرا میں اس وقت گھنٹیاں بجنے کی آواز آئی اور ہم نے شور کر کے مدد کے لیے پکارا۔ وہ کوئی تجارتی کارواں تھا۔ جب اس کارواں کے لوگ ہماری مدد کو آئے تو الزباء کے آدمی عدی کو قتل کر کے بھاگ گئے۔"

سردار نے آگے بڑھ کر اس بار خوفناک لہجے میں پوچھا۔

"میرے بھانجے کو قتل کرنے والے کتنے تھے؟"

"بیس سے زائد تھے۔"

"کیا عدی نے ان کا مقابلہ کیا تھا؟"

"ہاں" عدی نے شیر کی طرح ان کا مقابلہ کیا تھا لیکن ان کی تعداد زیادہ تھی لہٰذا عدی کو وہ ختم کرنے میں کامیاب ہو گئے۔"

سردار اس بار ایسی آواز میں بولا جس میں تمدد، کھچاؤ، سرکشی اور بغاوت کے انداز نمایاں تھے۔

"جاؤ! قبیلے کے بہترین جنگجو جوانوں کو اپنے ساتھ لے جاؤ۔ عدی کے قاتلوں

کا تعاقب کرو اور انہیں قتل کر کے برسوں کے پیاسے اس صحرا کی پیاس ان کے خون سے بجھا دو"۔ وہ تینوں شتر سوار قبیلے کے مکانوں کی طرف بڑھ گئے۔

سردار اس اونٹ کے پاس آیا جو ایک کھجور کے نیچے بیٹھا ہوا تھا اور جس پر عدی کی لاش رکھی تھی۔ اس نے دیکھا ربیعہ عدی کے پاؤں پر سر رکھے رو رہی تھی۔ جب سردار وہاں پہنچا تو ربیعہ پیچھے ہٹ کر کھڑی ہو گئی پھر یکایک اس میں ایک خوفناک تبدیلی ہوئی اس کی نگاہیں منجمد ہو گئیں اور ہونٹ جیسے پتھرا سے گئے تھے۔ اس کے چہرے پر یاس، غم اور شقاوت کا پرتو بکھر گیا تھا۔ اس کی حالت اس ہرنی جیسی تھی جو خوفناک بھیڑیوں کا شکار ہوتے ہوتے بچ نکلی ہو۔

سردار شدید غم، نا امیدی اور اتھاہ یاس کی حالت میں عدی کی لاش سے لپٹ کر آہ زاری کرنے لگا۔ اچانک وہاں کھڑی ربیعہ نے اپنے بال نوچنے اور قہقہے لگانا شروع کر دیئے ..... وہ پاگل ہو گئی تھی۔

صحرا میں مقدس خیابانوں جیسی خاموشی بکھر گئی تھی۔ جیسے چاندنی رات میں روحوں کے اسرار کا رقص شروع ہو گیا تھا۔ الاؤ کی آگ بڑی تیزی سے بجھتی جا رہی تھی اور ربیعہ کے کربناک اور مجنونانہ قہقہے تواتر کے ساتھ بلند ہو رہے تھے جیسے کسی دیوانے نے مضراب پہن کر طنبورے پر ہاتھ مار دیا ہو۔

نخلستان کے چشمے کی ایک کھجور تلے عدی کو دفن کر دیا گیا۔ دوسرے روز بنو ایاد کے جوان الزباء کے ان جوانوں کو قتل کر کے لوٹ آئے جنہوں نے عدی کو قتل کیا تھا۔ خانہ بدوش قبیلے نے بنو ایاد کے اندر مستقل رہائش اختیار کر لی تھی اور بچاری پاگل ربیعہ ہر وقت عدی کی قبر کے گرد طواف کرتی رہتی تھی۔ وہ گندم کے کھوکھلے خوشے جیسی ہو گئی تھی۔ اس کی حالت اس سیپ کی طرح تھی جس سے اس کا موتی چھین لیا گیا ہو۔

رقاش نے مسلسل کوشش کر کے اپنے بھائی جذیمہ کو آمادہ کر لیا تھا کہ عدی کو واپس بلایا جائے۔ جذیمہ اپنے رویے پر نادم ہوا اور اس نے ایک بار پھر اپنے وزیر قصیر

کو بنو ایاد میں بھیجا کہ عدی کو لے آئے لیکن قصیر عدی کے بجائے اس کی موت کی خبر لے کر پہنچا۔ رقاش نے اپنا سینہ پیٹ لیا اور بال نوچ ڈالے۔ جذیمہ کو بھی عدی کی موت سے دھچکا سا لگا اور اس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ الزباء سے عدی کے قتل کا انتقام ضرور لے گا۔

اسے ایک اتفاق کہئے قدرت کو ہی یہ منظور تھی کہ صحرا کے اندر جنم لینے والی اس قدیم داستان کا کوئی انجام ہو۔ رقاش اپنی شادی کی پہلی رات ہی عدی سے حاملہ ہو گئی اور پھر اس کے ہاں ایک بچے نے جنم لیا جس کی شکل بالکل عدی سے ملتی تھی۔ رقاش نے اس کا نام عمرو رکھا۔ رقاش نے پورے قبیلے میں یہ اعلان کروا دیا تھا کہ عمرو کو یہ نہ بتایا جائے کہ اس کا باپ کون تھا اور اس کا انجام کیا ہوا۔

جذیمہ کسی مناسب موقع کی تلاش میں تھا کہ الزباء سے انتقام لے لیکن وہ ایسا نہ کر سکا کیونکہ الزباء نے اپنی طاقت خوب بڑھا لی تھی اور پھر اپنے قبیلے کے گرد صحرا کے ایک وسیع حصے میں اس نے اپنے لڑاکا چھاپہ مار دستے پھیلا دیئے جو اس انداز میں حملہ آور ہوتے جس طرح شہد کی مکھیاں اپنے شکار کا تعاقب کرتی ہیں اور یہ چھاپہ مار جنگی مہارت میں ایسے تھے کہ کسی کو بھی اپنے قبیلے کی طرف بڑھنے نہ دیتے تھے۔

عدی جو زنجیریں توڑ کر بھاگا تھا۔ رقاش نے ان کی مرمت کرا دی تھی اور ٹوٹی ہوئی کڑیوں کی جگہ اس نے نئی اور مضبوط کڑیاں ڈلوا دی تھیں۔ عمرو بن عدی جب بڑا ہوا اور اس نے اپنی ماں سے اپنے باپ کے متعلق پوچھا۔

رقاش نے پہلے عمرو کو سر سے پاؤں تک دیکھا جو اب اٹھارہ برس کا ہو چکا تھا۔ پھر اس نے کچھ سوچا اور قدرے مسکرا کر کہا۔

"تمہارے ماموں کے محل میں ایک ایسا کمرہ ہے جس کی دائیں بائیں طرف کی دیواروں میں لوہے کی بھاری اور مضبوط زنجیریں لگی ہوئی ہیں۔ جس روز ان دونوں زنجیروں کو تم اپنے دونوں بازوؤں کے گرد لپیٹ کر توڑ دو گے اس روز میں تمہیں بتاؤں گی کہ تمہارا باپ کون تھا اور کس نے اسے قتل کیا تھا۔

عمرو نے اپنی گردن جھکاتے ہوئے ٹوٹتی ہوئی آواز میں کہا۔

"کیا میرے باپ کو کسی نے قتل کیا تھا ؟"

روتے ہوئے لہجے میں رقاش نے جواب دیا۔

"ہاں تمہارے باپ کو اس کے دشمنوں نے ہلاک کیا تھا اور محل کے کمرے میں جو زنجیریں ہیں انہیں تمہارے باپ نے ایک ہی جھٹکے میں توڑ دیا تھا۔ وہ بہادر جفاکش اور طاقت ور ترین انسان تھا۔ صحرا کے اندر خانہ بدوش قبائل اور نخلستانوں کے رہنے والے آج بھی اس کی شجاعت کی داستانیں اپنے بچوں کو سناتے ہیں لیکن افسوس دشت کا وہ شیر ہم دونوں کو تنہا چھوڑ کر ہمیشہ کے لیے ہم سے منہ موڑ چکا ہے۔ اس کے حقیر دشمنوں نے اسے صحرا کے اندر گھیر کر قتل کر دیا تھا جب کہ وہ اکیلا تھا اور دشمن بیس سے بھی زیادہ تھے۔"

عمرو نے بڑے مغموم لہجے میں کہا۔

"آہ ماں! تم نے مجھے پہلے کیوں نہ بتایا کہ میرے باپ کو قتل کیا گیا تھا۔ بتاؤ کون ہے میرے باپ کا قاتل۔ مجھے اپنے باپ کی شجاعت اور طاقت کی قسم میں اس کے قاتلوں سے ضرور انتقام لوں گا۔ میں ان پر واضح کر دوں گا کہ میں اپنے باپ کا انتقام لینے کی جرأت اور ہمت رکھتا ہوں۔ کہو ماں، وہ کون ہیں۔ اب دیر نہ کرنا۔ تمہیں میرے خون......"

رقاش نے عمرو کے منہ پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

"ایسی کوئی قسم نہ کھانا۔ جب تک تم ان دونوں زنجیروں کو توڑنے میں کامیاب نہیں ہوتے میں تمہیں کچھ نہ کہوں گی جس روز تم نے ان زنجیروں کو توڑ لیا مجھے یقین ہو جائیگا کہ تم اپنے باپ کی طرح طاقت ور ہو گئے ہو اس روز میں تم سے سب کچھ کہہ دوں گی۔"

عمرو بن عدی نے چھاتی نکالتے ہوئے کہا۔

"آؤ ماں! مجھے وہ کمرہ دکھاؤ جس کے اندر وہ زنجیریں ہیں جنہیں تم نے میرے پاؤں سے باندھ دیا ہے۔"

رقاش ایک طرف چل دی۔ "آؤ میرے ساتھ۔"

عمرو کو ساتھ لے کر رقاش اس کمرے میں آئی جس میں زنجیریں تھیں۔ پھر اس نے

ہے کی ان موٹی اور مضبوط زنجیروں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"یہ ہیں وہ زنجیریں جنہیں تمہارے باپ نے صرف ایک ہی جھٹکے میں توڑ دیا تھا اب تم انہیں اپنے باپ اور اس کے قاتلوں کے درمیان ایک رکاوٹ سمجھ کر توڑ دو۔"

عمرو آگے بڑھا۔ دونوں زنجیروں کو اس نے اپنے دائیں بائیں بازو کے گرد لپیٹا اور زور آزمائی کرنے لگا۔ رقاش اس کے سامنے کھڑی بڑے شوق سے اسے زور لگاتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔ عمرو کافی دیر تک زور آزمائی کرتا رہا، اس کا بدن پسینہ پسینہ ہو گیا تھا۔ پر ان زنجیروں کو وہ توڑ نہ سکا تھا۔ اس نے اپنے بازوؤں سے زنجیروں کے بل کھول کر بڑی مایوسی کے ساتھ رقاش سے کہا۔

"ماں! اگر میں ان زنجیروں کو توڑ نہ سکا تب ؟"

رقاش نے بڑی مایوسی سے کہا۔

"پھر تمہارے باپ کا راز راز ہی رہ جائے گا اور میں یہ سمجھ کر خاموش ہو جاؤں گی کہ میں نے جس بیٹے کو جنم دیا ہے وہ اس قابل نہیں کہ اپنے باپ کے قاتلوں سے اس کے خون کا انتقام لے سکے۔"

ان الفاظ سے عمرو کے جسم میں آگ لگ گئی تھی۔ اپنی ماں کے کندھوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے اس نے گھمبیر آواز میں بڑے ٹھہراؤ اور پختہ آواز میں کہا۔

"ماں! میں اگر اس باپ کا بیٹا ہوں جس کی شجاعت اور جوانمردی کی داستانیں لوگ خوشی سے ایک دوسرے کو سناتے ہیں تو پھر مجھ پر اعتماد اور یقین رکھو۔ میں ان زنجیروں کو اپنے مقدر کی ایک دیوار نہ بننے دوں گا۔ میں انہیں ایک روز اسی طرح توڑ کر نکل جاؤں گا جس طرح ایک ہی جھٹکے میں میرے باپ نے انہیں توڑا تھا۔ میں اب ہر سال ان زنجیروں سے زور آزمائی کرتا رہوں گا اور پھر ایک سال ایسا ضرور آئے گا کہ یہ زنجیریں اس کمرے میں ٹوٹی ہوئی پڑی ہوں گی اور میری شجاعت کی کہانیاں میرے عظیم باپ کی طرح ان صحراؤں کا موضوع سخن بن جائیں گی۔"

رقاش کے ہونٹوں پر مسکراہٹ بکھر گئی۔

وہ دِن میری زندگی کا مقدّس اور عظیم ترین دن ہوگا۔
عمرو نے رقاش کے شانے تھپتھپائے۔
"پھر بے فکر ہو جاؤ ماں! ایک روز یہ زنجیریں ٹوٹ جائیں گی۔"
"مَیں ابراہیمؑ کے رب سے ہر روز تمہاری کامیابی کی دُعا کرتی رہوں گی۔"
دونوں محل کے سکونتی حصّے کی طرف چلے گئے۔

ایک جنگ میں الزباء کے باپ کو جذیمہ نے قتل کر دیا تھا۔ الزباء اس حادثہ کو بھولی نہ تھی اور اندر ہی اندر وہ انتقام لینے کے متعلق سوچ رہی تھی۔ جذیمہ کے ساتھ کھلے میدان میں جنگ کرنے کے بجائے اس نے حیلے اور مکاری سے کام لیا۔ اس نے ایک نہایت تیز اور عیار شخص کو جو اس کے قبیلے سے تعلق رکھتا تھا سمجھا پڑھا کر ایک بڑی اور خوفناک سازش کے تحت جذیمہ کے پاس روانہ کیا۔ اس شخص نے جذیمہ کے پاس جا کر پہلے الزباء کے حُسن اور خوبصورتی کی تعریف کی پھر وہ الزباء کی اچھی عادات و صفات گِننے لگا۔ جذیمہ نے اس شخص سے پوچھا۔
"تم کس لیے میرے سامنے الزباء کی تعریف کرتے ہو؟"
اس عیار نے کہا۔
"مَیں چاہتا ہوں آپ الزباء سے شادی کر لیں۔ اس طرح دونوں قبیلوں کے درمیان پُرانی چپقلش اور رنجش جاتی رہے گی اور صحرا میں ہر طرف امن اور سکون برس جائے گا۔"
جذیمہ نے سر جھکا لیا اور کافی دیر تک سوچتا رہا۔ الزباء کے اس جاسوس نے تعجب کا اظہار کرتے ہوئے پوچھا۔
"کیا آپ اس شادی سے انکار کرتے ہیں؟"

جذیمہ نے ایک جھٹکے سے اپنا سر اس طرح اُوپر اُٹھایا جیسے وہ کوئی آخری فیصلہ کرنے میں کامیاب ہو گیا ہو پھر اس نے مُسکراتے ہوئے کہا۔
"جاؤ اور الزباء کو میری طرف سے شادی کا پیغام دو۔"
الزباء کا آدمی اُٹھ کر باہر نکل گیا اور اسی روز وہ اپنے قبیلے کی طرف روانہ ہو گیا تھا
اس کے وقت جذیمہ نے اپنے وزیر قصیر، بہن رقاش اور بھانجے عمرو بن عدی کو جمع کیا اور ان کے سامنے الزباء سے شادی کرنے کا مسئلہ پیش کیا۔ قصیر اور رقاش نے اس شادی کی سخت مخالفت کی کیونکہ وہ جانتے تھے الزباء اس کے بہادر اور شیر دِل باپ کی قاتل ہے۔ رقاش نے بڑے سخت لہجے میں اپنے بھائی جذیمہ سے کہا۔
"الزباء شادی کر کے یقیناً دھوکہ دے گی۔"
جذیمہ نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔
"ایسا نہیں ہو سکتا۔ اس کے دھوکہ دینے سے قبل ہی مَیں اسے ٹھکانے لگا دوں گا۔ مَیں نے صرف اس سے نمٹنے کے لیے ہی اس سے شادی کی پیش کش قبول کی ہے۔ ایک روز تم دیکھو گی صحراؤں کی یہ حسین ساحرہ میرے سامنے بے بس و مجبور ہو گی۔ یہ بھی جان لو مَیں اسے زنجیروں میں جکڑ کر تمہارے سامنے پیش کر دوں گا پھر تم جس طرح چاہو اس سے انتقام لے سکو گی۔"

رقاش خاموش ہی رہی تاہم جذیمہ کے وزیر قصیر نے اپنا خدشہ ظاہر کیا۔
"وہ بڑی مکار عورت ہے کہیں دھوکہ ہی نہ دے اور ہم شمال کے بربروں سے جنوب کے صحراؤں تک بدنام نہ ہو کر رہ جائیں۔"
جذیمہ نے قصیر کا شانہ تھپتھپاتے ہوئے کہا۔
"مَیں تمہیں اپنے ساتھ رکھوں گا اور ہر کام تمہارے مشورے سے کروں گا۔"
اس رات باتوں ہی باتوں میں جذیمہ نے اپنی بہن رقاش اور وزیر قصیر کو الزباء کی شادی کے لیے رضامند کر لیا تھا۔ چند ہی روز بعد ملکہ الزباء کی طرف سے وہی قاصد آیا جو جذیمہ کو پیغام دیا کہ الزباء آپ کو بُلاتی ہے۔ اس کی خواہش ہے شادی اس کے قبیلے

میں ہوں اس کے بعد آپ اسے جہاں رکھیں گے وہ وہیں رہے گی۔ رقاش نے جذیمہ کو بہت روکا کہ وہ الزباء کے پاس نہ جائے لیکن جذیمہ تو الزباء کے حسن سے متاثر تھا اور ہر حال میں اس سے شادی کرنا چاہتا تھا۔ لہٰذا وہ مخالفت کے باوجود اپنے وزیر قصیر کے ہمراہ اپنی فوج کے ایک معمولی سے حصے کے ساتھ الزباء کے قبیلے کی طرف کوچ کر گیا۔ اپنے بعد اس نے اپنے بھانجے اور رقاش کے بیٹے عمرو کو اپنے قبیلے کا حکمران مقرر کر دیا تھا۔

شام کے غمگین اندھیرے صحرا کے اندر بکھر کر گہرے ہو گئے تھے۔ آسمان سے زمین تک کی نیلگوں وسعتوں میں سماوی خوشبوئیں بکھر گئی تھیں۔ صحرا کے ویرانہ پسند پرندے بسرام کی خاطر اپنے اپنے ٹھکانوں کو اُڑے جا رہے تھے۔

صحرا میں جب ہر سمت قفس کی سی تاریکی پھیل چکی تھی، جذیمہ اور قصیر اپنے فوجی دستے کے ساتھ تیز رفتار ستاروں کی طرح صحرا کا سینہ چیرتے ہوئے الزباء کے قبیلے کی طرف بڑھ رہے تھے۔ دریائے فرات کے کنارے آ کر طے شدہ لائحہ عمل کے تحت قصیر فوجی دستے کے ساتھ دریا کے کنارے کے وسیع جنگل میں رُک گیا اور جذیمہ اکیلا الزباء کے محل کی طرف بڑھا تاہم اس کی خبر گیری کرنے کے لیے قصیر نے اس کے پیچھے اپنے چند جاسوس لگا دیئے تھے۔

جذیمہ الزباء کے محل میں داخل ہوا۔ الزباء کو اس کی آمد کی اطلاع ہو چکی تھی لہٰذا اس نے بڑی گرمجوشی سے جذیمہ کا استقبال کیا اور اسے اپنے ساتھ اپنی خواب گاہ میں لے گئی۔ مشعلوں کی تیز روشنی اور کمرے کے اندر اُڑتی ہوئی تیز صندلی خوشبوؤں میں جذیمہ نے پہلی بار غور سے الزباء کو دیکھا۔ الزباء اس وقت گو تیئس برس کی ہو چکی تھی لیکن اس کا حسن اب بھی آئینے کی طرح پُرسکون اور پُرکشش تھا۔ اس کے جسم کی سختی اپنی جگہ برقرار تھی اور اس کی آنکھیں اب بھی پھولوں کی طرح حسین تھیں۔

عدی سے محبت کے بعد اس نے شادی نہ کی تھی اور ابھی تک وہ برق کی طرح بے ثمر تھی۔ الزباء نے جذیمہ کو مخاطب کیا اور کمرے میں اس کی آواز بلند ہوئی۔ ایسی آواز گویا تیز ہواؤں کی آوازیں صحرا کی زخمی روح سے ارتباط کے بعد سنائی دی ہوں

"تو تم مجھ سے شادی کے لیے رضامند ہو؟" آواز اور لہجے میں ایک خفیف سا ارتعاش تھا جسے جذیمہ محسوس نہ کر سکا کہ وہ الزباء کے چمکدار حسن کے سامنے اپنے سارے حواس پر اپنی گرفت کھو چکا تھا۔ الزباء کے نقرئی طشتریوں کی طرح چمکتے حسن کے آگے جذیمہ کی ذہنی قوتیں مفلوج کر بیٹھا تھا۔ سحر زدہ سی آواز میں اس نے الزباء سے کہا۔

"یہ معاملہ میری اور تمہاری مرضی اور رفاقت سے ہی طے ہوا ہے۔"

الزباء یوں کڑک کر بولی گویا خطِ افق پر اچانک بجلی کوند گئی ہو۔

"کیا تم میرے باپ کے قاتل نہیں ہو؟"

جذیمہ کے چہرے پر اتھاہ غم اور شدید ناامیدی چمک گئی تھی پھر بھی اس نے اپنے آپ کو سنبھالتے ہوئے کہا۔

"یہ پرانی اور قدیم باتیں ہیں۔ میں انہیں بھول چکا ہوں۔ تم بھی بھول جاؤ۔ دونو مل کر اس صحرا میں ایک نئی زندگی کی ابتدا کریں۔ ایسی زندگی جس سے صحرا کے حصے میں امن و سکون پھیل جائے گا۔"

الزباء کی ایسی آواز سنائی دی جس طرح بھاری اور آہنی زنجیروں کے آپس میں ٹکرانے کے باعث سخت آوازیں پیدا ہوتی ہیں۔

"سنو جذیمہ! میں نے اپنی زندگی میں صرف ایک شخص سے محبت کی تھی اور وہ عدی تھا لیکن اس نے تمہاری بہن سے شادی کر کے میرے ساتھ بدعہدی کی اور جانتے ہو میں نے اس سے کیا سلوک کیا۔ میں نے اسے قتل کرا دیا اور اس کے جوان اور توانا جسم کا خون صحرا کی پیاسی ریت پی گئی۔"

جذیمہ نے حیرت سے پوچھا۔

"تو کیا تم نے میرے ساتھ بدعہدی کی ہے؟"

الزباء نے کڑک کر کہا۔ "ہاں مجھے تم سے نفرت ہے۔ تم میرے باپ کے قاتل ہو۔ اپنے باپ کے قاتل کو میں کس طرح معاف کر سکتی ہوں جب کہ وہ بے بسی کی حالت میں میرے سامنے پڑا ہے" اس کے ساتھ ہی الزباء نے تالی بجائی اور تین پہریدار اس

کی خواب گاہ میں داخل ہوئے۔ الزباء نے شاید انہیں پہلے ہی سب کچھ سمجھا رکھا تھا۔ انہوں نے اندر آتے ہی جذیمہ کو رسیوں میں جکڑ دیا۔ اپنی بے بسی دیکھ کر جذیمہ کا چہرا غصے میں تمتما اُٹھا اور اپنی بھاری کھولتی ہوئی آواز میں اس نے الزباء سے کہا۔

"تُو کمینی ذہنیت اور منتقمانہ مزاج کی عورت ہے۔ تُو اندر امین کا وہ پھل ہے جو دیکھنے میں حسین ترین پر کھانے میں کڑوا ہوتا ہے اور حلق کو پکڑ لیتا ہے۔ تم حنظل کی بیل ہو جو تربوز کی طرح خوب صورت انداز میں پھیلتی ضرور ہے پر کسی کام کی نہیں ہوتی لاریب تُو عورت نہیں رات بھر کا ایک پڑاؤ ہے جو کسی کو کوئی فائدہ نہیں پہنچاتا۔"

غصے میں الزباء کی آنکھیں شعلے برسا گئی تھیں۔

"مَیں تمہیں ویسی ہی بے بسی سے قتل کروں گی جس طرح تم نے میرے باپ کو قتل کیا تھا۔"

جذیمہ نے اس بار ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

"گو میری کوئی اولاد نہیں پر یاد رکھو میرے بعد میرا بھانجا تم سے میرے قتل کا بدلہ ضرور لے گا۔"

"جانتی ہو وہ کس کا بیٹا ہے۔ اسی عدی بن نصر کا جس سے تم محبت کرتی تھیں تم جانتی ہو عدی کیسا بہادر اور جوان مرد تھا۔ اس کا بیٹا بھی اسی جیسا ہے۔ جب وہ ان زنجیروں کو توڑ دے گا جو اس کا باپ توڑ کر بھاگا تھا اور اس کی ماں اسے یہ بتا دے گی کہ تم اس کے باپ کی قاتل ہو تو یاد رکھو وہ طوفان بن کر اُٹھے گا اور اپنے باپ کے ساتھ میرا انتقام بھی تم سے لے گا۔"

الزباء کے حکم پر پہریداروں نے جذیمہ کے جسم کی رگِ ہفتم کاٹ دی جس سے اس کے جسم کا سارا خون بہہ گیا۔ وہ الزباء کی خواب گاہ میں سسک سسک کر اور ایڑیاں رگڑ رگڑ کر بے بسی کی موت مر گیا۔

جذیمہ کے وزیر قصیر کو اس کے جاسوسوں نے جذیمہ کی موت کی اطلاع کر دی اور وہ کچھ سوچ کر اپنے فوجی دستے کے ساتھ بڑی تیزی سے اپنے قبیلے کی طرف کُوچ کر

قبیلے میں آ کر جب اس نے رقاش اور عمرو کو جذیمہ کے مرنے کی خبر دی تو رقاش نے سر پیٹ لیا۔ الزباء اب اس کے شوہر ہی کی نہیں بھائی کی بھی قاتل تھی۔ عمرو کی آنکھیں یوں تھی جیسے وہ اس جہاز کا ملاح ہو جو سمندر میں ڈوب رہا ہو پھر اس نے عمرو سے بڑی رازداری سے کہا۔

"میرے ذہن میں الزباء سے انتقام لینے کی ایک ترکیب ہے۔"

عمرو نے چونک کر پوچھا۔

"کیسی ترکیب؟"

"مَیں آج رات ہی یہاں سے الزباء کی طرف روانہ ہو جاؤں گا۔ اگلے روز جذیمہ کے قتل کا مورد مجھے ٹھہرائیں اور لوگوں سے کہیں کہ میری سستی کی وجہ سے جذیمہ مارا گیا۔ اس کے ساتھ ہی آپ میری گرفتاری پر انعام مقرر کر دیں۔ مَیں الزباء کے پاس جا کر کہوں گا کہ عمرو نے مجھ پر جذیمہ کے قتل کا الزام لگا کر مجھے قتل کرنا چاہا تھا لہٰذا مَیں تمہارے پاس بھاگ آیا ہوں۔ مَیں اسے یہ بھی کہوں گا کہ تم چونکہ جذیمہ کے خاندان کی دشمن ہو اور مَیں بھی اب چونکہ انہیں اپنا دشمن سمجھتا ہوں لہٰذا دونوں مل کر ان سے انتقام لیں۔ اگر اس نے مجھ پر اعتبار نہ کیا اور مجھے اپنے قبیلے میں رہنے کی اجازت نہ دی تو مَیں واپس آ جاؤں گا اور اگر اس نے مجھے اپنے ہاں قیام کی اجازت دیدی تو مَیں وہاں رہ کر پہلے الزباء کو اپنے مکمل اعتماد میں لوں گا اس کے بعد مَیں جاسوسوں کے ذریعے تم سے رابطہ قائم کروں گا اور اس طرح ہم اُس سے انتقام لینے کا لائحہ عمل مرتب کریں گے۔"

عمرو نے اس کی تجویز کو سراہتے ہوئے کہا۔ "تم آج رات ہی الزباء کی طرف روانہ ہو جاؤ اور اگر تم اپنے مقصد میں کامیاب رہے تو مَیں سمجھتا ہوں ایک روز مَیں الزباء سے اپنا خونین انتقام لوں گا۔"

عمرو بن عدی اُٹھ کر اندر گیا اور نقدی کی ایک تھیلی لا کر قصیر کی جھولی میں رکھتے ہوئے اس نے کہا۔ "یہ تھیلی اپنے پاس رکھ لو تمہارے کام آئے گی اور اسی رات کی تاریکی میں الزباء کی طرف کُوچ کر جاؤ۔ تمہاری غیر موجودگی میں تمہاری بیوی اور بچوں کو وہی

عزت اور وقار حاصل رہے گا جو انہیں اس وقت حاصل ہے۔ قصیر اُٹھ کر اپنے گھر چلا گیا۔

اسی رات قصیر نے اپنے قبیلے سے کوچ کیا اور الزباء کی طرف روانہ ہو گیا۔ عمرو بن عدی کو جب یقین ہو گیا کہ قصیر الزباء کے پاس پہنچ چکا ہوگا تو اس نے اس کی گرفتاری کے احکامات جاری کر دیے۔ دوسرے روز شام کے قریب قصیر الزباء کے قبیلے میں داخل ہوا۔ قبیلے کے صحرائی محافظ اسے پکڑ کر الزباء کے پاس لے گئے۔ جب اسے الزباء کے سامنے پیش کیا گیا تو کافی دیر تک وہ اسے غور سے دیکھتی رہی پھر تعجب سے کچھ پوچھنا چاہا تھا کہ قصیر نے بولنے میں پہل کی۔

"میں بنی قسطورا کی ملکہ کو سلام کرتا ہوں۔"

الزباء نے حیرت سے پوچھا۔

"بنو ازد کے وزیر کو بنی قسطورا میں آنے کی کیا ضرورت پیش آئی ہے۔ کیا تم اپنے آقا کی تلاش میں میرے قبیلے میں آئے ہو۔"

"نہیں۔ میں جانتا ہوں کہ اس کی رُوح سے جسم کا رشتہ ٹوٹ چکا ہے۔ اور وہ ایسی جگہ پہنچ چکا ہے جہاں کوئی بھی اس سے نہیں مل سکتا۔"

"پھر تم کیا چاہتے ہو؟"

کیا تم جانتی ہو جب جذیمہ شادی کی نیت سے تمہارے پاس آیا تھا تو میں اس کے ہمراہ تھا اور اس نے مجھے ایک فوجی دستے کے ساتھ فرات کے جنگلوں میں ٹھہرنے کا مشورہ دیا تھا اس احتیاط کے ساتھ کہ اگر اسے تمہارے قبیلے میں کوئی خطرہ ہو تو میں اس کی مدد کر سکوں لیکن جب تم نے اس کی رگِ ہفتم کاٹ کر اسے ختم کر دیا تو میں واپس چلا گیا۔ میں تمہارے ساتھ کسی صورت میں بھی الجھنا نہ چاہتا تھا۔ میری نگاہوں میں تم ان صحراؤں کا حسین گیت ہو اور میں نہیں چاہتا تھا کہ اس حسین صحرائی گیت کی تانیں اور دلکش صدائیں بکھر جائیں جس طرح پھول کی پتیاں بکھر جانے سے پھول پھول نہیں رہتا ویسے ہی گیت کی صدائیں بکھر جانے سے صحرا کا یہ گیت وہ حسین گیت نہ

رہتا۔ میں جب اس فوجی دستے کے ساتھ واپس اپنے قبیلے میں گیا تو عمرو بن عدی نے جو جذیمہ کا بھانجا اور اس وقت بنی قسطورا کا حکمران ہے اس نے جذیمہ کے قتل کا ذمہ دار مجھے ٹھہرایا۔"

میں ابھی اپنے گھر بھی نہ پہنچا تھا کہ اس ناعاقبت اندیش اور کندہ ناتراش انسان نے میری گرفتاری کے احکامات جاری کر دیئے لیکن بنی قسطورا کی فوج میں میرے بھی کچھ ہمنوا اور راز دار ہیں۔ میں ان کی مدد سے عمرو بن عدی کے ہاتھوں گرفتار ہونے سے بچ گیا اور پناہ کی خاطر تمہارے پاس چلا آیا۔

الزباء نے کچھ سوچتے ہوئے پوچھا۔

"اگر میں تمہیں پناہ دینے پر رضامند نہ ہوں تب؟"

"یہ سرزمین بڑی وسیع ہے، میں اپنا آپ بچانے کی خاطر کسی اور عرب خانہ بدوش قبیلے کا رُخ کر دوں گا۔ مجھے اُمید ہے وہ مجھے مایوس نہ کریں گے کیونکہ عمرو اپنے باپ کی طرح خونخوار انسان ہے اور جب تک میں کسی قبیلے میں پناہ نہیں لے لیتا اس کے ہمنوا مجھ سے انتقام لینے کی خاطر میرے پیچھے سائے کی طرح لگے رہیں گے۔"

الزباء نے افسردہ سے لہجے میں پوچھا۔

"کیا یہ حقیقت ہے اس عدی نے جس سے میں محبت کرتی تھی، رقاش سے شادی کر لی تھی اور بنو ازد کا موجودہ حکمران عمرو اس عدی کا بیٹا ہے؟"

باتوں باتوں میں الزباء کی تعریف کر کے قصیر الزباء کے دل میں اپنے لیے ہمدردی پیدا کرنے کی کوشش کر رہا تھا لہٰذا اس نے اپنی آواز کو خوب مصالحہ لگا کر بڑی دردمند اور غمگسارانہ آواز میں کہا۔

"جذیمہ نے عدی کو اپنے پاس بلایا تھا وہ اسے اپنی افواج کا سپہ سالار بنانا چاہتا تھا۔ اس نے صریحاً رقاش کے ساتھ شادی کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ وہ تم سے محبت کرتا تھا۔ بنی ازد کے بہت سے لوگوں کے سمجھانے اور اکسانے پر اس نے رقاش سے شادی کر لی تھی پر اس کے باوجود جذیمہ اور اس کے درمیان پھر

اختلافات پیدا ہوگئے اور نوبت یہاں تک پہنچ گئی تھی کہ جذیمہ نے اپنے صحرائی محل کے ایک کمرے میں عدی کو زنجیروں میں جکڑ دیا تھا پر وہ بہادر اور جواں مرد انسان ایک رات لوہے کی ان مضبوط اور بھاری زنجیروں کو توڑ کر بھاگ نکلا۔ وہ اپنے قبیلے کی طرف جا رہا تھا کہ راستے میں تمہارے آدمی صحرا کے اندر اس سے ٹکرا گئے اور اسے قتل کر دیا۔ ہو سکتا ہے وہ اپنے قبیلے سے ہو کر سیدھا تمہارے پاس ہی چلا آتا لیکن تمہارے آدمیوں نے اس سے کچھ پوچھے بغیر ہی اسے موت کی ابدی نیند سلا دیا اور اس کے ردِ عمل میں بنو ایاد کے سورماؤں نے تمہارے آدمیوں کو بھی قتل کر دیا۔ کاش اس وقت عدی بن نصر زندہ ہوتا تو میں اس کے پاس پناہ لیتا اور اس کے ساتھ مل کر میں جذیمہ سے ایسا انتقام لیتا کہ صدیوں تک اس انتقام کے نقوش ان صحراؤں میں دیکھے جا سکتے۔

قصیر کی باتوں پر الزباء اداس ہو گئی۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے اس کی آنکھیں نمناک ہوئیں اور آنسوؤں کے کئی ننھے ننھے قطرے اس کی حسین آنکھوں میں جھلملانے لگے تھے اپنی لمبی لمبی سُرخ مخروطی انگلیوں سے اپنے آنسو صاف کرتے ہوئے الزباء نے رندھی ہوئی آواز میں کہا۔

"آہ عدی! کاش تم جذیمہ کے پاس نہ گئے ہوتے۔ اپنے باپ سے مل کر سیدھا میرے پاس چلے آئے ہوتے تو میں تمہیں بنی قسطورا کا حاکم بنا دیتی اور خود ایک لونڈی بن کر تمہاری خدمت کرتی لیکن ——— لیکن جذیمہ اور اس کی بہن رقاش نے تمہیں مجھ سے چھین لیا۔ کاش تم زندہ ہوتے اور دیکھتے میں نے جذیمہ سے کیسا عبرت خیز انتقام لیا ہے"۔ الزباء بچوں کی طرح کھل کر رو دی تھی۔

لوہا گرم دیکھ کر قصیر نے بھرپور چوٹ لگائی۔

"تو کیا تم مجھے پناہ دینے کو تیار نہیں اور مجھے کسی اور عرب قبیلے کا رُخ کرنا پڑے گا"۔

الزباء نے فوراً سنبھل کر کہا۔

"تم نے صحیح فیصلہ کیا ہے۔ تم میرے قبیلے میں ہی رہو گے میں تمہیں پناہ

دیتی ہوں۔ تم جیسا انسان میرا بہترین مشیر ثابت ہو سکتا ہے۔ تمہارے مشوروں سے میں عمرو بن عدی کا مقابلہ بڑی آسانی سے کر سکوں گی۔ میرے قبیلے میں تمہاری حیثیت ایک معزز مہمان کی سی ہو گی"۔

الزباء پیچھے ہٹی اور پیتل کی چمکتی ہوئی ایک ایسی طشتری پر لکڑی کی ایک خوبصورت ہتھوڑی سے چوٹ لگائی جو ایک چوکھٹے میں لٹک رہی تھی۔

چند لمحوں بعد ایک پہریدار اندر آیا اور الزباء کے سامنے تعظیماً سر جھکا کر کھڑا ہو گیا۔ الزباء نے اُسے مخاطب کر کے کہا۔

"قصیر کو اپنے ساتھ لے جاؤ اور اسے ایسی رہائش مہیا کرو جو ایک وزیر کے لائق ہو۔ اس کی حیثیت ہمارے ہاں ایک ذی عزت مہمان کی ہو گی"۔

وہ پہریدار قصیر کو لے کر چلا گیا اور الزباء اپنے پلنگ کی طرف بڑھی اور اپنے نازک حسین جسم کو اس حریری بستر میں گرا سا دیا۔ عدی کی یاد نے اسے افسردہ و ملول جو کر دیا تھا۔

پورے ایک سال بعد رقاش اور عمرو ایک بار پھر اس کمرے کی طرف جا رہے تھے جس کے اندر دیواروں میں زنجیریں لگی ہوئی تھیں۔ دروازے کا زنگ آلود تالا کھولتے ہوئے عمرو نے رقاش سے کہا۔

"اے میری ماں! میرے لیے دعا کرو۔ آج میں اس امتحان کے کمرے سے سُرخرو ہو کر نکلوں اور اپنے باپ کے انتقام کی ابتداء کر سکوں"۔

اپنے دونوں ہاتھ آسمان کی طرف اُٹھاتے ہوئے رقاش نے بڑی رقت آمیز آواز میں کہا۔ "ابراہیم کا رب تیری مدد کرے گا"۔

عمرو نے دروازہ کھولا اور دونوں ماں بیٹا کمرے میں داخل ہوئے۔ رقاش سامنے کی دیوار سے ٹیک لگا کر کھڑی ہو گئی جب کہ عمرو اپنے بازوؤں سے وہ بھاری اور وزنی زنجیریں باندھنے لگا۔ آج اس پر قوت کا ایک نشہ سوار تھا۔ اس کے چہرے پہ تمتماہٹ تھی صبر آزما پابندی کی۔ زنجیروں میں جکڑے ہوئے اپنے دونوں ہاتھ اُوپر اُٹھاتے ہوئے عمرو نے بڑی عاجزی سے دُعا کی۔

"اے ابراہیمؑ کے رب! آج میری ماں میرے سامنے کھڑی ہے۔ اسے آج میری طرف سے مایوس نہ کرنا جس طرح تُو نے آدمؑ کی خطائیں معاف کیں۔ نوحؑ کو پانی کے ہولناک عذاب سے بچایا جس طرح تُو نے اپنے خلیلؑ کی آگ کو خیابان میں بدل دیا۔ آج میری مشکلوں کو بھی آسانی میں بدل دے۔ اے زمین و آسمان کے خالق اپنے اس آنے والے عظیم رسولؐ کے صدقے میں جس کے متعلق ہر آسمانی کتاب میں پیش گوئیاں کی گئی ہیں۔ اے میرے رب! اسی عرب کے چاند کے صدقے میں مجھے کامیاب کر۔"

دیوار کے ساتھ کھڑی رقاش عجیب سے انداز میں عمرو کی طرف دیکھ رہی تھی۔ وہ سنجیدہ اور خاموش تھی۔ شاید دل ہی دل میں بیٹے کی کامیابی کی دُعائیں مانگ رہی تھی۔ اس کے دیکھتے ہی دیکھتے عمرو نے اپنے بدن کو سکیڑا، بازو سیدھے کر کے اس نے زور لگایا پھر اس نے ایک زوردار وحشی نعرہ مارا اور اپنی پُوری قوت صَرف کی تو اس کے بازوؤں کے گرد لپٹی زنجیریں جن کا ایک ایک سرا دیوار میں لگا ہُوا تھا ایک چھناکے کے ساتھ ٹوٹ گئیں۔

عمرو نے اپنے بازوؤں کے گرد لپٹی ہوئی زنجیریں اتار کر پھینک دیں اور مسکراتے ہوئے اپنی ماں کی طرف دیکھنے لگا۔ رقاش کے چہرے پر خوشی کی اتھاہ گہرائیاں تھیں۔ وہ بھاگ کر آگے بڑھی اور عمرو کو اپنے ساتھ لپٹا کر اس کی پیشانی چُومنے لگی۔ اس کی آنکھوں میں تشکر کے آنسو تھے جنہیں اس نے پونچھ کر عمرو سے کہا۔

"آج تم نے ثابت کر دیا ہے کہ تم عدی بن نصر کے فرزند ہو اور اپنے باپ اور ماموں کے انتقام کو جو ایک ادھورا خواب بن گیا تھا مکمل کرنے ہمت رکھتے ہو۔ آج

میں تم سے وہ سارے راز کہہ دوں گی جو برسوں سے میں اپنے سینے میں چھپائے ہوئے ہوں اور یہ راز ایسے ہیں میرے بیٹے! جو میرے دل میں تپتے صحرا کی سی حدت پیدا کرتے رہے ہیں۔ ان سربستہ رازوں کو اُٹھائے اُٹھائے میں تھک گئی ہوں۔ آج میں اُنہیں وزنی بوجھ سمجھ کر اُتار پھینکوں گی۔"

عمرو نے رقاش کے کندھوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

"کہو ماں! کون بدبخت میرے باپ کا قاتل ہے؟"

رقاش کی آنکھوں میں دوبارہ آنسو ستاروں کی مانند جھلملانے لگے تھے۔ جی کڑا کر کے اس نے سخت آواز میں کہا۔

"بنی قسطورا کی نائلہ جو ملکہ الزباء کہلاتی ہے۔ سن میرے بیٹے! آج سے کئی برس قبل ایک طوفانی رات جب کہ تمہارا باپ اپنے قبیلے کی طرف جا رہا تھا تو صحرا کے اندر الزباء کے آدمیوں نے اسے قتل کر دیا۔ وہ اکیلا تھا اور دُشمن بیس سے بھی زائد تھے لیکن وہ شیر کی طرح ان کے سامنے جم کر لڑتا رہا تھا لیکن وہ اکیلا تھا اور قتل ہو گیا صحرا کے اس حصے میں ——" رقاش سسک سسک کر رو پڑی اور اپنی بات مکمل نہ کر سکی۔

اپنی ماں کی بے بسی دیکھ کر عمرو کی آنکھوں سے بھی آنسو بہہ نکلے تھے۔ اس نے لرزتی پر کھولتی ہوئی آواز میں پھر پوچھا۔

"میرے باپ کی قبر کہاں ہے؟"

رقاش بڑی مشکل سے اپنے آپ کو سنبھال کر بولی۔

"اس کا تعلق بنو ایاد سے تھا۔ صحراؤں اور نخلستانوں کے لوگ آج بھی اس کی بہادری اور شجاعت کی داستانیں ایک دوسرے سے کہتے ہیں۔ الزباء اس سے شادی کرنا چاہتی تھی لیکن تمہارے باپ نے انکار کر دیا۔ انتقاماً الزباء نے اسے قتل کرا دیا۔ سنو میرے بیٹے! اس صحرا کے اندر ایک اور لڑکی بھی تمہارے باپ سے محبت کرتی تھی۔ وہ کوئی خانہ بدوش رقاصہ تھی۔ میں نے اُسے دیکھا نہیں پر سُنا ہے کہ وہ پاگل ہو چکی ہے اور اب اپنے قبیلے کے ساتھ وہ مستقلاً تمہارے باپ کی قبر کے پاس آباد ہے۔"

اپنے آنسو خشک کرتے ہوئے عمرو نے چھاتی تان کر کہا۔

"مَیں الزباء سے ایسا انتقام لوں گا کہ صحراؤں اور نخلستانوں کے لوگ جان جائیں گے کہ عدی بن نصر کا بیٹا بزدل نہ تھا اور وہ اپنے باپ کا حساب چکانے کی جرأت رکھتا تھا۔"

"بتاؤ ماں! بنو ایاد میں میرے باپ کی کیا حیثیت تھی؟"

رقاش نے اپنی سیاہ قبا سے اپنے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔ "اس کا باپ بنو ایاد کا سردار تھا وہ مر چکا ہے اور اب اس کا ماموں اس قبیلے کا سردار ہے۔"

"کیا وہ مجھے پہچان جائے گا؟"

"ضرور! وہ اپنے بھانجے کے خون کو ضرور شناخت کر لے گا۔"

"تو پھر سنو میری ماں! مَیں آج ہی اپنے باپ کی قبر دیکھنے بنو ایاد کی طرف روانہ ہو جاؤں گا اور پھر ایک روز تم دیکھو گی مَیں اپنے انتقام کی ابتداء کیسے کرتا ہوں۔ عمرو نے ماں کا ہاتھ تھام لیا۔ آؤ میرے ساتھ دونوں اس کمرے سے باہر نکل گئے۔

وہ ایک تاریک، طوفانی اور سرد ترین رات تھی۔ عمرو اپنے گھوڑے پر سوار بنو ایاد کے قبیلے کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اس نے گھوڑے کے منہ پر ڈھاٹا چڑھا رکھا تھا اور اس کا سر زمین کے سینے کی طرف جھک گیا تھا۔ صحرا کے اندر خشک اور تیز جھکڑ چل رہے تھے۔ ریت کے بڑے بڑے گراؤنڈ ایک جگہ سے دوسری جگہ اُڑ کر صحرا کی شکست و ریخت کر کے ٹیلوں کی ہئیت بدلنے لگے تھے۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ رسیاں ٹوٹ گئی ہوں جن سے فطرت کے جنگجو عناصر بندھے ہوئے تھے اور آزاد ہوتے ہی وہ سوئی ہوئی انام پر برق پاش بن کر ٹوٹ پڑے ہوں۔

فضا کے اندر اُڑتے ریگ ذروں کی ایک چادر سی تن گئی تھی۔ کچھ اس طرح جیسے پورا صحرا آسمان کی طرف پرواز کرنا شروع ہو گیا ہو تاہم عمرو صحرا کے اس دل کو نظر انداز کر کے تیر کی طرح اپنی منزل کی طرف اُڑا جا رہا تھا۔

یک بارگی اسے احساس ہوا جیسے ریت کا طوفان تھم گیا ہو اور پوری کائنات

پرسکون ہو گئی ہو۔ اب اس کے سامنے بنو ایاد کے حسین نخلستان اور وسیع کھیتیاں تھیں۔ پھر جیسے وہ چونک پڑا گویا اس کے کانوں میں کسی نے پگھلی ہوئی چاندی ڈال دی ہو۔ کوئی آواز اس کے کانوں میں پڑی تھی۔ اپنے کان کے گرد ہاتھ جما کر اس نے بڑے غور سے کچھ سُننے کی کوشش کی۔ وہی آواز پھر اس کی سماعت سے ٹکرائی تھی۔

طنبورے کی دل پسند اور نغمگی سے بھرپور آواز جس میں سوز، پکار اور گھلاوٹ تھی عمرو نے گھوڑے کو ایڑ لگائی اور اسے آواز کی سمت سرپٹ دوڑا دیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ خیموں کے ایک شہر میں داخل ہو رہا تھا۔ یہ اسی خانہ بدوش قبیلے کے خیمے تھے جس کی لڑکی ربیعہ کبھی عمرو کے باپ عدی بن نصر سے محبت کرتی تھی اور اس قبیلے نے بنو ایاد کی سرزمین میں مستقلاً پڑاؤ کر لیا تھا۔

ربیعہ جو پاگل ہو چکی تھی اب ہر وقت عدی بن نصر کی قبر کے طواف کرتی رہتی تھی۔ عمرو خیموں کے بیچوں بیچ اپنا گھوڑا دوڑاتا ہوا بڑی تیزی سے اس سمت بڑھنے لگا جدھر سے آواز آ رہی تھی۔

پھر ایک جگہ عمرو رُک گیا۔ اس کے سامنے آگ کا ایک بہت بڑا الاؤ روشن تھا جس کے شعلے آسمان کی طرف بلند ہو رہے تھے اور بے شمار مرد عورتیں جو سب عرب تھے اس الاؤ کے گرد جمع تھے۔ الاؤ کے اِرد گِرد کا ماحول گرم اور پُرسکون ہو گیا تھا۔ عمرو نے دیکھا الاؤ کے قریب ہی ایک بوڑھا بیٹھا طنبورہ بجا رہا تھا۔ اس کے بال چاندی کی طرح سفید تھے اور آگ کے لپکتے شعلوں میں اس کا رنگ تانبے کی طرح چمک رہا تھا۔

یہ وہی طنبورہ بجانے والا تھا جس کے طنبورے کی آواز سُن کر کبھی دریائے فرات کے کنارے عمرو کے باپ عدی نے بھی اپنے گھوڑے کو روک لیا تھا۔ آگ کے پاس بیٹھ کر طنبورہ بجاتا ہوا وہ بوڑھا عجیب اور پُراسرار لگ رہا تھا۔

اس بوڑھے سے نگاہیں ہٹا کر عمرو کی نگاہیں اس حسین اور پری پیکر لڑکی پر جم گئیں جو طنبورے کی لے پر الاؤ کے گرد رقص کر رہی تھی۔ ہر چیز پر سکوت تھا۔ ہر طرف خاموشی تھی لگتا تھا طنبورے کی ساحرانہ آواز اور رقص کی قاتلانہ اداؤں پر پوری کائنات

دم بخود رہ گئی ہو۔

عمرو اپنے گھوڑے سے اترا اور ایک کھجور کے تنے سے ٹیک لگا کر کھڑا ہو گیا تھا۔

طنبورے کی لَے اور رقص کی گردش جب اپنے پورے جوبن پر آئیں تو اس بوڑھے طنبورہ نواز کے ہونٹ حرکت میں آئے اور اس نے گانا شروع کر دیا۔ وہی پرانا گیت، وہی قدیم اور صحرا کی لذتوں سے بھرپور دشت کا حسین نغمہ۔

"ہماری نوائیں گرم صحرا کا گیت ہیں۔

سورج جب آب و تاب سے فروزاں ہوتا ہے۔

ہم تندرست جسم واحد کی طرح صحرا کا سینہ چیرتے سفر کرتے ہیں۔

چمکتی اور جوت پھیلاتی دھوپ ہمیں ایسے ہی عزیز ہے۔

جیسی ان کونپلوں کو جو سورج کی گرم شعاعوں کو پیتی ہیں۔

ہماری نوائیں گرم صحرا کا گیت ہیں۔

ہم مستقل آباد ہونے کے لیے زمین کا ٹکڑا خریدنے کے لیے پیسے کیوں خرچ کریں۔

جب کہ رات کی تاریکی صحرا میں ایک ماں کی طرح ہماری حفاظت کرتی ہے۔

ہم لالچ اور بیکراں آرزوؤں کا شکار نہیں ہوتے۔

صحرا سے ہماری محبت جھاگ سے آشنا اور بلور کی طرح شفاف لہروں جیسی ہے۔

ہماری نوائیں گرم صحرا کا گیت ہیں۔"

وہ پُراسرار بوڑھا گاتا رہا اور اردگرد بیٹھے لوگ دم بخود ہو کر اسے سنتے رہے اور لڑکی ناچتی رہی۔ اردگرد بیٹھے ان مرد عورتوں میں وہ حسین اور ساحرہ انداز ربیعہ بھی تھی جو کبھی عمرو کے باپ عدی سے محبت کرتی تھی۔ وہ گانے والے کے قریب ہی بیٹھی تھی۔ کبھی وہ بھی الاؤ کے گرد رقص کیا کرتی تھی۔ پر اب تو وہ اداس اور ویران تھی۔ اس کے بال پھوس کی طرح بکھرے ہوئے تھے۔ دیوانی اور پاگل جو ہو چکی تھی۔

الاؤ کی تیز روشنی میں ربیعہ بڑے غور سے عمرو کی طرف دیکھ رہی تھی جو کھجور

کے تنے سے ٹیک لگائے اس حسین لڑکی کی طرف دیکھے جا رہا تھا جو رقص کر رہی تھی۔

رات کی تاریکی میں بکھری ہوئی الاؤ کی روشنی میں اس حسین رقاصہ کا حریری جال برق بن کر چمک رہا تھا اور اس کے رقص کرنے کی جوان اور بھرپور ادائیں کسی اجنبی کو مبہوت کر دینے کے لیے کافی تھیں۔

گانا جب ختم ہو گیا تو اس نغمہ نوا بوڑھے نے اپنا طنبورہ ایک ہاتھ میں تھاما اور اٹھ کھڑا ہوا۔ آہستہ آہستہ اور رازدارانہ سی چال چلتا ہوا وہ عمرو کے پاس آیا اور دبی دبی سی آواز میں پوچھا۔ "اجنبی! تم کون ہو؟"

عمرو جو رقاصہ کے حسن میں کھویا ہوا تھا بڑی مشکل سے جواب دے سکا۔

"مسافر ہوں۔"

ربیعہ بھی الاؤ کے پاس سے اٹھی اور وہاں آ کھڑی ہوئی۔ وہ بڑے وحشتناک سے انداز میں عمرو کی طرف ٹکٹکی باندھے دیکھے جا رہی تھی۔ رقص کرنے والی وہ حسین لڑکی بھی عمرو کے قریب آ کر کھڑی ہو گئی۔

گانے والے نے کانپتی اور لرزتی آواز میں کہا۔

"یہاں سے چلے جاؤ اجنبی! یہ صحرا ظلمتوں کی آماجگاہ ہے۔ یہاں سے بھٹک جانے کے سوا تمہیں کچھ حاصل نہ ہوگا۔"

بڑے حوصلے اور جرأت سے کام لیتے ہوئے عمرو نے اس رقاصہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"اگر میں کہوں کہ میں اس حسین رقاصہ کو پسند کر چکا ہوں تب۔"

گانے والے نے اپنے کانوں میں انگلیاں دے لیں اور زور سے چلّا اٹھا۔

"نہیں نہیں ایسا نہیں ہو سکتا۔ یہ گمراہ کن خیال ہے اجنبی! ترک کر دو اس ارادے کو۔ سنو اجنبی! یہ ایک ایسا ارادہ ہے جو کسی روز تمہاری جان پر بوجھ بھی بن سکتا ہے۔ جاؤ اجنبی! چلے جاؤ یہاں سے۔"

عمرو نے اپنی تلوار کے دستے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

"تمہارے قبیلے میں اگر کوئی ایسا جوان ہو جو اس لڑکی کو اپنا حق تسلیم کرتا ہو تو اسے کہو وہ تیغ زن ہو کر میرا سامنا کرے۔ پھر دونوں میں سے جو زندہ رہے یہ رقاصہ اسی کا!"

گانے والے نے بھاری اور مغموم آواز میں کہا۔

"تم غلط فیصلہ کر رہے ہو۔" سنو اجنبی! آج سے انیس برس پہلے بھی بالکل تم جیسا ایک نوجوان اس قبیلے میں داخل ہوا تھا اس کا نام عدی بن نصر تھا اور وہ ....."

گانے والے نے ربیعہ کی طرف اشارہ کیا اور وہ ہمارے قبیلے کی اس لڑکی کو پسند کر بیٹھا۔ اجنبی! وہ رات بھی ایسی ہی طوفانی اور سرد رات تھی۔ جب دریائے فرات کے کنارے وہ حسین اور مضبوط اعضاء کا اجنبی ہمارے پڑاؤ میں داخل ہوا تھا اس وقت یہ جواب پاگل ہو گئی ہے بالکل آج ہی کی طرح الاؤ کے گرد رقص کر رہی تھی اور وہ اجنبی اسے پسند کر بیٹھا، پر اس سنگلاخ صحرا کے اندر ان دونوں کی محبت پسند نہ کی گئی اور ملکہ الزباء نے دھوکے سے صحرا کے اندر اس اجنبی کو قتل کرا دیا اور اس کی جدائی میں یہ ربیعہ بیچاری پاگل ہو گئی ——"

گانے والا شاید کچھ اور بھی کہتا پر پاگل ربیعہ زور زور سے چیخیں مارتی ہوئی ایک طرف بھاگی اور قریب ہی ایک کچی قبر پر بیٹھ زار و قطار رونے لگی۔

گانے والے نے دکھ سے کہا۔

"دیکھا تم نے اجنبی! وہ قبر جس پر بیٹھ کر ربیعہ رونے لگی ہے وہ اس کے محبوب کی قبر ہے جسے سنگدل الزباء نے قتل کرا دیا تھا۔"

کئی اور لوگ بھی عمرو کے گرد آ کر جمع ہو گئے تھے۔ عمرو نے بھاری اور غمگین آواز میں پوچھا۔

"کیا وہ اجنبی جس کا تم نے ذکر کیا ہے اور جس کا نام تم نے عدی بن نصر بتایا ہے نوایاد کے سردار کا بیٹا تھا؟"

گانے والے نے چونک کر کہا۔

"ہاں، وہ نوایاد کے سردار کا بیٹا تھا۔ پر تم اسے کیونکر جانتے ہو؟"

عمرو اداس ہو کر خلاؤں میں کھو سا گیا اور روتی ہوئی آواز میں اس نے جواب

میں اسے برسوں سے جانتا ہوں۔ میرا اس کا ایسا ناطہ ہے جس سے بڑھ کر دنیا میں کوئی مضبوط اور پائیدار رشتہ نہیں ہوتا۔

گانے والے نے پریشان ہو کر پوچھا۔

"تمہاری شکل بھی کافی حد تک اس سے ملتی ہے کیا تم اس کے ہمزاد ہو یا اس کی روح اپنا انتقام لینے کی خاطر پھر اس انام کی طرف لوٹ آئی ہے؟"

عمرو نے اس کی نفی کی۔ "نہیں میں ایک حقیقی انسان ہوں۔"

"تمہارا اس سے رشتہ؟"

"میں اس کا بیٹا ہوں اور میرا نام عمرو بن عدی ہے۔"

گانے والے نے چونک کر پوچھا۔

"میں نے سنا تھا عدی نے قبیلہ ازد کے سردار جذیمہ کی بہن رقاش سے شادی کی تھی۔ کیا تم اسی رقاش سے ہو اور جذیمہ کے بھانجے ہو؟"

"ہاں، میری ماں کا نام رقاش ہے۔ میں اپنے باپ کی قبر دیکھنے اور اس کے قبیلے والوں سے ملنے آیا ہوں۔" اس کے بعد میں بنی قسطورا کی ملکہ الزباء سے اپنے باپ کا ایسا خوفناک انتقام لوں گا کہ صحرا کا ہر ذرہ اور نخلستانوں کا چپہ چپہ برسوں تک اس انتقام کی صداقت اور قہرمانیت کے گیت گائے گا۔ کیا تم اب بھی سمجھتے ہو اس لڑکی کو پسند کر لینے سے ایک طوفان اٹھ کھڑا ہو گا۔ یاد رکھو، میں بزدل نہیں ہوں۔ آج کے بعد تمہارے دشمن میرے دشمن ہونگے۔"

قبل اس کے کہ گانے والا کوئی جواب دیتا ایک بوڑھا جس کے سر اور داڑھی کے بال چاندی کی طرح سفید تھے، عمرو کے گرد لوگوں کے جمع ہونے والے ہجوم سے نکلا اور بڑے اداس لہجے میں اس نے عمرو کو مخاطب کر کے کہا۔

"عدی کے بیٹے! میں پاگل ربیعہ کا باپ ہوں۔ میرا نام سمرہ ہے اور یہ لڑکی جسے تم پسند کر چکے ہو میری پوتی ہے۔ اگر تم اس سے شادی کرنا چاہتے ہو تو آج سے یہ تمہاری امانت ہے لیکن رخصتی کے لیے میری ایک شرط ہو گی۔"

عمرو نے بے تاب ہو کر پوچھا۔ "کیسی شرط؟"

"الزباء سے عدی بن نصر کا انتقام جس روز تم نے الزباء کو قتل کر دیا۔ اسی روز میں صفیہ کو جو میری پوتی ہے میں تمہارے حوالے کر دوں گا۔"

عمرو اپنا ہاتھ تلوار کے دستے پر لے گیا اور غصے کی حالت میں کہا۔ "اگر تم صفیہ مجھے نہ دو تو بھی مجھے الزباء سے انتقام ضرور لینا ہے۔"

یاد رکھو! ملکہ الزباء مجھ سے بچنے کے لیے اگر اس کرۂ خاک میں مشرق سے مغرب مغرب سے مشرق کی طرف بھاگتی رہے تو بھی میں وقت کی تیز آب جو کی طرح اس کا تعاقب کر کے اسے موت کی گہری نیند سُلا دوں گا۔

سمرہ جواب میں کچھ کہنے والا تھا کہ ایک ایسا شخص وہاں آیا جسے دیکھتے ہی لوگ فوراً اِدھر اُدھر ہٹ کر اسے راستہ دینے لگے۔ اس کے ساتھ ایک خانہ بدوش مرد تھا جو اس کی راہنمائی کر رہا تھا۔ آنے والا وہ معزز شخص ادھیڑ عمر کا کوئی بوڑھا عرب تھا جس کا سر بے کلاہ اور کمر خمیدہ تھی۔ بوڑھا ہونے کے باوجود اس کے چہرے پر ایک جلال تھا۔ اس کی راہنمائی کرنے والے خانہ بدوش نے عمرو کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اسے کہا۔

"یہ ہے وہ نوجوان!"

اس نووارد بوڑھے نے چند لمحوں تک ٹکٹکی باندھ کر عمرو کو دیکھا پھر اس کی پلکیں بھیگ گئیں۔ اس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور عمرو کی طرف اپنے بازو پھیلا دیئے۔

"عدی کے بیٹے! آگے بڑھ کر میرے گلے لگ جاؤ۔ میں تمہارے باپ کا ماموں اور بنو ایاد کا سردار عطاف بن جابر ہوں۔"

عمرو بھاگ کر آگے بڑھا اور اپنے باپ کے ماموں سے لپٹ گیا۔ بوڑھے عطاف نے عمرو کی پیٹھ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

"میں نے سُنا ہے تم اپنے باپ کا انتقام لینا چاہتے ہو؟"

عمرو نے اپنے مضبوط بازوؤں سے بوڑھے عطاف کو سہارا دیتے ہوئے کہا۔

"ہاں دادا! میں عیار الزباء سے اپنے بے گناہ باپ کا انتقام ضرور لوں گا۔ میں اسے بتا دوں گا کہ میرے باپ کی موت کے بعد اس صحرا میں سکوت طاری نہ ہوگا بلکہ طوفان اٹھے گا جس کے ریگزار الزباء کے محل میں بھی گریں گے۔"

عطاف نے اپنے ننگے سر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"عدی کی موت پر میں نے قسم کھائی تھی کہ جب تک اپنے بھانجے کے قتل کا انتقام نہ لے لوں سر پر عمامہ نہ باندھوں گا۔ آہ! افسوس! میں الزباء سے انتقام نہ لے سکا اور اب تو میں بوڑھا اور لاغر ہو چکا ہوں۔ میں نے بڑی کوشش کی کہ اپنے گرد ایسی جمعیت جمع کر سکوں جو الزباء سے انتقام لے سکے لیکن الزباء سخت عیار اور مکار ہے اس نے اپنی طاقت میں اس قدر اضافہ کر لیا ہے کہ میں صرف اپنے قبیلے کے بل پر اس سے ٹکرا جانے کا تعلق سوچ بھی نہیں سکتا۔ آہ! میرے لیے یہ کیسا بدبختی اور بدنصیبی کا دور شروع ہے۔"

بوڑھے عطاف کی کمر کے گرد اپنا مضبوط بازو لپیٹتے ہوئے عمرو نے مضبوط لہجے اور اعتماد سے کہا۔

"دادا! اب میں آپ کا بازو ہوں۔ میں آپ کے بھانجے کا خون ہوں۔ میں آپ کا سر بے کلاہ نہ رہنے دوں گا۔ اگر الزباء عیار اور مکار ہے تو میں بھی اس کے لیے ہیولا سانپ بن جاؤں گا۔ دادا! عنقریب آپ دیکھیں گے عمرو بن عدی اپنے باپ کا انتقام کس طرح لیتا ہے۔"

عطاف نے عمرو کے سر پر ہاتھ پھیرا۔

"ابراہیمؑ کا رب تجھے کامیاب کرے گا۔ میں نے سُنا ہے الزباء نے تمہارے ماموں جابر کو بھی دھوکے سے اپنے پاس بُلا کر قتل کر دیا ہے۔"

"ہاں دادا! وہ میرے ماموں کی بھی قاتل ہے۔"

"تمہاری ماں رقاش کیسی ہے؟"

"وہ اب کمزور ہو چکی ہے دادا! اور بڑی بیتابی کے ساتھ وہ اس دن کا انتظار کر رہی ہے جب میں الزباء سے انتقام لینے میں کامیاب ہو جاؤں گا۔ دادا! مجھے رخصت کرتے وقت میری ماں نے کہا تھا اگر میرے شوہر کا ماموں اور بنو ایاد کا سردار زندہ ہو تو اسے

کہنا آپ کی بیٹی آپ کو سلام کہتی ہے۔"

عطاف نے سلگتے ہوئے لہجے میں کہا۔

" آہ رقاش! میری بیٹی! عدی کے بعد تیری زندگی بھی صحرا کے اندر خشک ہو جانے والے دریا جیسی ہو گئی ہو گی۔ کاش تیری بے بسی کے دور میں تیری اس شکستگی کے عالم میں یہ بوڑھا تیری کوئی مدد کر سکتا۔"

عمرو نے عطاف کا حوصلہ بڑھایا۔

" میں آپ کا سہارا بنوں گا دادا!"

عطاف نے کچھ سوچا پھر دھیرے دھیرے مسکراتے ہوئے اس نے رقاصہ کی طرف اشارہ کر کے عمرو سے پوچھا۔

" میں نے سنا ہے تم اس خانہ بدوش لڑکی کو جس کا نام صفیہ ہے پسند کر چکے ہو"

عمرو نے شرماتے کہا۔" ہاں دادا۔"

" کیا تم ماں کے پاس سے سیدھے میرے قبیلے میں آ رہے ہو؟"

" ہاں میں آپ سے ملنے اور اپنے باپ کی قبر دیکھنے آیا ہوں۔"

" تم چند یوم میرے پاس رہو گے نا۔"

" ضرور رہوں گا۔"

بنو ایاد کے سردار عطاف نے اس بار سمرہ سے کہا۔

" سمرہ! صفیہ تمہاری پوتی ہے نا۔"

سمرہ نے مؤدب ہو کر کہا۔" ہاں سردار!"

" تو پھر سنو! آج کے بعد صفیہ میرے گھر میں میری بیٹی بن کر رہے گی اور جب عمرو اپنے باپ کے انتقام سے فارغ ہو جائے گا میں ان دونوں کو بیاہ دوں گا۔ کیا تمہیں کوئی اعتراض ہے؟"

سمرہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

" نہیں سردار! بلکہ یہ میرے لیے بہت بڑا اعزاز ہو گا۔"

عطاف نے عمرو اور صفیہ دونوں کے ہاتھ پکڑ کر کہا۔

" تم دونوں میرے ساتھ آؤ۔"

پہلے وہ سب عدی کی قبر پر آئے جہاں ابھی تک ربیعہ بیٹھی رو رہی تھی پھر بوڑھا ...دار عطاف، عمرو اور صفیہ کو لے کر اپنے گھر کی طرف چلا گیا۔ بوڑھے سمرو نے عدی کی قبر پر بیٹھی ...روتی ہوئی ربیعہ کا ہاتھ پکڑا اور اسے اپنے خیموں کی طرف لے گیا۔

بنی تسطورا کی ملکہ الزباء اپنے اس عام کمرے میں بیٹھی ہوئی تھی جس میں وہ اپنا ...بار لگایا کرتی تھی اس کا حسن اور اس کی سنہری رنگت بلور کی طرح چمک رہی تھی۔ اس کا ...س دھریہ کا تیز رنگ کا لباس فرش کے اس سرخ ریشمی قالین پہ بکھر گیا تھا جس پہ جنگلی ...روں کی شبیہیں بنی ہوئی تھیں۔ الزباء نے اپنی نشست پر بڑی بے چینی اور دل گرفتگی ...زیں پہلو بدلا پھر وہ اپنے سامنے بیٹھے ستارہ شناسوں سے مخاطب ہوئی۔

" بنی ازد کے حکمران جذیمہ نے مرتے وقت کہا تھا کہ ایک روز اس کا بھانجہ مجھ سے ...بدلا انتقام لے گا۔ کیا تم اپنے علم سے یہ جان سکتے ہو کہ میرا قاتل کون ہو گا۔"

الزباء کے سامنے بیٹھے سب منجموں نے ایک بار تعظیماً اپنی گردنیں جھکائیں۔ پھر ...پنے کام میں مصروف ہو گئے۔ انہوں نے اپنے سامنے اپنی اپنی گود میں لکڑی کی تختیاں ...لیں اور نوک دار کوئلوں کی مدد سے وہ اپنا اپنا حساب لگانے لگے۔

اس کام میں انہوں نے کوئی ایک ساعت لگائی پھر انہوں نے ایک دوسرے ...صلاح مشورہ شروع کر دیا جیسے ایک دوسرے سے اپنا اپنا کام ملانے کی کوشش کر ...رہے ہوں۔ جب وہ آپس کا صلاح مشورہ ختم کر چکے تو ان میں سے ایک بوڑھا منجم اٹھا ...مؤدبانہ ہاتھ باندھ کر الزباء سے کہا۔

"ملکہ کا قاتل شمال مغرب کی طرف سے آئے گا۔ وہ ایک توانا اور خوبصورت جوان ہوگا اور طاقت و شجاعت میں یگانۂ روزگار ہوگا۔ آپ اپنی طرف سے کتنی بھی کوشش کریں اس سے بچ نہ سکیں گی۔"

الزباء نے پریشانی میں پوچھا۔

"کیا تم اس کا نام نہیں جان سکے ہو؟"

"ہم اس کا نام جان چکے ہیں اور اس کا تعلق آپ کے پرانے دشمنوں سے ہے۔"

"کون پرانے دشمن؟"

"عدی اور جذیمہ۔"

"اس کا ان دونوں سے کیا تعلق اور رشتہ ہے؟"

"وہ عدی کا بیٹا اور جذیمہ کا بھانجہ ہے۔"

"کیا وہ رقاش سے ہے اور عدی کا بیٹا ہے؟"

"ہاں!"

"اس کا نام تم نے نہیں بتایا۔"

"اس کا نام عمرو بن عدی ہے۔"

الزباء نے نجومیوں کو رخصت کر دیا۔ وہیں بیٹھے بیٹھے اس نے اپنے قبیلے کے دو سب سے بہترین اور سبک دست مصوروں کو بلایا اور انہیں عمرو بن عدی کی تصویر کرانے کے لیے تنوازد کی طرف روانہ کر دیا۔

مصور جب اپنی منزل پر روانہ ہو گئے تو الزباء اس کمرے کے اندر بڑی بے چینی سے ٹہلنے لگی۔ اتنے میں جذیمہ کا وزیر قصیر اس کمرے میں داخل ہوا۔ الزباء اس کی طرف دیکھ کر مسکرائی اور بڑی گھلاوٹ اور مٹھاس سے کہا۔

"تم بڑے اچھے وقت پر آئے ہو۔ میں تمہیں ہی بلانے والی تھی۔"

قصیر سر جھکاتا ہوا آگے بڑھا اور تعظیماً کہا۔

"میں خود آپ کے پاس ایک عریضہ لے کر حاضر ہوا ہوں۔"

الزباء نے پھر بڑی لگاوٹ سے کہا۔

"پہلے تم کہو کیا کہنا چاہتے ہو؟"

اپنا خمیدہ سر اوپر اٹھاتے ہوئے قصیر نے کہا۔

"میں یہاں بیکار اور فارغ پڑے رہنے کی زندگی سے تھک اور اکتا گیا ہوں میں آپ کے پاس یہ عریضہ لے کر حاضر ہوا ہوں کہ مجھے کوئی کام سونپا جائے جس سے میں مصروف بھی رہ سکوں اور آپ اور آپ کے قبیلے کی خدمت بھی کر سکوں۔"

الزباء نے سوچتے ہوئے پوچھا۔

"کیسا کام کرنا پسند کرو گے؟"

"جو بھی آپ سونپ دیں۔"

"کیا تم قبیلے کے تجارتی کاروان کی رہبری اور راہنمائی کا کام انجام دے سکو گے؟" قصیر مطمئن نظر آنے لگا اور بیتاب ہو کر اس نے کہا۔

"میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں کہ میں تجارت میں آپ کے لیے بھاری منافع کما کر لایا کروں گا۔"

الزباء نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔

"اگر تم تجارت میں میرے قبیلے کے لیے اچھا منافع کما سکو تو میں تمہیں ایسی عزت بخشوں گی جس کا تم تصور بھی نہیں کر سکتے ہو۔"

قصیر نے بات کو بڑھاتے ہوئے پوچھا "کب تک میں اس کام پر روانہ ہو سکوں گا۔"

"اگلے ماہ کے پہلے عشرے کے کسی بھی روز میں خود تمہیں اپنے تجارتی کاروان کے ساتھ الوداع کہوں گی۔ تمہارے خیال میں قبیلے کے تجارتی کاروان کو کس طرف روانہ ہونا چاہیے۔"

چند لمحوں تک کچھ سوچنے کے بعد قصیر نے جواب دیا۔

"میرے خیال میں ہمارے تجارتی کاروان کو حیرہ شہر کی طرف روانہ ہونا چاہیے۔ وہاں ہمارا مال فوراً اچھے داموں اور جلدی بک جانے کے مواقع ہیں۔"

فیصلہ کن انداز میں الزباء نے کہا۔

"تم پھر مطمئن رہو۔ اگلے ماہ کے پہلے عشرے میں قبیلے کا ایک بہت بڑا تجارتی کاروان تمہاری راہنمائی میں حیرہ کی طرف روانہ ہوگا۔ کیا تم سمجھتے ہو تمہارا مسئلہ حل ہو گیا ہے؟"

مسکراتے ہوئے قصیر نے جواب دیا۔ "ہاں میرا مسئلہ ختم ہو چکا ہے۔"

"تو پھر وہ سنو جو میں کہنا چاہتا ہوں۔"

"کہیئے۔"

"آج میں نے قبیلے کے منجموں کو جمع کیا تھا اور ان سے پوچھا تھا۔ بتاؤ میرا قاتل کون ہوگا تو انہوں نے اپنے حساب سے بتایا کہ میرا قاتل عمرو بن عدی ہوگا جو جذیمہ کا بھانجہ اور نبوایاد کے عدی بن نصر کا بیٹا ہے۔ کیا تم عمرو بن عدی کو جانتے ہو؟"

"وہ میرے ہاتھوں میں پلا ہے۔"

"کیا ہم اسے اس کے ماموں کی طرح کسی طریقے سے یہاں بلا کر اسے قتل کر کے اس سے چھٹکارا حاصل کر سکتے ہیں؟"

قصیر نے برجستہ کہا۔ "ہم ضرور اسے یہاں بلا سکتے ہیں۔"

الزباء کی آنکھیں چمک اٹھیں "کیسے؟"

"اسے یہاں بلانے کی ذمہ داری آپ مجھ پر رہنے دیجئے۔ جب میں تجارتی قافلے کے ساتھ حیرہ روانہ ہوں گا تو اس سے رابطہ پیدا کرنے کی کوشش کروں گا اور اسے لالچ دوں گا کہ اگر تم اپنے باپ اور ماموں کے قتل کا بدلہ لینا چاہتے ہو تو مجھ سے تعاون کرو۔ میں انتقام لینے میں تمہاری مدد کر سکتا ہوں۔ میں اس سے حیرہ شہر میں ملنے کی کوشش کروں گا۔ میں اصل حالات ظاہر نہ کروں گا۔ میں کہوں گا، میں اکیلا ہوں اور اس خیال سے قبیلے کے بجائے تمہیں حیرہ میں ملنے کے لیے جگہ مقرر کی ہے کہ کہیں تم مجھے قتل ہی نہ کر دو۔ چونکہ وہ آپ سے انتقام لینے کے لیے دیوانہ ہو رہا ہے لہذا مجھے امید ہے کہ مجھ سے ملنے وہ ضرور حیرہ آئے گا اور اگر وہ آیا تو میں اسے رسیوں میں جکڑ کر آپ کے سامنے پیش کر دوں گا۔"

الزباء نے اسے بھاری انعام کا لالچ دیا۔

"اگر تم ایسا کر سکو تو میں تمہیں اپنا وزیر بنا کر تم سے شادی کر لوں گی۔"

قصیر نے سر جھکاتے ہوئے کہا۔

"یہ میرے لیے ایک بہت بڑی سعادت ہوگی۔"

الزباء نے ایک قاتل ادا سے کہا۔ "اب تم جا سکتے ہو۔"

قصیر باہر نکل گیا اور الزباء مطمئن اور مسکراتی ہوئی اپنی خواب گاہ کی طرف چلی گئی۔

ایک روز نبوایاد کا بوڑھا سردار عطاف اپنے مکان سے باہر عمرو بن عدی کو الوداع کہہ رہا تھا۔ عطاف سے مل کر وہ گھوڑے پر سوار ہوا اور بڑی بے چینی سے ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ اسے صفیہ کہیں نظر نہ آ رہی تھی۔ وہ گھر پر بھی نہ تھی۔ وہ اس کے لیے پریشان تھا۔ اب وہ اس کی ہم سفر جو تھی تاہم اس نے گھوڑے کو ایڑ لگا دی۔

جب وہ بستی سے باہر ایک ایسے راستے پر جا رہا تھا جس کے دونوں طرف کھجوروں کے گھنے درخت تھے تو اس کے چہرے پر مسکراہٹ اور تازگی بکھر گئی۔ کھجوروں کے ایک جھنڈ سے صفیہ نکل کر اس کے سامنے آ کھڑی ہوئی تھی۔ عمرو نے گھوڑے کو روکا اور گھوڑے سے نیچے کود گیا۔ صفیہ اداس اداس سی اس کے سامنے کھڑی تھی۔ عمرو نے آگے بڑھ کر اس کے دونوں ہاتھ تھام لیے اور مسکراتے ہوئے کہا۔

"گھر سے رخصت ہوتے وقت میں بڑے قلق کے ساتھ روانہ ہوا تھا۔ میں نے تمہیں ادھر ادھر دیکھا تم کہیں بھی نہ تھیں۔ میں نے سوچا شاید تم سے ملاقات نہ ہو سکے گی۔ میں تمہارا مشکور ہوں تم مجھے یہاں ملنے آ گئی ہو۔ اب میں یہاں سے سکون کے ساتھ رخصت ہو سکوں گا۔"

صفیہ نے بھاری اور اداس آواز میں پوچھا۔

"پھر کب آؤ گے؟"

"بہت جلد، تم دیکھو گی مَیں الزباء سے انتقام لے کر تمہیں اپنی بیوی بنا کر ہمیشہ کے لیے اپنی ماں کے پاس لے جاؤں گا۔"

"کیا تم کچھ دن اور نہیں رُک سکتے؟"

"نہیں، مَیں پہلے ہی یہاں زیادہ قیام کر چکا ہوں۔ میری ماں بڑی بیتابی سے میرا انتظار کر رہی ہوگی اور وہ شہر سے باہر نکل کر روزانہ ریت کے ٹیلوں پر کھڑی میری راہ دیکھتی ہوگی"

صفیہ نے دُکھ سے کہا۔ "مَیں تمہیں اس اُمید پر الوداع کہتی ہوں کہ بہت جلد تم اپنے دشمنوں سے نمٹ کر اس دشت کا رُخ کرو گے جہاں مَیں ویران دِنوں اور تاریک راتوں میں تمہارا انتظار کر رہی ہوں گی۔" صفیہ نے ہاتھ فضا میں لہرا کر عمرو کو الوداع کہا۔ عمرو ایک ہی جست میں اپنے گھوڑے پر سوار ہوا۔ کھجوروں کے جھنڈ کے بیچوں بیچ وہ اپنے گھوڑے کو آہستہ آہستہ چلاتا رہا اور بار بار مُڑ کر راستے کے درمیان کھڑی صفیہ کو دیکھتا جا رہا تھا۔

صحرا میں داخل ہو کر اس نے اپنے چہرے پر نقاب ڈال لیا اور گھوڑے کو ایڑ لگا دی۔ اب اس کا گھوڑا صحرا کے اندر شمال مغرب کے رُخ پر سرپٹ دوڑا جا رہا تھا۔

صحرا کی وسعتوں کو عبور کرنے کے بعد جب وہ اپنے شہر کے صحرائی محل میں داخل ہوا تو اس نے دیکھا محل سے باہر ہی اس کی ماں رقاش اس کے انتظار میں کھڑی تھی۔ جونہی وہ گھوڑے سے اُترا رقاش نے تنبیہاً کہا۔

"تم نے بہت لگا دی بیٹے! اِتنے دِن وہاں رُکے رہے۔ مَیں ہر روز تمہارا انتظار کرتی تھی"۔ عمرو نے مُسکراتے ہوئے کہا۔

"میرے باپ کے ماموں نے مجھے روک لیا تھا ماں!"

رقاش نے افسردہ لہجے میں پوچھا۔ "وہ اب ضعیف اور کمزور ہو گیا ہوگا"

عمرو بھی اُداس ہو گیا۔ "ہاں ماں! اس کا بدن نزار اور کمر خمیدہ ہو گئی ہے۔ اس نے میرے باپ کے مرنے پر عہد کیا تھا کہ وہ جب تک الزباء سے انتقام نہ لے لے اپنے

سر پر عمامہ نہ باندھے گا لیکن افسوس وہ الزباء سے انتقام نہ لے سکا اور اب تک وہ بے کلاہ ہی پھرتا ہے۔ مَیں نے عہد کیا ہے ماں! مَیں اپنے باپ کا انتقام لے کر اپنے ہاتھ سے اس کے سر پر عمامہ باندھوں گا۔"

دعا کے انداز میں رقاش نے کہا۔

"ابراہیم کا رب تجھے تیرے مقصد میں کامیاب کرے"۔ قبل اس کے عمرو کچھ کہتا رقاش پھر بولی۔ "تمہارے ذاتی جاسوسوں میں سے ایک کل کاتصیر کے پاس سے آیا ہوا ہے۔ وہ تم سے کچھ کہنا چاہتا ہے۔ وہ بڑا بیتاب تھا، کہہ رہا تھا مَیں بنو ایاد میں ہی جا کر تم سے مِل لیتا ہوں لیکن مَیں نے اسے روک رکھا ہے۔ تم اس سے مِل لو۔ شاید کوئی اہم پیغام لایا ہو۔"

عمرو نے بیتاب ہو کر پوچھا۔

"کہاں ہے وہ؟"

"مہمان خانے میں"۔

گھوڑے کو سائیس کے حوالے کر کے عمرو تیزی سے مہمان خانے کی طرف بڑھا۔ رقاش بھی اس کے ساتھ تھی۔ جب وہ مہمان خانے میں داخل ہوئے تو وہاں ایک ادھیڑ عمر کا عرب آتش دان کے پاس بیٹھا تھا۔ عمرو کو دیکھتے ہی وہ کھڑا ہو گیا۔ عمرو اور رقاش بھی آتشدان کے پاس جا کر بیٹھ گئے۔ عمرو نے اس بوڑھے عرب کو بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔

"کیا تم قصیر کے پاس سے آئے ہو؟"

بوڑھا عرب بیٹھتے ہوئے بولا۔

"ہاں مجھے اس نے ایک اہم پیغام کے ساتھ آپ کے پاس بھیجا ہے"۔

"کیسا پیغام؟"

"اس نے کہا تھا عمرو بن عدی سے کہنا۔ اگلے ماہ کے پہلے عشرے میں وہ حیرہ شہر کے شمال میں ایک مشہور سرائے رباط الشرق میں اس کا انتظار کرے۔ اس نے یہ بھی کہا تھا کہ جب آپ حیرہ جائیں تو کم از کم ۵۰ ہزار دینار سُرخ اپنے ساتھ لے کر جائیں۔ وہ

آپ سے اگلے ماہ کے پہلے عشرہ میں کسی بھی روز حیرہ کی اسی سرائے میں ملے گا۔ قصیر نے تنبیہ کی تھی کہ یہ موقع ضائع نہ کیا جائے۔ ورنہ جس مقصد کے لیے ہم جدوجہد کر رہے ہیں اس میں کبھی کامیاب نہ ہو سکیں گے۔"

عمرو مسکرا رہا تھا۔ "میں سب کچھ سمجھ رہا ہوں۔ اس کے علاوہ بھی اس نے کچھ کہا تھا۔"

"نہیں ——— میں آج ہی یہاں سے روانہ ہو جاؤں گا۔ آپ اسے پیغام دینا چاہیں گے۔"

عمرو نے سوچتے ہوئے کہا۔ "قصیر سے کہنا۔ اگلے ماہ کے پہلے عشرے میں ۵۰ ہزار سُرخ دیناروں کے ساتھ میں حیرہ کی رباط الشرق میں اس کا انتظار کروں گا پھر عمرو کھڑا ہوتا ہوا بولا۔

"کیا تم آج رات یہاں رکو گے؟"

وہ بوڑھا عرب بھی کھڑا ہو گیا۔ "میں پہلے ہی دو دن یہاں رُک کر آپ کا انتظار کر چکا ہوں جب کہ قصیر نے مجھے بہت جلد لوٹ آنے کو کہا تھا۔"

عمرو نے اپنی قبا کے اندر سے نقدی کی ایک خریطی نکالی اور اس بوڑھے عرب کو تھماتے ہوئے کہا۔ "یہ رقم رکھ لو۔ سفر میں تمہارے کام آئے گی"

عمرو اپنی ماں رقاش کے ساتھ مہمان خانے سے باہر نکل گیا۔ ان کے پیچھے پیچھے وہ بوڑھا عرب بھی اصطبل کا رُخ کر رہا تھا۔

ایک روز ملکہ الزباء قصیر کو الوداع کہہ رہی تھی۔ اس کی سرکردگی میں وہ بنو قسطورا کا ایک بہت بڑا تجارتی کاروان حیرہ کی طرف روانہ کر رہی تھی۔ شہر سے باہر جہاں تک نگاہ کام کرتی تھی سامان سے لدے ہوئے اُونٹ کھڑے تھے۔

الزباء سے ہدایات لینے کے بعد قصیر اپنے شتر کی طرف بڑھنے ہی لگا تھا کہ مغربی دشت سے انہیں دھول اُڑتی دکھائی دی پھر سب کے دیکھتے ہی دیکھتے اُڑتی ہوئی اس دھول سے دو سوار نمودار ہوئے قصیر جہاں تھا وہیں الزباء کے قریب ہی رُک گیا۔

تھوڑی دیر بعد وہ سوار الزباء کے قریب آ کر رُکے اور اپنے گھوڑوں سے اُترے وہ بنی قسطورا کے وہی دونوں مصوّر تھے جنہیں الزباء نے عمرو بن عدی کی تصویر بنا کر لانے کو بھیجا تھا۔ ان میں سے ایک مصوّر نے اپنے گھوڑے کی خرجین میں سے لپٹا ہوا ایک کپڑا نکالا اور اسے الزباء کے سامنے پھیلا دیا۔ اس کپڑے پر عمرو کی تصویر بنی ہوئی تھی۔ الزباء کچھ دیر تک تصویر کو دیکھتی رہی پھر حسرت بھرے لہجے میں کہا۔

"اس کی شکل بالکل عدی سے ملتی ہے۔ میرا دل کہتا ہے یہی میرا قاتل ہو گا۔ پھر اس نے تصویر قصیر کو دکھاتے ہوئے کہا۔

"کیا یہی عمرو بن عدی ہے؟"

قصیر نے ایک اچٹتی ہوئی نگاہ تصویر پر ڈالی پھر بڑی نفرت اور حقارت سے کہا۔ "یہی ہے وہ غلیظ انسان جو میرا دشمن اور آپ کا متوقع قاتل ہے۔" الزباء نے اس بار اپنے قریب کھڑے مصوّر سے پوچھا۔

"تم اس کی تصویر بنانے میں کیسے کامیاب ہوئے؟"

مصوّر نے مؤدب ہو کر جواب دیا۔

"ہم دونوں لبنانی راہبوں کے بھیس میں بنی ازد میں داخل ہوئے تھے وہاں لوگوں نے ہماری خوب آؤ بھگت کی۔ اس دوران ہم کئی بار عمرو سے بھی ملے۔ ان ملاقاتوں کے درمیان ہم اس کے نقوش کا جستہ جستہ جائزہ لیتے رہے اور رات کو اپنے کمرے میں بیٹھ کر اس کے چہرے کے نقوش کپڑے پر بھی منتقل کرتے رہے۔ یوں ایک روز ہم اس کی تصویر مکمل کرنے میں کامیاب ہو گئے۔"

الزباء نے بڑی نرمی سے اس مصوّر سے کہا۔

"تم دونوں اب جاکر آرام کرو۔"

جب دونوں مصوّر وہاں سے چلے گئے تو الزباء نے بڑی رازداری سے قصیر سے پوچھا۔

"اگر تم عمرو بن عدی کو گرفتار کرنے میں کامیاب ہو گئے تو یہ ایک معرکہ ہوگا، لیکن یہ ضروری نہیں کہ وہ تمہارے کہنے پر حیرہ آئے اور تم اسے گرفتار کر کے لا سکو۔ منصوبہ ناکام بھی ہوسکتا ہے۔ ہمیں اس کے علاوہ بھی کوئی احتیاطی قدم اٹھانا چاہیے۔"

قصیر نے سر جھکا کر چند لمحوں تک کچھ سوچا۔ پھر خوش ہوتے ہوئے کہا۔

"میرے ذہن میں ایک اور ترکیب آئی ہے۔"

"کیسی ترکیب؟"

"یہ تو آپ جانتی ہیں۔ عمرو جب بھی آپ پر حملہ آور ہوگا یہیں آپ کے قبیلے میں آکر وہ آپ پر قاتلانہ حملہ کرے گا۔"

"یہ تو ظاہر ہے۔"

"تو پھر ایک کام کریں۔ اپنی خواب گاہ، وہ کمرہ جس میں آپ دربار لگاتی ہیں اور محل کے باہر وہ شہ نشین جہاں کہ آپ بیٹھتی ہیں۔ ان تینوں جگہ سے ایک زمین دوز راستہ کھودا جائے اور تینوں راستے محل کے کسی تہہ خانے میں جا کر مل جائیں اور پھر اس تہہ خانے سے بھی ایک سرنگ کھود کر مشرق کی طرف دریائے فرات تک اس جگہ لے جائی جائے جہاں پرانے عبادت خانے ہیں۔ ان قدیم عبادت خانوں میں سے کسی ایک کے اندر اس سرنگ کا دروازہ کھلے اور دریا کے اس گھاٹ پر ہر وقت ایک کشتی کھڑی رہے جس کی حفاظت کے لیے ہمہ وقت دو پہریدار وہاں کھڑے رہیں۔ ظاہر ہے حملے کی صورت میں آپ ان تینوں میں سے ایک میں ضرور ہوں گی۔ آپ فوراً اس سرنگ کے ذریعے تہہ خانوں سے ہو کر دریائے فرات تک پہنچ سکتی ہیں اور وہاں سے آپ کشتی کے ذریعے بچ کر نکلنے میں کامیاب ہو جائیں گی۔"

الزباء نے قصیر کی پیٹھ تھپتھپاتے ہوئے کہا۔

"بہترین منصوبہ ہے۔ یقیناً تم کام کے آدمی ہو۔ اب تم اپنے تجارتی کاروان کے ساتھ روانہ ہو جاؤ۔ تمہارے واپس آنے تک میں یہ سرنگ تیار کروا لوں گی۔ میں قبیلے کے سارے معمار اور صنّاع اس کام پر لگا دوں گی۔"

قصیر اپنے شتر پر سوار ہوا اور کاروان کو روانگی کا حکم دیا۔ الزباء مطمئن و شاداں اپنے محل کی طرف چلی گئی۔

قصیر حیرہ شہر کی ایک شمالی سرائے رباط المشرق میں داخل ہوا۔ اس کے ساتھ بزازوں کے دو قابلِ اعتماد آدمی بھی تھے جنہیں ساتھ لے کر وہ بنی تسطورا میں گیا تھا اور جن کے ذریعے وہ عمرو کے ساتھ خط و کتابت کرتا تھا۔

وہ ابھی سرائے کے صحن میں ہی کھڑے تھے کہ سرائے کے اندر سے عمرو نکلا۔ مسکراتا ہوا وہ ان تینوں سے ملا اور سب سے گلے ملنے کے بعد اس نے قصیر سے پوچھا۔

"کہو تم کیسے آئے ہو؟ اور مجھے یہاں کس لیے بلایا ہے؟"

قصیر نے اِرد گرد کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔

"کہیں علیحدہ بیٹھ کر بات کرتے ہیں۔"

عمرو نے اس کا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا۔

"میں نے سرائے میں ایک کمرہ لے رکھا ہے۔ آؤ وہاں بیٹھ کر باتیں کرتے ہیں۔"

چاروں اس کمرے میں آکر بیٹھ گئے اور قصیر نے کہنا شروع کیا۔

"مجھے الزباء نے اپنے قبیلے کا سرکردہ بنا کر بھیجا ہے۔ وہ آپ سے اِن دنوں بہت خوفزدہ ہے کیونکہ اس کے نجومیوں نے اسے بتایا ہے کہ تمہاری موت عمرو بن عدی کے ہاتھوں ہوگی۔ میں نے اسے چکمہ دیا ہے کہ میں تجارتی کارواں کو لے کر جب حیرہ جاؤں گا تو عمرو کو پیغام بھیجوں گا کہ اگر تم الزباء سے انتقام لینا چاہتے ہو تو مجھے حیرہ میں ملو۔ میں نے الزباء کو یقین دلایا تھا کہ عمرو بن عدی اگر وہاں آیا تو میں اسے گرفتار کر کے تمہارے سامنے پیش کر دوں گا۔

عمرو نے بات کاٹتے ہوئے پوچھا۔

"اب مجھے کیا کرنا چاہیے؟"

"پہلے میری پوری بات سنیئے۔"

"کہو ——"

"آپ اپنے ساتھ کتنی رقم لائے ہیں؟"

"پچاس ہزار سُرخ دینار جو تم نے کہے تھے۔"

"بس آپ ان سے میرا سارا تجارتی سامان خرید لیں۔ میں اتنا منافع لے کر جب واپس جاؤں گا تو الزباء بے حد خوش ہوگی اور وہ مجھے فوراً ایک اور کاروان کے ساتھ روانہ کر دے گی۔ اس طرح میں اس کا اعتماد حاصل کر لوں گا۔ جب وہ تمہارے متعلق مجھ سے پوچھے گی تو میں کہوں گا عمرو وہاں آیا تھا لیکن اس کے ساتھ اس کے محافظوں کی ایک بہت بڑی فوج تھی لہٰذا میں اس پر ہاتھ نہ ڈال سکا۔ میں اسے یقین دلانے کی کوشش کروں گا کہ اسی طرح دو تین بار حیرہ میں عمرو اگر مجھ سے مِلتا رہا تو ایک روز وہ مجھ پر اعتماد کر کے وہاں اپنے محافظوں کے بغیر بھی آجائے گا۔ اس روز اسے پکڑ کر میں تمہارے پاس لے آؤں گا۔ جب اگلی بار مجھے وہ تجارتی قافلے کے ساتھ بھیجے گی تو وہ اس سے بھی بڑا کاروان ہوگا۔ لہٰذا اس کی حفاظت کے لیے بنی قسطورا کے جوان بھی اس کے ساتھ زیادہ ہوں گے۔ جب میں دیکھوں گا کہ کاروان کے ساتھ محافظوں کی ایک بڑی جماعت میرے ساتھ روانہ کی گئی ہے تو میں آپ کو مطلع کر دوں گا۔ آپ اپنے قبیلے کی فوج کے ساتھ بنو ایاد میں میرا انتظار کریں جب میں وہاں سے گزروں تو آپ بنو ایاد کے ساتھ مِل کر میرے تجارتی کاروان پر حملہ کر دیں اس طرح ہم بنو قسطورہ کے سارے محافظوں اور تاجروں کو قتل کر کے ان کی جگہ اپنے قبیلے اور بنو ایاد کے جوان اپنے ساتھ لے کر الزباء کی طرف روانہ ہو جائیں گے۔ ظاہر ہے وہ یہی سمجھے گی کہ میرا تجارتی قافلہ لوٹ آیا ہے اور وہ ہمارے استقبال کو آئے گی۔ اس طرح ہم اس پر حملہ کر کے اسے پکڑنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔

گو اس کے اِرد گِرد کافی محافظ ہوتے ہیں لیکن اُن کی تعداد اتنی ہوتی ہے کہ وہ ہمارے آدمیوں کا مقابلہ نہ کر سکیں گے اور جب تک اس کے دوسرے لوگ اس کی مدد کو آئیں ہم الزباء کو قتل کر کے حالات کو اپنے ہاتھ میں لے چکے ہوں گے۔ اب آپ بتائیں یہ ہمارا منصوبہ کیسا ہے؟"

عمرو نے اسے سراہتے ہوئے کہا۔

"بہت اچھا ہے اور اس میں سو فی صد ہمارے کامیاب ہونے کی اُمید ہے۔ اب مجھے کیا کرنا چاہیے؟"

"آپ میرے ساتھ میرے تجارتی کاروان میں چلیئے اور سامان دیکھ کر مجھ سے سارا سامان خرید لیں۔ اس طرح میرے ساتھ کے تاجروں کو شبہ نہیں ہوگا۔ میں انہیں آپ کے متعلق کہوں گا کہ شہر کے اندر اس تاجر سے میری بات ہوئی اور اس نے ہمارا سارا مال خرید لیا ہے۔"

"چلو اُٹھو پھر چلیں۔"

"چلیئے۔"

عمرو، قصیر اور ان کے دونوں ساتھی سرائے سے نکل کر شہر سے باہر آئے، جہاں تجارتی قافلے نے پڑاؤ کیا ہُوا تھا۔ عمرو نے کسی ماہر تاجر کی طرح تجارت کا سارا مال بڑے غور سے دیکھا اور چھان پھٹک کر دیکھا پھر اس نے قصیر کے ساتھ اس کی مرضی کے مطابق بھاؤ طے کر کے قیمت چُکا دی۔

اس قدر جلدی اور اتنے مہنگے داموں مال بک جانے سے بنی قسطورا کے وہ تاجر قصیر کے ساتھ آئے ہوئے تھے بے حد خوش ہوئے۔ وہ قصیر کی دانش مندی اور خلوص کی تعریف کرنے لگے۔ تجارتی کاروان کے ساتھ آئے ہوئے بنو قسطورا کے محافظ سپاہی بھی خوش تھے کہ انہیں زیادہ دِن تک اپنے اہل وعیال سے دُور نہیں رہنا پڑے گا۔

تجارتی کاروان نے صرف ایک شب حیرہ میں قیام کیا اور دوسرے روز شام کے قریب قصیر کاروان کے ساتھ واپس کُوچ کر رہا تھا۔

قصیر کے اس قدر جلدی اور بھاری منافع پر تجارتی سامان بیچ آنے پر الزباء بہت خوش ہوئی۔ قصیر نے اُسے مطمئن کر دیا تھا کہ حیرہ کی ایک سرائے میں عمرو اسے ملا تھا لیکن اس کے ساتھ محافظوں کی ایک بھاری جماعت تھی جن کی وجہ سے وہ اس پر ہاتھ نہ ڈال سکا۔ اس نے الزباء کو یقین دلایا کہ اگر اسی طرح عمرو کے ساتھ دو ایک ملاقاتیں اور ہو گئیں تو وہ مجھ پر اعتماد کر کے اپنے محافظوں کی ضرورت محسوس نہیں کرے گا اور اس روز اُسے گرفتار کرنا میرے لیے مشکل نہ ہو گا۔"

بنی قسطورا میں قصیر کی اب بہت آؤ بھگت ہونے لگی تھی۔ دوسری بار الزباء نے اسے پہلے سے بھی بڑے ایک تجارتی کاروان کے ساتھ روانہ کیا۔ قصیر کے کہنے پر عمرو نے اس بار بھی اس سے مال خرید لیا اور قصیر بھاری منافع کے ساتھ لوٹ آیا۔

تیسری بار الزباء نے اتنا بڑا تجارتی کاروان روانہ کیا جتنا وہ کر سکتی تھی۔ تاجروں اور محافظوں کی تعداد پہلے سے دو گنا کر دی گئی تھی۔ تجارتی سامان بھی پہلے سے کئی گنا زیادہ تھا۔ قصیر نے بروقت عمرو کو اطلاع کر دی اور اس نے اپنے قبیلے کی ایک بھاری تعداد اپنے باپ کے قبیلے بنو ایاد میں لا کر ٹھہرا دی۔ بنو ایاد کے بے شمار جوان بھی اس کے ساتھ شامل ہو گئے اور یوں اسے کافی تقویت مل گئی۔

جب قصیر حیرہ میں وہ سامان بیچ کر لوٹا تو دریائے فرات کے ساتھ ساتھ سفر کرتے ہوئے اچانک اس نے اپنا رُخ بدلا اور دائیں طرف صحرا کے قلب کی طرف بڑھنے لگا۔ ایک بوڑھا تاجر اپنی ناقہ بھگاتا ہوا قصیر کے قریب آیا اور احتجاجاً کہا۔

"آپ نے کاروان کا رُخ کس طرف بدل دیا ہے۔ صحرا کے اندر اگر ہم راستہ بھٹک گئے تو ہم میں سے کوئی بھی زندہ نہ بچے گا۔ ہمارے لیے سب سے محفوظ ترین راستہ یہی ہے کہ فرات کے کنارے کنارے سفر کرتے رہیں۔"

قصیر نے بڑے اعتماد سے کہا۔

"میں صحرا کے اِن سب راستوں سے واقف ہوں تم مطمئن رہو میں کاروان کو بھٹکنے نہ دوں گا۔"

اس بوڑھے نے پھر احتجاج کیا۔

"لیکن صحرا کے قلب سے ہو کر جانے کا فائدہ؟"

قصیر نے اُسے گھور کر دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"کیا تم جانتے ہو صحرا کے اس حصے کی طرف سے گزرتے ہوئے راستے میں کس کے نخلستان آتے ہیں؟"

بوڑھے نے بڑے وثوق سے کہا۔

"میں جانتا ہوں صحرا کے اس حصے میں سے اگر گزرا جائے تو راستے میں بنو ایاد کے نخلستان آتے ہیں جو ہمارے دشمن ہیں اور ہمارے لیے خطرناک ثابت ہو سکتے ہیں۔"

قصیر نے اس بوڑھے سے پھر پوچھا

"کیا تم اپنے قبیلے کو خوش حال دیکھنا پسند نہیں کرتے؟"

"ضرور پسند کرتا ہوں۔"

"تو پھر سنو! بنو ایاد ہمارے تجارتی راستے میں ایک خطرہ ہیں۔ آج میرے ساتھ محافظ ہیں۔ آج میں ان پر شب خون مار کر انہیں ویران اور تباہ کر دوں گا۔ اس طرح ہمارے ہاتھ اتنا مالِ غنیمت آئے گا کہ تم اسے سمیٹ تک نہ سکو گے اور اس کے دو فائدے ہوں گے۔ اولاً بنی قسطورا خوشحال ہو جائیں گے۔ ثانیاً ہمارا تجارتی راستہ بھی محفوظ ہو جائے گا۔ اب تم کہو تمہارا کیا ارادہ ہے۔"

بوڑھا عجیب شش و پنج کی حالت میں تھا۔ فکرمندی سے اس نے پوچھا "کیا ہم بنو ایاد پر قابو پا لیں گے؟"

قصیر نے اسے گھور کر دیکھا۔ "کیا تمہیں مجھ پر اعتماد نہیں؟"

وہ تاجر مالِ غنیمت کے لالچ میں مطمئن ہو گیا اور مسکراتے ہوئے کہا "ایسی کوئی بات نہیں ہمیں آپ پر مکمل اعتماد ہے۔ آپ جو جی میں آئے کریں ہم سب آپ کے ساتھ ہیں۔"

شام سے ذرا پہلے قصیر نے نبوایاد کے نخلستانوں سے ایک فرسنگ دُور کاروان کا پڑاؤ کیا۔ چیدہ چیدہ لوگوں کو بُلا کر اس نے سمجھایا اور مطمئن کر دیا کہ نبوایاد سے کوئی بڑا معرکہ پیش نہیں آئے گا۔ قصیر چونکہ حیرہ میں عمرو کے ہاتھ فی الفور سامانِ تجارت بیچ کر انہیں اپنی ذہانت کا ثبوت دے چکا تھا لہٰذا یہ بھی ایک فطری عمل تھا کہ وہ قصیر پر اس معاملے میں بھی بھروسہ کرتے اور پھر انہیں مالِ غنیمت ہاتھ لگنے کا بھی تو لالچ تھا جس جگہ قصیر نے پڑاؤ کیا یہ وہی جگہ تھی جس کے متعلق اس نے پہلے سے عمرو بن عدی کو اطلاع دے رکھی تھی۔

بنی قسطورا کا تجارتی کاروان ابھی پوری طرح پڑاؤ بھی نہ کر پایا تھا کہ جس جگہ کھجوروں کے جھنڈ میں وہ خیمہ زن ہو رہے تھے اس کے چاروں اطراف سے ریت کے بڑے بڑے ٹیلوں کی اوٹ سے بنی ازد اور نبوایاد کے جوان نمودار ہوئے اور عمرو بن عدی کی سرکردگی میں انہوں نے حملہ کر دیا۔

تجارتی کاروان کے محافظ ابھی سنبھلنے بھی نہ پائے تھے کہ عمرو بن عدی ان کا قتلِ عام کرا چکا تھا۔ قصیر اور اس کے چند جاسوس ساتھی بھاگ کر عمرو کے ساتھ مل گئے تھے سورج جب دُور حدِ نگاہ تک پھیلے ہوئے ریگستانوں پر ایک سنہری چادر سی بکھیرتا ہوا غروب ہونے لگا تو عمرو اور اس کے ساتھی کاروان کو لوٹنے اور سب افراد کو قتل کر دینے سے فارغ ہو چکے تھے۔

عمرو بن عدی اور قصیر نے تجارتی کاروان کا لُوٹا ہوا سارا سامان نبوایاد میں لکھا کاروان کے سارے اونٹ انہوں نے ایک جگہ جمع کیے ان پر اپنے مسلح جوانوں کو سوار کیا اور بنی قسطورا کی طرف روانہ ہوئے۔

وہ بالکل آہستہ آہستہ سفر کر رہے تھے۔ راستے میں ایک جگہ رُک کر انہوں نے آرام کیا اور یوں جب اگلے روز کا سورج طلوع ہو رہا تھا تو عمرو اپنے مسلح جوانوں کے دریائے فرات کے کنارے الزباء کے شہر میں داخل ہو رہا تھا۔ وہ بالکل اس حالت میں سفر کر رہے تھے گویا بنی قسطورا کا تجارتی کاروان حسبِ سابق تجارت سے کافی منافع کما کر لوٹ رہا ہو۔ کاروان کے آگے قصیر تھا اور اس کے پیچھے اپنے مسلح جوانوں کے جھرمٹ میں

عمرو بن عدی تھا۔

الزباء اپنے محل سے باہر شہ نشین پر کھڑی ہو کر اپنے تجارتی قافلے کا استقبال کر رہی تھی اور اس کے اردگرد اس کے قبیلے کے ہزاروں مسلح محافظ کھڑے تھے۔ جب سے کاہنوں نے اُسے کہا تھا کہ تمہاری موت عمرو بن عدی کے ہاتھوں ہوگی اس نے اپنی حفاظت کے لیے مسلح محافظوں کی تعداد بڑھا دی تھی جو ہر وقت اس کے محل کے چاروں طرف چاق و چوبند کھڑے پہرہ دیتے تھے۔

قصیر کے اشارے پر محل کے عین سامنے کاروان رُک گیا پھر وہ اپنا اونٹ عمرو بن عدی کے قریب لایا اور الزباء کی طرف اشارہ کر کے اُس نے سرگوشی میں کہا۔

"وہ سامنے الزباء کھڑی ہے۔ اس کے دائیں طرف بیس گز کے فاصلے پر ایک سرنگ ہے جس کے ذریعے وہ بچ کر نکل سکتی ہے۔ اس سرنگ کا راستہ دریائے فرات کے کنارے ایک پرانے معبد میں جا کر کھلتا ہے جہاں ہر وقت ایک کشتی اور دو سپاہی رہتے ہیں۔ میں اپنے وہ تینوں جاسوس جو اپنے قبیلے سے میرے ساتھ یہاں آئے تھے اس پرانے معبد کی طرف روانہ کر چکا ہوں تاکہ اگر الزباء سرنگ میں داخل ہو کر اس کا آہنی دروازہ گرا دے تو دریا کے کنارے ہمارے آدمی اُسے پکڑنے میں کامیاب ہو جائیں۔ اب آپ بولیں آپ کا کیا ارادہ ہے؟"

عمرو بن عدی نے بھی سرگوشی میں کہا۔

"تم اونٹ سے نیچے اُترو۔ میں اپنے جوانوں کو حملہ آور ہونے کا حکم دینے لگا ہوں۔ تم سیدھے الزباء کے پاس جا کر اس طرف کھڑے ہو جاؤ جہاں سرنگ کا راستہ ہے تاکہ الزباء بھاگنے نہ پائے۔"

عمرو نے اپنی تلوار فضا میں بلند کر کے ایک مخصوص اشارہ اپنے ساتھیوں کو دیا۔ انہوں نے فوراً اونٹوں سے چھلانگیں لگا دیں اور اپنی چمکتی ہوئی تلواریں سونت کر حملہ آور ہوگئے۔ الزباء سارا معاملہ سمجھ گئی اور سرنگ کی طرف بھاگی لیکن قصیر اس کا راستہ روک کر کھڑا ہو گیا۔ اتنی دیر میں عمرو بھی بھاگتا ہوا وہاں پہنچ گیا تھا۔ الزباء نے قہر آلود نگاہوں

سے قصیر کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"تو کیا میں سمجھ لوں کہ تم نے میرے ساتھ بدعہدی اور غدّاری کی ہے"۔

قصیر نے اپنی ننگی اور چمکتی ہوئی تلوار اپنے سامنے لہراتے ہوئے کہا۔

"کیا تم نے بھی جذیمہ کو شادی کے لالچ میں بلا کر قتل کر کے بدعہدی نہ کی تھی" قصیر نے عمرو کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"ادھر دیکھو وہ عمرو بن عدی کھڑا ہے اور تمہارے منجموں کی پیشن گوئی پورا ہونے کا وقت آگیا ہے۔ ہم تم سے کوئی زیادتی نہیں کر رہے صرف تم سے عدی بن نصر اور جذیمہ کے قتل کا قصاص لے رہے ہیں۔"

الزباء نے ایک طرف ہو کر سرنگ کی طرف بھاگنا چاہا لیکن عمرو نے بھاگ کر اس کا راستہ روک لیا اور تلوار مار کر الزباء کی گردن کاٹ دی پھر اس نے الزباء کا کٹا ہوا سر اٹھایا جس سے خون ٹپک رہا تھا اور اپنے اونٹ کے قریب آکر اس نے سر کے سنہری خوب صورت اور لمبے لمبے بال دو حصوں میں تقسیم کر کے رسّی کی مانند انہیں بل دیئے اور پھر وہ کٹا ہوا سر اس نے بالوں کی مدد سے اپنے اونٹ کی گردن میں باندھ دیا پھر وہ اپنے اونٹ پر سوار ہوا اور اپنے لشکر کو جنگ بند کرنے کا حکم دے کر اپنے اپنے اونٹ پر سوار ہونے کے لیے کہا۔ تھوڑی دیر بعد عمرو اور قصیر اپنے لشکر کے ساتھ کوچ کر رہے تھے۔

دریائے فرات کے کنارے کنارے سفر کرتے ہوئے وہ بنو ایاد کے نخلستان میں داخل ہوئے۔ بنو ایاد کے مسلح جوان اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے جب کہ بنو ازد کے سپاہی عمرو کے حکم پر ایک نخلستان میں خیمہ زن ہو گئے۔

عمرو اپنے اونٹ پر اس جگہ آیا جہاں خانہ بدوشوں کا قبیلہ آباد تھا اور جہاں اس کے باپ کی قبر تھی۔ ایک جگہ وہ اپنے اونٹ سے اتر گیا۔ سامنے بنو ایاد کا بوڑھا سردار عطاف بن جابر کھڑا تھا۔ عمرو آگے بڑھا۔ سب خانہ بدوش وہاں جمع ہو گئے تھے ان میں بیچاری پاگل اور دیوانی ربیعہ بھی تھی۔ عمرو نے اپنے اونٹ کی گردن سے بندھے

ہوئے الزباء کے سر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"واوا! ادھر دیکھو میں الزباء کا سر کاٹ لایا ہوں۔ اب تم اپنے سر پہ عمامہ باندھ سکتے ہو۔ میں نے اپنے باپ کا انتقام لے لیا ہے"۔

ربیعہ بھاگ کر آگے بڑھی۔ الزباء کا کٹا ہوا سر اس نے دیکھا پھر قہقہے لگانے لگی زور زور سے وحشت ناک قہقہے جیسے .... جیسے وہ الزباء کے قتل پر بے پناہ خوشی کا اظہار کر رہی ہو۔

الزباء کا سر عدی بن نصر کی قبر کے پاؤں کی طرف زمین میں دبا دیا گیا۔ اسی روز عمرو نے اپنے ہاتھوں سے عطاف کے سر پر عمامہ باندھا اور عمرو کی شادی صفیہ سے ہو گئی۔

سورج غروب ہو جانے کے بعد جب کہ چاند کی صبیح چاندنی میں دن بھر کا تھکا ہارا صحرا جاگ رہا تھا عمرو بن عدی اپنے گھوڑے پر سوار اپنے لشکر کے ساتھ بڑی تیزی سے اپنے قبیلے کی طرف کوچ کر رہا تھا، اس حالت میں کہ وہ خانہ بدوش، حسین اور ساحرہ انداز صفیہ اس کے گھوڑے پر اس کے پیچھے بیٹھی ہوئی تھی۔ اب وہ اس کی بیوی جو تھی۔

ہر طرف خوشی اور انبساط کی لہریں بکھر گئی تھیں جیسے .... جیسے برسوں کا پیاسا صحرا عدی بن نصر کا انتقام مکمل ہونے پر تر و تازہ ہو کر مسکرا اٹھا ہو اور نخلستانوں کے اکناف میں صحرا کے گیت بکھر گئے تھے لیکن .... لیکن ربیعہ جو پاگل ہو گئی تھی اسے اب بھی اپنے حبیب اور منسوب عدی بن نصر کا انتظار تھا جس کی قبر بنی ایاد کے نخلستانوں میں تھی اور روح تپتے صحراؤں کے اندر فطرت کے خشمگیں عناصر کی جنگ میں بھٹک رہی تھی۔

خانہ بدوش

اسلم راہی ایم۔اے

○

وقار عظیم
پاکستانی پوائنٹ
ڈاٹ کام

خانہ بدوش ترکوں کا ایک بہت بڑا گروہ مشرقی اناطولیہ کے صوبہ میں جھیل وآن کے کنارے کنارے جنوب سے شمال کی طرف بڑھ رہا تھا۔ آگے آگے خانہ بدوشوں کا سردار تھا۔ اس کی داڑھی سفید تھی، وہ ایک معمر بزرگ تھا لیکن جسمانی ساخت میں ابھی چوبند اور چہرے سے خوب توانا لگتا تھا۔ اس کے پیچھے پیچھے اس کے مسلح سوار تھے جن کے پیچھے اَن گنت خچریں تھیں جن پر قبیلے کا سامان لدا تھا اور ان پر قبیلے کی عورتیں، بچے اور بوڑھے بیٹھے ہوئے تھے۔ ان خچروں کے پیچھے پھر مسلح سوار تھے۔ خچروں کے گلے میں بڑے بڑے جرس بندھے تھے جن کی نغمہ شیریں اور نوائے مطربہ جیسی آوازیں کوہستانوں کے اندر دور دُور تک بکھر رہی تھیں۔ سب سے پیچھے بھیڑ بکریوں، اونٹوں اور گھوڑوں کا ریوڑ تھا جسے ترک سوار ہانک رہے تھے۔

خانہ بدوش سفر کرتے رہے۔ کوہستانوں کے بیچوں بیچ گزرنے والے اس راستے کے دونوں جانب جس پر وہ خانہ بدوش سفر کر رہے تھے بلند و بالا کوہستانی چوٹیاں جو بھولوں

سے لدی ہوئی تھیں الف لیلوی شہزادیوں کی طرح لطافت وسطوت اور زمینی خلد کی حُوروں کی مانند نزاکت و تمکین کے ساتھ کھڑی تھیں۔ کوہستانوں کے اندر بل کھا کر شمال کی طرف جاتی ہوئی وہ شاہراہ پُرانی داستانوں کے امین اور قدیم آساتیر کے ہمراز کی طرح چپ اور خاموش تھی۔

خانہ بدوش جب اور آگے بڑھے تو انہوں نے دیکھا ہر طرف تباہی اور بربادی کا سماں تھا۔ دُور دُور تک نظر آتی ہوئی بستیاں اُجری پڑی تھیں، لگتا تھا کسی حملہ آور نے انہیں آگ لگا کر تباہ کر دیا ہو۔ خانہ بدوش تُرک مسلمان تھے۔ ان اُجڑی آبادیوں اور ویران بستیوں کو دیکھ کر جو مسلمانوں کی تھیں اُداس اور پریشان ہو گئے تھے۔ جب وہ آگے بڑھتے اور شمال کی طرف گئے تو انہوں نے دیکھا وہاں جو مسلمانوں کا شہر تنج تھا وہ بھی سارا اُجڑا پڑا تھا۔ مکان تباہ ہو کر ملبہ کی صورت اختیار کر گئے تھے۔ جہاں کبھی پُر رونق اور آباد شہر تھا وہاں اب ویرانی اور پُر ہول سناٹا تھا۔

شہر کے ملبے کے اندر سردار نے اپنے قبیلے کو روک دیا اور وہ اپنے گھوڑے سے اُتر کر شہر کے ملبے کو ایک حسرت اور تاسف کے ساتھ دیکھنے لگا تھا۔ اس کے ساتھ پہلو بہ پہلو سفر کرتے ہوئے چند اور سوار بھی اپنے گھوڑوں سے اُتر کر اپنے سردار کے اطراف میں کھڑے ہو گئے تھے۔ ان میں خانہ بدوشوں کا نائب سالار بھی تھا۔

وہ بھرے جسم کا خوب دراز قد اور کڑا جوان تھا۔ اس کے ہاتھ پتھر و فولاد کی طرح سنگین، ڈنڑ اور بازو خوب سڈول اور بھرے بھرے تھے۔ اس کی داڑھی چھوٹی چھوٹی اور بھوری تھی اور اس کی آنکھوں میں سمندر کی سی گہرائی اور نیلاہٹ تھی۔

ملبے کو دیکھ کر اس کے چہرے پر جابر و قاہر جذبے بکھر گئے تھے، لگتا تھا وہ قضا کا کوئی فرشتہ ہو جسے کائنات کی قطع و برید کے لیے وہاں نازل کیا گیا ہو۔ اسی اثنا میں خانہ بدوشوں کے سردار افرائیم نے اپنے نائب سردار کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"اسمٰعیل! اسمٰعیل! کیا تم بتا سکتے ہو ان مسلمان بستیوں اور شہروں کو کیا ہُوا؛ کیا ان پر کوئی عذاب ٹوٹا یا کسی حملہ آور نے ان آباد بستیوں کو ویرانوں میں بدل دیا ہے"

خانہ بدوشوں کا نائب سردار جس کا نام اسمٰعیل تھا طوفانی رات کے ٹھٹھرے سکوت کی طرح خاموش کھڑا اپنے سامنے اُجڑے شہر کو بڑے فگار اور مجروح انداز میں دیکھ رہا تھا۔ اسے خاموش دیکھ کر سردار نے پھر کہا۔ "اے میرے مہربان و بے نظیر انسان! تمہاری خاموشی ہم سب کے لیے تکلیف دہ ہے۔" اسمٰعیل نے سر گھما کر اپنے سردار کی طرف دیکھا کچھ ایسے انداز میں گویا کوئی طوفان بیدار ہو رہا ہو یا کسی خوابیدہ اژدہے نے اپنا سر اُٹھا کر کسی کی طرف دیکھا ہو۔

اسمٰعیل اپنے بوڑھے سردار افرائیم سے کچھ کہنے والا تھا کہ ان کے قریب ہی ملبے کے اندر سے ایک بوڑھی خاتون اُٹھی اور آہستہ آہستہ اُن کی طرف بڑھی۔ اسمٰعیل کچھ کہتے کہتے رُک گیا تھا۔ وہ بوڑھی عورت قریب آئی اور انہیں مخاطب کر کے اس نے پوچھا۔ "تم لوگ کون ہو اور یہاں رُک کیوں گئے ہو؟"

اسمٰعیل چند قدم آگے بڑھا اور مؤدب ہو کر اس نے پوچھا۔ "اے خاتونِ محترم! کیا تم بتا سکو گی کہ مسلمانوں کے اس شہر اور بستیوں کی شہر سدوم[1] جیسی حالت کس نے کی؟"

بوڑھی خاتون جو خزاں گزیدہ پتی کی طرح اُداس اور افسردہ ہو گئی تھی نوحہ کرتی ہوئی آواز میں بولی۔ "مسلمانوں کے اس شہر اور بستیوں پر قسطنطنیہ کے عیسائی بادشاہ ارمانوس نے چند دن پہلے حملہ کر دیا تھا۔ اپنے لشکر کے ساتھ ارمانوس نے مسلمانوں کے شہروں اور بستیوں کو لوٹ کر آگ لگا دی اور ہزاروں مسلمان مرد عورتوں کو قیدی بنا کر وہ اپنے ساتھ قسطنطنیہ لے گیا ہے۔ میں، میرا شوہر اور ہماری دو جوان بیٹیاں اپنے گھر کے تہ خانے میں چھپ کر اس تباہی اور ہولناکی سے بچ گئے تھے لیکن شاید ہمارا خدا ہم پر خوش نہ تھا۔ جب ارمانوس اپنے لشکر اور مسلمان قیدیوں کو لے کر چلا گیا تو اس کے تین روز بعد ہم

---

[1] حضرت لوط علیہ السلام کا ایک شہر جس کے مکین گناہوں کی دلدل میں پھنس گئے تھے۔ جس پر خدا کا عذاب اِس شہر پر نازل ہُوا اور فرشتوں نے اس شہر کو اُٹھا کر اُلٹ دیا تھا۔

اپنے تہ خانے سے نکلے۔ ہماری بدقسمتی کہ ایک عیسائی تاجر نے اپنے چند محافظوں کے ساتھ اس ملبے کے اندر پڑاؤ کر رکھا تھا۔ شاید وہ ملبے کے اندر مسلمانوں کا قیمتی اثاثہ تلاش کرنے کی کوشش کر رہے تھے لیکن اسے کچھ نہ ملا کیونکہ ارمانوس پہلے ہی سب کچھ لُوٹ چکا تھا۔ وہ سنگدل تاجر میری دونوں بیٹیوں کو مجھ سے چھین کر لے گیا۔" وہ بوڑھی عورت اس سے آگے کچھ نہ کہہ سکی اور سسکیاں لے لے کر رونے لگی تھی۔

اسمٰعیل نے اس کی ڈھارس بندھاتے ہوئے کہا۔ "صبر کرو خاتون! صبر! یہ بتاؤ وہ تاجر کدھر سے آیا تھا اور کہاں گیا"۔ خاتون نے اپنے آپ کو سنبھالتے ہوئے کہا۔

"یہ علاقہ چونکہ مسلمانوں اور عیسائیوں کی سرحد پر واقع ہے لہٰذا دونوں قوموں کے کارواں اِدھر سے گزرتے رہتے ہیں۔ وہ تاجر جو میری بیٹیاں مجھ سے چھین کر لے گیا ہے وہ کندیرہ کی طرف سے آیا تھا اور قسطنطنیہ کی طرف گیا ہے۔ وہ کہہ رہا تھا قسطنطنیہ کے بازار میں وہ میری دونوں بیٹیوں کو فروخت کر کے رقم وصول کرے گا۔ اس کی روانگی کے بعد میرا شوہر بھی اس کے تعاقب میں جا چکا ہے اس اُمید پر کہ شاید وہ اپنی بیٹیوں کو کسی طور اپنے ساتھ واپس لانے میں کامیاب ہو جائے۔ کیا تم میں کوئی ایسا ہے جو اس کام میں میرے شوہر کی مدد کرے اور میری جوان بیٹیوں کو مجھے واپس لا کر دے۔ میں اس شہر کا نوحہ کرنے کو اکیلی رہ گئی ہوں۔ یہاں اب میرا کوئی پُرسانِ حال نہیں ہے۔

اسمٰعیل نے چھاتی تانتے ہوئے کہا۔ "اے خاتون! میں تمہیں تمہاری بیٹیاں واپس کر دوں گا۔ میں ان کی تلاش میں قسطنطنیہ جاؤں گا۔ تم کہو تمہارے شوہر اور بیٹیوں کے نام کیا ہیں"۔

بوڑھی عورت نے پُرامید نگاہوں سے اسمٰعیل کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "میری بیٹیوں کے نام خیسارا اور رصافہ ہیں اور دونوں کی شکل کافی حد تک آپس میں ملتی ہے۔ میرے شوہر کا نام ابو دلامہ ہے۔ اس کی داڑھی ساری سفید ہے۔ کمر قدرے جھکی ہوئی ہے اور دائیں رخسار پر ایک لمبے زخم کا نشان بھی ہے"۔

اسمٰعیل مڑا اور اپنے بوڑھے سردار افرائیم کی طرف دیکھتے ہوئے اس نے کہا

"اے سردار! میں اس بوڑھی خاتون کی بیٹیوں کو واپس لانے کا عزم کر چکا ہوں کیا تمہیں اس پر کوئی اعتراض ہے۔ اس کے علاوہ میں وہاں مسلمان قیدیوں کا جائزہ لوں گا اور پھر کسی مسلمان حکمران سے ہم التماس کریں گے کہ وہ ان کی رہائی کا بندوبست کرے۔"

سردار نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔ "اے اسمٰعیل! میں تمہارے اس جذبے کی قدر کرتا ہوں۔ میں اس بوڑھی خاتون کو اپنے ساتھ لے جاؤں گا۔ ہم یہاں سے سیدھا طرابزون شہر کی طرف جائیں گے اور ایک ماہ تک وہاں رُک کر تمہارا انتظار کریں گے اور اگر تم نہ آئے تو ہم کی طرف بڑھتے ہوئے آذربائیجان جائیں گے۔ وہاں بھی ہم ایک ماہ رُکیں گے اس کے بعد کوہستان قفقاز کو عبور کر کے ہم بحیرہ قزوین کے کنارے کنارے انتہائی شمال کی طرف بڑھتے ہوئے دریائے وولگا کے کنارے اس جگہ پڑاؤ کریں گے جہاں دریائے ڈان ایک طویل خم کھا کر دریائے وولگا کے قریب ہوتا ہے۔ وہاں وسیع چراگاہیں اور گھاس کے کھلے میدان ہیں اور تمہاری آمد تک ہم وہیں رکے رہیں گے۔"

اسمٰعیل نے اپنے گھوڑے کی باگ تھامی، ایک جست کے ساتھ وہ اس پر سوار ہوا اور افرائیم کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "اے سردار! میں اپنی منزل کی طرف روانہ ہوتا ہوں"۔ بوڑھے سردار نے بڑی شفقت اور ملائمیت میں کہا۔ "تم اکیلے نہیں جاؤ گے"۔ پھر اس نے اپنے قریب کھڑے دو جوانوں کو مخاطب کر کے کہا۔ "یوسف اور موسیٰ تم دونوں بھی اسمٰعیل کے ساتھ جاؤ۔"

وہ دونوں جوان اپنے گھوڑوں کو آگے بڑھا کر اسمٰعیل کے قریب کھڑے ہو گئے تھے۔

اتنے میں وہ بوڑھی خاتون آگے بڑھی اور اسمٰعیل سے کہا۔ "اے بیٹے! کیا اس کاروان میں تمہارا کوئی رشتہ دار نہیں اور روانگی سے قبل تم ان سے ملو گے نہیں"۔

اسمٰعیل نے دُکھ سے کہا۔ "میں اپنے ماں باپ کا اکلوتا بیٹا ہوں اور میرے ماں باپ اپنی طبعی موت مر چکے ہیں۔ یہ سردار صرف میرا سردار ہی نہیں، میرا چچا بھی ہے۔ اب یہی میرا باپ اور یہی میری ماں ہے۔ یہ جو دو جوان میرے ساتھ روانہ ہو رہے ہیں دونوں میرے چچا زاد بھائی اور سردار کے بیٹے ہیں ——— خاتون! تم میرے قبیلے کے

یہاں سے کوچ کر جاؤ۔ ہم تمہاری بیٹیوں کو ضرور تمہارے پاس لے کر آئیں گے۔"

اس کے ساتھ ہی اسمٰعیل نے اپنے گھوڑے کو ایڑ لگا کر جنوب مغرب کی طرف بڑھا دیا۔ موسیٰ اور یوسف بھی اس کے ساتھ ہو لیے تھے۔ افرائیم کے کہنے پر ایک جوان نے اس بوڑھی خاتون کو ایک خچر پر سوار کرا دیا اور وہ خانہ بدوش ایک بار پھر شمال کی طرف بڑھنے لگے تھے۔

ایک روز جب کہ دُور مغرب کی پرفشاں ظلمتوں میں سورج اپنے رنگ و بُو کی بساط اور نشیلے افسانوں کے دامن کو سمیٹتا ہوا غروب ہو رہا تھا۔ اسمٰعیل اپنے دونوں چچا زاد بھائیوں یوسف اور موسیٰ کے ساتھ سنہری دروازے کے راستے قسطنطنیہ میں داخل ہو رہا تھا۔ وہ عیسائی پادریوں کے لباس میں تھے اور ان کے گلے میں صلیبیں لٹک رہی تھیں۔

اپنے گھوڑوں کو آہستہ آہستہ ہانکتے ہوئے وہ آگے بڑھے۔ قسطنطین کی دیوار کے نیچے سے گزرتے ہوئے وہ شہر کے اس چوک پر آئے جہاں ایڈریانوپل نام کی شاہراہ شہر سے باہر نکلتی تھی۔ اسی چوک سے ایک سڑک بائیں ہاتھ نکل کر اور پھر دائیں طرف گھوم کر ہپوڈروم کے میدان کے سامنے سے گزرتی ہوئی ایا صوفیہ کے گرجا کی طرف چلی گئی تھی۔ جب کہ اسی سڑک سے ایک اور سڑک ہپوڈروم کی پچھلی سمت سے ہوتی ہوئی سرجیوس کے گرجا کے سامنے سے گزر کر شاہی محلات کی طرف چلی گئی تھی۔

وہ تینوں اسی سڑک پر چڑھ گئے جو ایا صوفیہ کے گرجا کی طرف جاتی تھی۔ رات بسر کرنے کے لیے انہوں نے ہپوڈرم کے خونی میدان اور ایا صوفیہ کے سامنے ایک سرائے میں قیام کر لیا تھا۔

دوسرے روز وہ شہر کے وسطی حصے کے اس بازار میں گئے جس میں لونڈی و غلاموں کی خرید و فروخت ہوتی تھی۔ وہ تینوں ایک دکان میں داخل ہوئے۔ اندر ایک بوڑھا بھائی نیلے رنگ کی ایک گدی پر بیٹھا اونگھ رہا تھا۔ اسمٰعیل نے اسے مخاطب کر کے کہا۔ "میرے محترم! کیا پچھلے چند روز میں دو ایسی لڑکیاں اس بازار میں بکنے آئی

ہیں جن کی شکل آپس میں ملتی ہو۔" اس بوڑھے نے چونک کر کہا۔ "چند روز قبل ایک بوڑھا بھی اِن لڑکیوں کے متعلق پوچھنے آیا تھا۔ مَیں نے اسے بھی یہی کہا تھا کہ مجھے ان لڑکیوں کے متعلق کوئی علم نہیں۔" اسمٰعیل نے بڑے تجسّس سے پوچھا۔ "وہ بوڑھا کب تمہارے پاس آیا اور کیا تم جانتے ہو اس وقت وہ کہاں ہوگا؟"

وہ دکاندار اُٹھ کر باہر آیا اور بازار کے وسط میں ایک سرائے کی طرف ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے اس نے کہا۔ "وہ بوڑھا اس سرائے میں ٹھہرا ہوا ہے۔ میرا خیال ہے وہ ابھی تک اسی سرائے میں ہوگا تاہم اب وہ لڑکیوں کے متعلق پوچھنے اس بازار میں نہیں آتا۔" اسمٰعیل نے اس دکاندار سے کچھ نہ کہا اور اپنے ساتھیوں کے ساتھ وہاں سے ہٹ کر وہ اس سرائے کی طرف جا رہا تھا جس کی طرف دکاندار نے اشارہ کیا تھا۔

سرائے کے احاطے میں داخل ہونے کے بعد جب وہ سرائے کی عمارت میں داخل ہونے لگے تو اچانک اسمٰعیل نے اپنے ساتھیوں کو روک لیا۔ اس نے دیکھا اصطبل میں ایک بوڑھا اپنے گھوڑے پر زین ڈال رہا تھا۔ اپنے گھوڑے کی باگ اسمٰعیل اس طرف آیا۔ یوسف اور موسیٰ اس کے ساتھ ساتھ تھے۔ قریب آکر اسمٰعیل نے دیکھا اس بوڑھے کی ساری داڑھی سفید، کمر جھکی ہوئی اور دائیں رخسار پر ایک لمبے زخم کا نشان تھا۔

اسمٰعیل نے قریب ہو کر اس بوڑھے سے کہا۔ "کیا آپ کو خیسار اور رصافہ کی تلاش ہے؟" بوڑھے نے چونک کر پوچھا۔ "تم نے کیسے جانا مجھے خیسار اور رصافہ کی تلاش ہے؟" اسمٰعیل نے مسکرا کر کہا۔ "مجھے تو یہ بھی علم ہے آپ کا نام ابودلامہ ہے اور آپ اپنی دونوں بیٹیوں کی تلاش میں قسطنطنیہ شہر میں داخل ہوئے ہیں۔"

بوڑھے نے اور زیادہ حیرت زدہ ہوتے ہوئے کہا۔ "ہاں میرا نام ابودلامہ ہے اور مَیں اپنی بیٹیوں کی تلاش میں آیا ہوں۔ پر از برائے خدا یہ تو کہو، تم کون ہو؟ اور میرے حالات کا تمہیں کیسے علم ہوا؟" اسمٰعیل اس سے اور قریب ہوا اور سرگوشی میں اسے پوری داستان سُنا دی۔

بوڑھے ابودلامہ نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔ "یہ انکشاف میرے لیے اطمینان بخش ہے کہ تم تینوں مسلمان ہو۔ مَیں تمہیں تمہاری اس جرأت پر مبارک باد دیتا ہوں کہ تم ایک نیک مقصد

[...]ت دشمن کے شہر میں داخل ہوئے ہو۔ پر میری بیٹیاں ایسی جگہ پہنچ چکی ہیں جہاں سے [...]کی رہائی اب ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے۔ مَیں آج یہاں سے واپسی کا ارادہ کر چکا تھا۔ اسی [...] اپنے گھوڑے پر زین ڈال رہا تھا۔"

اسمٰعیل نے آگے بڑھ کر ابودلامہ کے دونوں شانے تھامتے ہوئے کہا۔ "کیا تم [...]ی بیٹیوں کو تلاش کر چکے ہو؟ اگر ایسا ہے تو بتاؤ وہ کہاں ہے۔ ہم انہیں ضرور وہاں سے [...]کال لے جانے کی کوشش کریں گے۔" ابودلامہ نے پژمردہ سی آواز میں کہا۔ "اس شہر میں داخل [...]ہو کر چند روز تک مَیں انہیں اس بازار میں تلاش کرتا رہا جہاں غلاموں کا کاروبار ہوتا ہے لیکن [...]مجھے کوئی کامیابی نہ ہوئی۔ ایک روز ایک دکاندار نے مجھے بتایا کہ شمال مشرق سے آنے والے [...]اجر نے اس کے ہاتھ دو ایسی لڑکیاں فروخت کی تھیں جو دونوں بہنیں تھیں اور ان کی شکل [...]کافی حد تک آپس میں ملتی تھی۔ اس دکاندار نے یہ بھی بتایا کہ اس نے ایک معقول منافع پر اُن [...]دونوں لڑکیوں کو شہر کے ایک رئیس کے ہاتھ فروخت کر دیا ہے۔"

اسمٰعیل نے بیتاب ہو کر کہا۔ "ابودلامہ! تم نے غلطی کی تمہیں چاہیئے تھا اس دکاندار [...]سے اس رئیس کا پتہ پوچھتے جس کے ہاتھ اس نے خیسار اور رصافہ کو فروخت کیا تھا۔ اس طرح [...]تم تمہاری دونوں بیٹیوں کو وہاں سے نکال لینے میں کامیاب ہو سکتے تھے۔" ابودلامہ نے [...]مطمئن انداز میں کہا۔ "مَیں نے صرف پتہ ہی نہیں پوچھا اس رئیس کی حویلی کے اندر اپنی [...]بیٹیوں کو بھی دیکھ چکا ہوں۔ اس کے علاوہ مَیں نے اس تاجر کی حویلی بھی دیکھی ہے جو میری بیٹیوں [...]کو اٹھا لایا تھا۔ مَیں نے ارادہ کیا تھا کہ اس تاجر کو قتل کر دوں گا لیکن میں ایسا کرنے میں بھی کامیاب [...]نہ ہوا، مایوس ہو کر لوٹ جانے کو تھا کہ تم مل گئے ہو۔"

اسمٰعیل نے دلامہ کا ہاتھ تھامتے ہوئے کہا۔ "ابودلامہ! تم ہمارے ساتھ آؤ۔ ہم [...]تمہاری دونوں بیٹیوں کو رہا کرانے کے علاوہ اس تاجر سے بھی انتقام لیں گے جو تمہاری دونوں [...]بیٹیوں کو زبردستی اٹھا لایا تھا۔ تم صرف اُن کی رہائش تک ہماری راہنمائی کر دینا اس کے بعد ہم ان [...]سے نمٹیں گے۔ یہاں رُکنے کے بجائے اب تم ہمارے ساتھ قیام کرو گے۔" اسمٰعیل اپنے [...]ساتھیوں کے ساتھ ابودلامہ کو لے کر اس سرائے کی طرف روانہ ہو گیا جس میں وہ ٹھہرے

ہوئے تھے ۔

اس روز ان تینوں نے بوڑھے ابو ولامہ کو ساتھ لے جا کر تاجر کی حویلی کے علاوہ ان دونوں رئیسوں کی رہائش بھی دیکھ لی تھی جن کے ہاں ابو ولامہ کی بیٹیاں تھیں ۔ جب رات ہوئی اور شہر کے گلی کوچے سنسان اور دریچے مقفل ہونے لگے تو وہ تینوں سرائے سے نکلے اور بڑی رازداری سے شہر کے جنوب مغربی حصے کی طرف بڑھنے لگے تھے ۔ شہر کی فصیل کے قریب سینٹ میری کے گرجا کے عین سامنے وہ ایک حویلی کے مقابل رک گئے ۔

اسمٰعیل نے حویلی کا دروازہ دبا کر دیکھا وہ اندر سے بند تھا ۔ اس نے یوسف اور موسیٰ سے سرگوشی کرتے ہوئے کہا ۔ "میرے پیچھے پیچھے آؤ" کوئی آواز اور کھٹکا نہ پیدا ہونے دینا ۔ اسمٰعیل نے چہرے پر نقاب ڈال لیا اور دیوار پھاند کر اندر کود گیا ۔ اس کے پیچھے پیچھے یوسف اور موسیٰ بھی اپنے چہروں پر نقاب ڈال کر دیوار پھاند گئے تھے ۔ اندر جا کر تینوں نے اپنی کمر پر بندھی ہوئی اپنی اپنی ڈھال سنبھال لی اپنی تلواریں بھی بے نیام کر لی تھیں ۔ اس بے چاند اور اندھیری رات میں صحن عبور کر کے وہ حویلی کے اندر چلے گئے تھے ۔

حویلی کے صرف دو کمروں میں روشنی ہو رہی تھی ۔ اسمٰعیل نے ایک کمرے کا دروازہ اندر دبا کر کھولنا چاہا لیکن وہ رک گیا کیونکہ کمرے کے اندر سے ایک نسوانی آواز سنائی دی تھی ۔ آواز کسی نوخیز لڑکی کی تھی اور وہ انجیل پڑھ رہی تھی ۔ اسمٰعیل نے دروازے سے ہاتھ ہٹا لیا اور اپنے ساتھیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے وہ دوسرے کمرے کی طرف بڑھا ۔ اس کمرے کا دروازہ نیم وا تھا ۔ اسمٰعیل نے اندر جھانک کر دیکھا کمرے میں ایک بوڑھا اور ایک خوب تنومند جوان ایک روغنی چراغ کی روشنی میں چوسر کھیل رہے تھے اور ان کے قریب شراب کے خالی برتن پڑے تھے ۔

اسمٰعیل نے مڑ کر یوسف اور موسیٰ سے سرگوشی کرتے ہوئے کہا ۔ "تم دونوں یہیں کھڑے ہو کر چوکس رہنا ۔ ان کی مدد کے لیے کوئی اور آئے تو اس کمرے سے باہر ہی اس سے نمٹ لینا ۔"

یوسف اور موسیٰ چوکس کھڑے ہو گئے ۔ اسمٰعیل بھاگ کر کمرے میں داخل ہوا اور ان کے وہ دونوں سنبھل کر کوئی دفاعی قدم اٹھاتے اسمٰعیل نے اپنی پوری خصومت اور ۔۔۔ت میں شوریلی اور دھاڑتی ہوئی آواز میں کہا ۔ "تم میں سے کسی ایک نے بھی کوئی ۔۔۔حرکت کرنے کی کوشش کی تو یاد رکھنا میری تلوار اس کی گردن کے اندر سے گزر جائے ۔۔۔ بوڑھا خوف سے کانپنے لگا تھا لیکن اس نوجوان نے اپنی ہمت اور شجاعت کو مجتمع کرتے ۔۔۔ے پوچھا ۔ "تم کون ہو ؟ اس حویلی میں رات کے اس وقت کیوں گھسے ہو اور ہم سے کیا ۔۔۔تے ہو ؟"

اسمٰعیل نے غصیلے لہجے میں اس جوان سے کہا ۔

"تم خاموش رہنا ۔ مجھے اس بوڑھے سے بات کرنے دو ۔ اگر تم نے پھر دخل اندازی ۔۔۔تو میرا ہاتھ ہتھوڑے کی طرح تم پر برسے گا ۔"

وہ جوان خاموش ہو گیا ۔ اسمٰعیل نے اس بوڑھے کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا ۔ "۔۔۔کچھ میں پوچھوں سچ کہنا ۔ ورنہ میرے ہاتھوں قبل از وقت مارے جاؤ گے ۔ یہ بتاؤ ۔۔۔تاجر ہو ؟" بوڑھے نے کپکپاتی آواز میں کہا ۔ "ہاں میں تاجر ہوں ۔"

"کیا تم نے پچھلے دنوں کندیرہ سے قسطنطنیہ کی طرف سفر کیا تھا ؟" بوڑھے ۔۔۔اثبات میں سر ہلا دیا تھا ۔ اسمٰعیل نے اس بار غضب ناک ہو کر پوچھا ۔ "کیا تم نے ینج ۔۔۔کے بلے سے دو لڑکیوں کو لا کر قسطنطنیہ کے بازار میں بیچا تھا ؟"

اس بار اسی جوان نے اپنی غصیلی آواز میں پوچھا ۔ "تم کون ہو ہم سے ایسے ۔۔۔ل گفتگو کرنے والے ۔ ہم تمہارے کسی سوال کے پابند نہیں ہیں ۔" اسمٰعیل نے اپنی ۔۔۔بائیں ہاتھ میں لی اور دائیں ہاتھ کا ایک ایسا سخت گھونسہ اس جوان کے چہرے پر ۔۔۔وہ لڑکھڑا کر دور جا گرا اور اس کے منہ سے خون بہہ نکلا ۔

اسمٰعیل نے دھاڑتے ہوئے کہا ۔ "تم سے کہا نہ تھا چپ رہنا ورنہ میرا ہاتھ تم ۔۔۔ڑے کی طرح برسے گا ۔ اے جوان ہر کسی میں اتنی استطاعت نہیں کہ میری ضرب ۔۔۔لہ استقامت کے ساتھ کھڑا ہو سکے ۔ میری ایک ہی ضرب سے تمہارے منہ

سے خون بہہ نکلا ہے۔ یاد رکھو اگر تم نے پھر میری خواہش کے خلاف کوئی حرکت کی تو میری دوسری ضرب تمہاری ساری ہوش اور یادداشت چھین لے گی۔" وہ جوان خوفزدہ نگاہوں سے اسمٰعیل کی طرف دیکھنے لگا اور وہیں بیٹھا بیٹھا اپنا جبڑا سہلانے لگا تھا۔

اسمٰعیل جب دوبارہ اس بوڑھے تاجر کی طرف متوجہ ہوا تو اسمٰعیل کے کچھ کہنے سے قبل ہی وہ کپکپاتے ہوئے بول پڑا۔ "ہاں میں نے دو لڑکیوں کو وہاں سے اٹھا کر قسطنطنیہ کے بازار میں بیچا تھا۔" ———— قہر آلود نگاہوں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے اسمٰعیل نے پوچھا "کیا تجھے خبر نہ تھی کہ ان لڑکیوں کی پاسبانی اور حفاظت کی خاطر کوئی تم سے بازپرس کرنے بھی آئے گا۔ لڑکیوں کو بیچ کر جس قدر رقم تم نے حاصل کی تھی اس سے چار گنا رقم میرے حوالے کرو ورنہ میری تلوار اٹھ کر برسے گی اور تمہارے لہو سے اس فرش کو رنگین کر دے گی۔"

بوڑھا تاجر کانپتا ہوا لکڑی کے ایک صندوق کی طرف بڑھا اور نقدی کی ایک تھیلی نکال کر اس نے اسمٰعیل کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ "یہ رکھ لو چار گنا تو کیا اس میں اس رقم سے چھ گنا زیادہ ہوگی جو میں نے ان لڑکیوں کو بیچ کر حاصل کی تھی۔" اسمٰعیل نے نقدی کی وہ تھیلی لے لی پھر اس نے بے ساختہ و برجستہ کہا۔ "اے متبذل و حقیر انسان اس رقم سے تو میں ان دونوں لڑکیوں کو آزاد کرانے کی کوشش کروں گا لیکن تجھے تیرے گناہ تیری بدعملی اور تیرے قبیح فعل کی سزا ضرور دوں گا۔" اس کے ساتھ ہی اسمٰعیل نے اپنی تلوار فضا میں بلند کر کے گرائی اور اس تاجر کے جسم کو ککڑی کی طرح کاٹ کر رکھ دیا۔ اسی لمحہ فرش پر بیٹھا ہوا جوان اٹھ کر بھاگا۔ کھڑکی کھول کر وہ باہر کودا اور زور زور سے شور کرتا ہوا وہ لوگوں کو مدد کے لیے پکارنے لگا تھا۔

اسمٰعیل بھاگتا ہوا کمرے سے باہر نکلا اور اپنے دونوں ساتھیوں کو مخاطب کر کے اس نے کہا۔ "یہاں سے اب بھاگ چلو، میں اپنا کام ختم کر چکا ہوں قبل اس کے اردگرد کے لوگ یہاں جمع ہو جائیں ہمیں یہاں سے نکل جانا چاہیئے۔"

جب وہ حویلی کے بیرونی حصے کی طرف بھاگ رہے تھے تو ایک لڑکی اسی کمرے سے نکلی جس کمرے سے انہیں انجیل کی تلاوت کرتی نسوانی آواز سنائی دی تھی۔

[...]ی چند لمحوں تک حیرت سے ان تینوں کو بھاگتے ہوئے دیکھتی رہی پھر وہ کمرے [...]اخل ہوئی اور بوڑھے تاجر کی لاش سے لپٹ لپٹ کر رونے لگی تھی۔

تینوں جب حویلی کی دیوار پھاند کر باہر کودے تو انہوں نے دیکھا۔ وہاں [...]ے میں اس نوجوان کے شور کرنے پر کافی لوگ جمع ہو گئے تھے۔ شہر کے اندر گشت کرنے [...]ے کچھ محافظ بھی آ گئے تھے۔ حویلی کے باہر اتنے لوگوں کو جمع دیکھ کر وہ بدحواس ہو [...] تھے۔ اسمٰعیل فوراً پلٹا دیوار پھاند کر وہ دوبارہ حویلی کے اندر چلا گیا تھا موسیٰ بھی اس کے [...]ہ ہو لیا تھا۔ یوسف بھول گیا تھا کہ ان تینوں کو اکٹھا رہنا چاہیئے۔ اپنی جان بچانے [...]لیے وہ دائیں طرف کی ایک گلی میں گھس کر بھاگ نکلا۔ شہر کے مسلح محافظ اس کے [...]ے لگ گئے تھے۔ اسمٰعیل اور موسیٰ حویلی کے پچھواڑے کی طرف گئے اور وہاں سے دیوار [...]کر بھاگ نکلنے میں کامیاب ہو گئے تھے۔

قسطنطنیہ کے گلی کوچوں میں بھاگتے ہوئے وہ ادھر آئے جہاں سے ایڈریانوپل [...]اہراہ شہر سے باہر نکلتی تھی۔ وہاں بھی وہ ایک دیوار پھاند کر ایک بڑی حویلی میں داخل [...]ے۔ چند ثانیوں تک وہ حویلی کے اندرونی حصے میں گھومتے رہے پھر انہوں نے [...]ا ایسے کمرے کے دروازے پر دستک دی جس میں روشنی ہو رہی تھی۔ تھوڑی دیر [...]ایک درمیانی عمر کے مرد نے دروازہ کھولا۔ اسمٰعیل نے اپنی ننگی اور خون آلود تلوار [...]ے سامنے لہراتے ہوئے کہا۔ "کیا پچھلے چند یوم میں تم نے بازار سے دو ایسی لڑکیوں [...]ی ہے جن کے نام نیسارا اور رصافہ ہیں۔ یاد رکھو! اگر تم نے جھوٹ بولا تو میں تمہاری [...]کاٹ دوں گا۔"

درمیانی عمر کے اس رئیس نے کپکپاتی آواز میں کہا۔ "ہاں، میں نے انہیں [...]تھا۔ میں ان دونوں سے شادی کرنا چاہتا تھا لیکن وہ اس کے لیے تیار نہیں ہیں [...]نے انہیں اپنی حویلی کے ایک کمرے میں بند کر رکھا ہے۔"

اسمٰعیل نے اپنی تلوار کی نوک اس رئیس کی گردن پر رکھتے ہوئے کہا۔ "ان لڑکیوں [...]کر دو" ورنہ میں تمہارے جسم سے تمہاری روح کو آزاد کر دوں گا۔" وہ رئیس خوف

سے کانپتا ہوا باہر آیا۔ اپنے لباس کے اندر سے اس نے چابی نکالی اور ایک کمرے کا دروازہ کھول دیا۔ اندر بے بسی کی حالت میں دو لڑکیاں فرش پہ پڑی تھیں۔ کمرہ کھلتے ہی وہ دونوں کھڑی ہوگئیں اور حیرت و استعجاب سے اسمٰعیل کی طرف دیکھنے لگی تھیں۔

اسمٰعیل نے ان کی ڈھارس کے لیے کہا "اگر تمہارے نام خیسار اور رصافہ ہیں اور تمہارے باپ کا نام ابو دلامہ ہے تو آؤ میرے ساتھ، اب تم آزاد ہو۔ تمہارا باپ اسی شہر کی ایک سرائے میں تمہارا انتظار کر رہا ہے۔"

دونوں لڑکیاں چپ چاپ کمرے سے باہر نکل کر اسمٰعیل اور موسےٰ کے درمیان کھڑی ہوگئیں۔ اسمٰعیل نے اس تھیلی سے جو اس نے تاجر سے حاصل کی تھی کچھ سکے نکال کر اس رئیس کے پاؤں پر پھینکتے ہوئے کہا "یہ سکے یقیناً اس رقم سے زیادہ ہوں گے جو تم نے ان دونوں لڑکیوں پر خرچ کی ہوگی۔"

وہ رئیس خوفزدہ سا کھڑا رہا۔ اسمٰعیل نے خیسار اور رصافہ سے کہا "میری بہنو! اب یہاں سے بھاگ چلیں۔ تمہارا باپ بڑی بے چینی سے تمہارا انتظار کر رہا ہوگا۔" خیسار جو عمر میں بڑی تھی پہلی بار اسمٰعیل کو مخاطب کرکے بولی "اے اجنبی! مجھے معلوم نہیں تم نے یہ احسان ہم پر کیوں کیا ہے لیکن یہ بتاؤ تم کون ہو۔ ہمارا باپ یہاں کیسے پہنچ گیا اور ہماری ماں اس وقت کہاں ہے؟"

اسمٰعیل آگے بڑھا اور خیسار کے سر پہ ہاتھ رکھتے ہوئے کہا "میرا نام اسمٰعیل اور یہ میرا ساتھی میرا عم زاد موسےٰ ہے۔ ہم تمہارے بھائی اور تمہارے محافظ ہیں۔ ہم یہاں کیسے اور کیوں کر آئے یہ داستان تمہارا باپ تمہیں سنائے گا۔ ہمیں یہاں زیادہ دیر تک نہیں ٹھہرنا چاہیے۔ تم دونوں اب ہمارے ساتھ آؤ۔"

اس رئیس کو ششدر و پریشان چھوڑ کر وہ حویلی کا دروازہ کھول کر باہر نکلے اور شہر کے اندھیرے میں ڈوبے گلی کوچوں میں راستہ بدل کر وہ اس سرائے کی طرف جا رہے تھے جس میں وہ ٹھہرے ہوئے تھے۔ کسی حادثے کے بغیر وہ سرائے میں داخل ہوئے اور ایک دروازے پر دستک دی۔ بوڑھا ابو دلامہ نے جب دروازہ کھولا تو

خیسار اور رصافہ بھاگ کر ابو دلامہ سے لپٹ گئیں۔ خوشی سے ابو دلامہ کی آنکھوں سے آنسو نکلے اور اس نے دونوں کو اپنے ساتھ لپٹا لیا تھا۔

اسمٰعیل نے ابو دلامہ کو مخاطب کرکے پوچھا "کیا یوسف یہاں نہیں آیا؟" ابو دلامہ نے خیسار اور رصافہ کو علیحدہ کرتے ہوئے فکر مندی سے کہا "وہ تو تم دونوں کے ساتھ تھا پھر یہاں کیسے آجاتا۔" اسمٰعیل نے پریشانی کی حالت میں کہا "جب ہم نے اس تاجر کو قتل کیا جس نے خیسار اور رصافہ کو اٹھا کر بھیجا تھا تو ایک جوان کے شور کرنے پر وہاں بہت سے لوگ اور شہر کے کچھ محافظ جمع ہوگئے تھے۔ بدحواسی کے عالم میں یوسف ہم سے بچھڑ گیا۔ ہم دونوں تو یہی سوچ کر مطمئن تھے کہ وہ بھاگ کر سرائے میں واپس چلا گیا ہوگا لیکن لگتا ہے وہ شہر کے محافظوں کے ہاتھ لگ گیا ہے اگر نہیں تو اپنی جان بچانے کی خاطر وہ کہیں چھپ گیا ہوگا۔"

ابو دلامہ نے فکر مند لہجے میں پوچھا "اب کیا ہوگا؟" موسےٰ زیادہ پریشان لگ رہا تھا اور چھوٹے بھائی کے علیحدہ ہونے پر وہ غمزدہ اور پریشان ہوگیا تھا۔ اسمٰعیل نے پیار سے اس کا ہاتھ تھامتے ہوئے کہا "اب رات ہوگئی ہے۔ اب اسے تلاش کرنے اگر ہم نکلے تو ہم دونوں خود بھی دھر لیے جائیں گے۔ لہٰذا ہم صبح کپڑے بدل کر اس کی تلاش میں نکلیں گے۔ آپ تینوں اب آرام کریں، کل یوسف اگر ہمیں مل گیا تو ہم اس شہر سے کوچ کر جائیں گے۔" اسمٰعیل اور موسےٰ وہاں سے ہٹ کر ساتھ والے کمرے میں چلے گئے تھے۔ ابو دلامہ نے بھی اپنے کمرے کا دروازہ بند کر لیا تھا اور اپنی دونوں بیٹیوں کے ساتھ بیٹھ کر وہ اسمٰعیل سے ملاقات اور ان کی تلاش کی داستان تفصیل سے سن رہا تھا۔

دوسرے روز اپنے گھوڑوں پر سوار ہوکر اسمٰعیل اور موسےٰ یوسف کو تلاش کرنے کے لیے نکلے تو انہوں نے دیکھا کہ شہر میں ایک قاتل کی حیثیت سے یوسف کے گرفتار کیے جانے کی منادی ہو رہی تھی اور منادی کرنے والا بھاری بھرکم مرد ڈھول پیٹ پیٹ کر لوگوں کو ہپوڈروم کے اکھاڑے میں جمع ہونے کو کہہ رہا تھا۔ موسےٰ

اپنا گھوڑا اسمٰعیل کے قریب لایا اور سرگوشی میں اس سے کہا "یوسف تو گرفتار ہو چکا ہے اب کیا ہوگا کہیں یہ لوگ اسے قتل نہ کر دیں"۔

اسمٰعیل نے اُسے تنبیہہ کرتے ہوئے کہا "چپ رہو موسیٰ! ایسا نہ ہو کوئی ہمارا گفتگو سُن لے اور ہم بھی دھر لیے جائیں۔ تم فکر مند نہ ہو۔ میں یوسف کو رہا کرانے کی انتہائی کوشش کروں گا"۔

کچھ سوچتے ہوئے اسمٰعیل خاموش ہو گیا پھر اچانک وہ اپنے گھوڑے سے اُترا اور وہاں سے گزرتے ہوئے ایک بوڑھے سے اس نے پوچھا "یہ منادی کرنے والا لوگوں کو ہپوڈرم کے میدان میں جمع ہونے کو کیوں کہہ رہا ہے؟"

اس بوڑھے نے ایک بار حیرت سے اسمٰعیل کو سر سے پاؤں تک دیکھا پھر کہا۔ "اس شہر میں اجنبی لگتے ہو۔ جب بھی کسی قیدی یا مجرم کو سزا دینا ہوتی ہے تو لوگ ہپوڈرم[1] کے میدان میں جمع ہوتے ہیں کیونکہ اس میدان میں حکمران طبقہ کی تفریح اور عوام کی عبرت کے لیے مجرموں اور قیدیوں پر بھوکے درندے چھوڑے جاتے ہیں"۔

اسمٰعیل خاموش رہا۔ جواب میں کچھ نہ کہا۔ بوڑھا اتنا کہہ کر آگے بڑھ گیا۔

اسمٰعیل اپنے گھوڑے پر سوار ہوا اور موسےٰ کے ساتھ وہ ہپوڈرم کے اکھاڑے کی طرف جا رہا تھا۔

---

[1] عہد روما میں اس میدان کے اندر گھوڑوں اور جنگی رتھوں کی دوڑ کے علاوہ جوانمرد خونخوار درندوں سے لڑتے تھے اس میدان میں قیدیوں پر بھوکے درندے بھی چھوڑے جاتے تھے۔ اس میدان کے اردگرد دیوتاؤں اور بہادروں کے مجسمے بھی نصب تھے۔ یہ میدان آج بھی موجود ہے۔ گو آج کل یہ تنگ ہو چکا ہے کیوں کہ اب اس میں ایک مکتب اور جیل خانہ بن گیا ہے۔ اس کے علاوہ اس میں جرمنی کے بادشاہ قیصر کا بنوایا ہوا ایک یادگاری چشمہ بھی ہے۔ جب مسلمانوں نے اس شہر کو فتح کیا تو وہ اس میں نیزہ بازی کرتے تھے۔

اکھاڑے سے باہر جہاں گھوڑے باندھنے اور رتھیں کھڑی کرنے کی جگہ تھی وہاں وہ دونوں اپنے گھوڑوں سے اُترے۔ دونوں نے وہاں اپنے گھوڑوں کو باندھ دیا۔ اسمٰعیل اپنے گھوڑے کے پاس کھڑا ہو کر کچھ سوچتا رہا اور موسےٰ پریشانی کی حالت میں اس کے دائیں جانب کھڑا اُسے غور سے دیکھ رہا تھا۔ موسےٰ نے دیکھا اسمٰعیل کی گردن جھکی ہوئی تھی اور وہ کسی صنم خانہ کی طرح خاموش اور چُپ کھڑا تھا۔ موسےٰ نے اندازہ لگایا اسمٰعیل کے چہرے پر مختلف جذبوں کا اظہار تھا۔ کبھی اس کے چہرے پر رعد کی بلاخیزی نمودار ہوتی تھی اور کبھی وہاں حقارت اور برہمی پھیل جاتی تھی۔

لوگ جوق در جوق ہپوڈرم کے میدان میں داخل ہو رہے تھے۔ اسمٰعیل بھی اب حرکت میں آیا تھا۔ اس نے اپنی تلوار کا دستہ تھام کر اس کا جائزہ لیا پھر اس نے اپنے گھوڑے کی زین سے لٹکتی ہوئی ڈھال اور اپنا گرز اُتار لیے اور موسےٰ کی طرف دیکھتے ہوئے گہری اور پُرسوز آواز میں کہا "موسےٰ! آؤ چلیں، موت کے اس میدان میں ہمارا رب ہماری مدد کرے گا"۔

دونوں تیز تیز قدم اُٹھاتے ہوئے اس اکھاڑے کے دروازے باب العاج کے راستے وہ میدان میں داخل ہو گئے تھے۔ قطاروں کے بیچوں بیچ آگے بڑھتے ہوئے وہ اس آہنی جنگلے کے قریب جا کر بیٹھ گئے جس کے اندر قیدیوں اور مجرموں پر بھوکے درندے چھوڑے جاتے تھے۔

میدان کے شمال مشرق میں شاہی نشست گاہ تھی جس کے اردگرد نیلی اور سبز دریوں والے محافظ کھڑے تھے۔ تھوڑی دیر بعد حکمران طبقہ ایک قافلے کی صورت میں اس میدان کے اندر داخل ہوا۔ رنگ و بو کے اس قافلے کے آگے آگے قسطنطنیہ کا بادشاہ ارمانوس اور اس کی ملکہ یوڈوشیا تھی۔ دونوں آگے بڑھ کر شاہی نشست گاہ پر بیٹھ گئے اور ان کے ساتھ آنے والی لڑکیوں کا ایک ہجوم بھی ان کے دائیں بائیں اور پیچھے بیٹھ گیا تھا۔ ان حسین لڑکیوں کی ننگی پنڈلیاں اور کھلے گریبان میدان میں بیٹھے لوگوں پر سحر اور سکر و مستی کا عالم طاری کرنے لگے تھے۔ تھوڑی دیر بعد میدان

کے دو محافظ ارمانوس کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اس سے درندے کو میدان میں چھوڑنے کی اجازت لے کر واپس چلے گئے تھے۔ اسی لمحے اسمٰعیل نے موسےٰ کے کان میں ایک طویل سرگوشی کی جس کے بعد موسےٰ اُٹھ کر میدان سے باہر نکل گیا تھا۔ چند ہی لمحوں بعد یوسف کو میدان میں لایا گیا اور دو محافظ اُسے میدان کے وسط میں چھوڑ کر باہر نکل گئے۔

اسی دوران میدان میں کلیسا کا سب سے بڑا مذہبی راہنما اور قسطنطنیہ کا اسقفِ اعظم میدان میں داخل ہوا اور بادشاہ ارمانوس کے بائیں پہلو میں ایک خالی نشست پر بیٹھ گیا۔ لوہے کے جنگلے سے گھرے ہوئے محفوظ میدان میں محافظوں نے ایک بھوکے شیر کو پنجرے سے نکال کر یوسف پر چھوڑ دیا تھا۔ اِرد گرد بیٹھے لوگ خاموش اور دم بخود تھے۔ شیر پنجرے سے نکلتے ہی یوسف کو دیکھ چکا تھا لہٰذا وہ غُراتا ہوا اس کی طرف بڑھا تھا۔

یوسف گو نہتا تھا پھر بھی وہ اپنی مدافعت پر کمربستہ ہو گیا تھا۔ اسی لمحہ اسمٰعیل حرکت میں آیا۔ اپنی ڈھال اور گرز لیے وہ لوہے کے جنگلے پر چڑھا پھر وہ موت کے اس میدان کے اندر کود گیا۔ لوگ اس کی اس حرکت اور جرأت پر حیران اور ششدر رہ گئے تھے اسمٰعیل بھاگ کر یوسف کے پاس آیا اور اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے اس نے کہا۔ "مت ڈرو! کہ ہمارا رب ہمارے ساتھ ہے۔ موت کے اس میدان سے ہم سرخرو ہو کر نکلیں گے۔"

شیر اب قریب آ کر حملہ آور ہونے والا تھا۔ اسمٰعیل نے یوسف کو کھینچ کر اپنے پیچھے کر لیا اور خود وہ اپنی ڈھال اور اپنا گرز سنبھال کر مقابلے کے لیے تیار ہو گیا تھا۔ بھوکے شیر نے ایک جست لی اور اسمٰعیل پر حملہ آور ہوا۔ اسمٰعیل نے اس کے دونوں پنجوں کو اپنی ڈھال پر لیا اور اپنا وزنی گرز گھما کر اس شیر کے سر پر دے مارا۔ شیر لڑکھڑا کر چند قدم پیچھے ہٹ گیا تھا۔ گول دائرے کی صورت میں دو ایک چکر اس نے نہایت کرب کی حالت میں کاٹے اور دوبارہ وہ خونخواری سے حملہ آور ہوا تھا۔ دوسری بار بھی اسمٰعیل نے اس کے پنجوں کے سامنے اپنی آہنی ڈھال کر کے اس کے سر پر پہلے کی نسبت بھی گرز کی سخت ضرب لگائی۔ شیر اس بار بُری طرح ڈگمگایا اور زمین پر گر گیا۔ اسمٰعیل نے آگے بڑھ

کر گرے ہوئے شیر پر ایک اور ضرب لگائی اور شیر دم توڑ گیا تھا۔

یوسف بھاگ کر اسمٰعیل سے لپٹ گیا۔ میدان میں بیٹھے لوگ کیا مرد کیا عورتیں تالیاں بجا بجا کر اور زور زور سے چلّا کر اسمٰعیل کی تعریف میں آوازیں بلند کرنے لگے تھے اسی لمحہ میدان میں دو محافظ داخل ہوئے تھے۔ اسمٰعیل نے فوراً یوسف کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "یوسف! یوسف! یہ جو کچھ بھی پوچھیں میں جواب دوں گا۔ تم خاموش رہنا۔" یوسف نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

دونوں محافظ قریب آئے اور اسمٰعیل کی طرف دیکھتے ہوئے ان میں سے ایک نے کہا۔ "ہمارے ساتھ آؤ۔ ہمارے بادشاہ ارمانوس نے تمہیں طلب کیا ہے۔ تم اس شہر میں اجنبی لگتے ہو کہ ایسا نڈر اور بے خوف جوان اس شہر میں پہلے کوئی نہ تھا۔"

اسمٰعیل اور یوسف دونوں ان محافظوں کے ساتھ ہو لیے اور محافظوں نے دونوں کو بلند نشست گاہ پر بیٹھے ہوئے ارمانوس کے سامنے سنگِ سماق کی سیڑھیوں پر لا کھڑا کیا۔ اسمٰعیل نے دیکھا قسطنطنیہ کا بادشاہ ارمانوس نفیس اور ارغوانی لباس پہنے ہوئے تھا۔ سر پہ تاج، کندھوں پر ایک زرتار چادر، کمر میں سنہری پیٹی اور پاؤں میں گلنار موزے تھے۔

ارمانوس چند ثانیوں تک اسمٰعیل کو غور سے دیکھتا رہا پھر اس نے پوچھا۔ "اے شیر دل جوان تُو کون ہے؟ کہاں سے آیا ہے اور موت کے اس میدان میں گھس کر تم نے اس مجرم کی جان کیوں بچائی ہے؟"

اسمٰعیل نے اپنا گرز اپنے سامنے زمین پر رکھا اور ارمانوس کی طرف دیکھتے ہوئے اس نے کہا۔ "اے بادشاہ! یہ جوان میرا عم زاد ہے۔ مجرم یہ نہیں میں ہوں جس تاجر کے قتل میں یہ پکڑا گیا ہے، اسے میں نے قتل کیا تھا۔ یہ بے گناہ ہے۔ اگر میرے الفاظ میں آپ کو شبہ نظر آئے تو اس تاجر کے اہلِ خانہ کو بُلا لیں وہ میرے الفاظ کی تائید کریں گے۔"

ارمانوس نے ایک محافظ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "قتل ہونے والے

تاجر کے اہلِ خانہ کو بلایا جائے"۔ محافظ وہاں سے ہٹ گیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ اپنے ساتھ ایک نوخیز اور حسین لڑکی کے علاوہ ایک جوان کو بھی لے کر آیا۔ اسمٰعیل پہچان گیا آنے والا جوان وہی تھا جسے پچھلی شب اس نے مارا بھی تھا اور اس کی موجودگی میں تاجر کو قتل بھی کیا تھا۔ اس جوان سے نظریں ہٹا کر اسمٰعیل نے آنے والی لڑکی کی طرف دیکھا۔ وہ اپنے شباب میں مکمل اور مجسّم بہار تھی۔ اس کی دراز سرمئی پلکوں میں ایک مقناطیسیت اور گھنیر گہری آنکھوں میں ایک اسرار تھا۔ اس کا اوس میں بھیگے پھول سا چہرہ، اس کے احمر و گلنار ہونٹ، اس کے عارض کی لالہ کاری اور دراز کاکل کی تابداری اس بنتِ حوّا کو صنمِ شعلہ جمال اور دوشیزہ نور بنائے ہوئے تھے۔ چند لمحوں تک اسمٰعیل اس لعل و مرمر کے حسین دمکتے پیکر اور حسنِ جواں سال کی رعنائی میں کھو سا گیا تھا پر جلد ہی اس نے اپنی نگاہوں کو ہٹا لیا اور ارمانوس کی طرف دیکھنے لگا۔

ارمانوس نے آنے والے جوان کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا "تم کون ہو اور مرنے والے تاجر سے تمہارا کیا رشتہ ہے اور کیا تم بتا سکتے ہو ان سامنے کھڑے جوانوں میں سے کس نے اس تاجر کو قتل کیا تھا"؟

اس جوان نے کہا "میرا نام مارسلیس ہے اور میں مرنے والے تاجر کا بھتیجا ہوں۔ پھر اس نے اسمٰعیل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ یہ جوان جس کے ہاتھ میں ڈھال ہے اور جس کے سامنے گرز پڑا ہے اس نے میرے چچا کو قتل کیا ہے"۔

ارمانوس نے اب لڑکی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "تم کون ہو اور ان میں سے کسے تم قاتل قرار دیتی ہو"؟ اس حسنِ بلا خیز نے اپنے شہابی ہونٹوں پر اپنی زبان پھیری اور آبی طیور جیسی مسحور کن آواز میں اس نے کہا "میرا نام صوفیہ ہے، میں مرنے والے تاجر کی بیٹی ہوں۔ میں موقع پر موجود نہ تھی اس لیے نہیں جانتی میرے باپ کا قاتل کون ہے"۔

ارمانوس نے اس بار اسمٰعیل کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "اے اجنبی نوجوان! تو بہادر طاقت ور اور شجاع ہے مجھے تیری حالت پر رحم آتا ہے۔ پر بتا تو نے اس لڑکی کے باپ کو کیوں قتل کیا"۔ اسمٰعیل نے اپنی ڈھال بھی زمین پر رکھتے ہوئے کہا۔ "اے بادشاہ! یہ ایک

لمبی داستان ہے"۔ ارمانوس نے بھرپور توجہ کا اظہار کرتے ہوئے کہا "تم کہو میں سنوں گا"۔

اسمٰعیل نے وقت کے تقاضے کے تحت ایک فرضی داستان کہنی شروع کی۔

"اے بادشاہ! ہم خانہ بدوش ترک ہیں۔ پہلے ہم مسلمان تھے پھر ایک عیسائی مبلغ کے ہاتھوں ہم نے عیسائیت قبول کر لی۔ وہ عیسائی مبلغ جو ایک پارسا اور پرہیزگار راہب تھا اس کے ساتھ دو جوان راہبائیں بھی تھیں اور وہ دونوں بھی مذہب کا پرچار کرتی تھیں۔ جب ہم نے عیسائیت قبول کی اس وقت ہمارا قبیلہ شمالی آرمینیا کی چراگاہوں میں خیمہ زن تھا۔ وہ راہب اور دونوں راہبائیں مجھے، میرے ساتھ دو اور جوانوں، دو لڑکیوں اور ان کے بوڑھے باپ کو لے کر قسطنطنیہ کی طرف روانہ ہوئے کیونکہ ہم نے ان سے ایا صوفیہ[1] کے گرجا کی زیارت کے لیے التماس کی تھی۔ انہوں نے ہماری التجا مان لی اور ہمیں لے کر اس شہر کی طرف روانہ ہوئے۔ سفر کے سارے اخراجات ہم نے برداشت کیے تھے۔

اس سفر کے دوران ہماری ملاقات ایک عیسائی تاجر سے ہوئی جو آرمینیا کی طرف سے قسطنطنیہ کی طرف آ رہا تھا۔ اس کے ساتھ اس کے چار محافظ بھی تھے۔ اس نے ہم سے ہمدردی کی اور سفر میں ہمیں اپنا ساتھی بنا لیا۔ اس سفر کے دوران اس نے ہماری خوب آؤ بھگت کی لیکن ہمیں خبر نہ تھی اس کے اندر شیطان چھپا بیٹھا ہے۔ جب ہم سفر کرتے ہوئے کندیرہ شہر کے پاس آئے تو اس تاجر نے شہر سے باہر پڑاؤ کیا۔ اس کے پاس

---

[1] یہ گرجا قیصر جسٹینین نے ہیکلِ سلیمانی کے مقابلے پر بنوایا تھا۔ یہ ایک بہت بڑی عمارت ہے جس کے ۱۷۰ ستون ہیں جو سارے سنگ سماق اور رخام کے ہیں۔ اس میں داخل ہونے کے نو دروازے ہیں۔ جب مسلمانوں نے اس شہر کو فتح کیا تو ایا صوفیہ کے اس کلیسا کو مسجد میں بدل دیا گیا۔ جب ترکی میں خلافت کا خاتمہ ہوا اور جمہوریت کا قیام عمل میں آیا تو غازی کمال اتاترک نے اس مسجد کو عجائب گھر میں بدل دیا تھا۔ آج ایا صوفیہ کی یہ عظیم عمارت ترکی کا عجائب گھر ہے۔

کچھ سامان تھا جو اس نے ہمیں دیا کہ شہر جا کر اس سامان کو فروخت کر آئیں۔ اس نے مجھے یہ بھی کہا کہ اس سامان سے جو قیمت وصول ہو وہ میری اور میرے دونوں ساتھیوں کی ہوگی۔ میں اور میرے دونوں ساتھی اور ہمارے ساتھ جو دو حسین لڑکیاں تھیں ان کا باپ بھی مالِ فروخت کرنے شہر چلے گئے۔

ہماری غیر موجودگی میں اس شیطان تاجر نے ہمارے معزز راہب اور دونوں راہباؤں کو قتل کر دیا اور ان نوعیسائی لڑکیوں کو لے کر ادھر بھاگ آیا۔ یہاں اس نے دونوں لڑکیوں کو بازار میں فروخت کر کے ایک رئیس سے ایک بڑی رقم حاصل کر لی۔ ہم تعاقب کرتے ہوئے اس شہر میں داخل ہوئے۔ غلاموں کے بازار سے ہمیں خبر ہوئی کہ اس تاجر نے لڑکیوں کو ایک رئیس کے ہاتھ فروخت کر دیا ہے۔ ہم نے اس تاجر اور رئیس دونوں کی رہائش گاہ دیکھ لی اور پچھلی رات میں نے اپنے ساتھیوں کے ساتھ اس مکار و فنّان تاجر کو قتل کر دیا اور جتنی رقم کی رئیس نے دونوں لڑکیاں خریدی تھیں اس سے زیادہ رقم دے کر لڑکیوں کو آزاد کرا لیا۔ اگر ہماری نیت میں فساد اور تعصب ہوتا تو ہم اس رئیس کو بھی قتل کر دیتے جس نے لڑکیوں کو خریدا تھا۔ تاجر کو ہم نے اس لیے قتل کیا تھا کہ اس نے ہم نئے عیسائیوں کو مایوس کرنے کے علاوہ بے گناہ اور مایوس راہب اور یسوع مسیح کی کنواری راہباؤں کو قتل کیا تھا اور وہ قتل ہونے کا حق دار تھا۔ جن لڑکیوں کو ہم نے آزاد کرایا ہے وہ اپنے باپ کے ساتھ اس وقت غلاموں کے بازار کی سرائے میں ٹھہرے ہوئے ہیں۔ میرا دوسرا ساتھی انہیں یہاں لانے کے لیے گیا ہوا ہے، آپ ان سے اس واقعہ کی تحقیق کر سکتے ہیں۔"

ارمانوس کے قریب بیٹھے ہوئے اسفِ اعظم نے غصے کی حالت میں غراتے ہوئے کہا۔ "اب تحقیق کی کوئی ضرورت نہیں۔ تم ایک شجاع اور حوصلہ مند جوان ہو۔ ہم تم پر اعتماد کرتے ہیں۔ اب تم سے کوئی مواخذہ اور احتساب نہ کیا جائے گا کیونکہ تاجر نے راہب اور راہباؤں کو قتل کیا تھا لہٰذا اس کا قتل تم پر فرض تھا۔"

اسفِ اعظم جب خاموش ہوا تو تاجر کی لڑکی نے جس کا نام صوفیہ تھا اور جو

ابھی تک وہیں کھڑی تھی، اپنی مزامیر داؤدی جیسی آواز میں کہا۔ "میرے باپ نے ایک گھناؤنا جرم کیا تھا۔ لہٰذا میں تمہیں اس جرم سے معاف کرتی ہوں۔ تم نے ایک نیک کام کیا ہے۔"

اسمٰعیل نے احسان مندی سے صوفیہ کی طرف دیکھا پھر نگاہیں ہٹا کر وہ ارمانوس کی طرف دیکھنے لگا تھا۔ ارمانوس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "اے اجنبی خانہ بدوش! اب تم آزاد ہو۔ یہاں قسطنطنیہ کے عوام کو محظوظ کرنے کے لیے کیا تم ایک اور مقابلے کے لیے تیار ہو تاکہ میں اس شہر میں تمہاری ہمت اور جوانمردی کا تعین کر سکوں۔" اسمٰعیل نے چھاتی تانتے ہوئے کہا۔ "میں ہر مقابلے کے لیے تیار اور مستعد ہوں۔"

ارمانوس نے غور سے اسمٰعیل کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "اتنی جلدی اور عجلت میں اپنا فیصلہ نہ دو۔ جس شخص سے میں تمہارا مقابلہ کرانا چاہتا ہوں وہ اس میدان میں کبھی کسی سے نہیں ہارا اور ایسا زور آور اور باہمت ہے کہ وہ اس میدان کے اندر لوگوں کی تفریح کے لیے خالی ہاتھ درندوں کا مقابلہ کرتا ہے۔ تم کس فن میں اس کا مقابلہ کرو گے؟"

اسمٰعیل نے پُرسکون لہجے میں کہا۔ "جو مقابلہ آپ چاہیں میں اس کے لیے تیار ہوں گا۔" ارمانوس نے ایک محافظ کو قریب بلا کر سرگوشی میں اس سے کچھ کہا اور وہ ایک طرف چلا گیا پھر ارمانوس نے اسمٰعیل کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "اپنا یہ گرز کسی کو تھما دو اور اپنی تلوار اور ڈھال لے کر میدان کے وسط میں جا کر کھڑے ہو جاؤ۔ یہ مقابلہ قسطنطنیہ کے لوگوں کے یقیناً دلچسپی اور تفریح کا باعث ہوگا۔"

اسمٰعیل کے ہاتھوں مرنے والے تاجر کی دلکش شفق کی سی حسین اور سحر و شبنم کی سرگوشیوں کی طرح پُراسرار اور دلکش لڑکی جس کا نام صوفیہ تھا شہ نشین سے نیچے اتری اور جھک کر اسمٰعیل کا گرز اٹھانے کے بعد اسمٰعیل کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے اس نے کہا۔ "اگر یہ مقابلہ تم جیت گئے تو اپنا گرز مجھ سے آ کر لے لینا میں اس شہ نشین کے دائیں جانب کھڑی ہوں گی اور اگر تم ہار گئے تو اس طرف نہ آنا کہ ایسی صورت میں تم گرز رکھنے کے اہل نہ ہو گے۔"

اسمٰعیل نے حسین صوفیہ کی ان باتوں کا کوئی جواب نہ دیا۔ وہ وہاں سے ہٹا

اور آہستہ آہستہ ایک وقار کے ساتھ چلتا ہُوا میدان کے وسط میں جا کر کھڑا ہو گیا تھا۔ یوسف میدان سے باہر نکل گیا تھا۔

میدان میں اسمٰعیل کو تھوڑی دیر تک ہی کھڑا ہونا پڑا تھا کہ شاہی نشست گاہ کی طرف سے ایک جوان اس میدان میں اُترا۔ اس نے اپنے بازوؤں، شانوں اور گھٹنوں سے نیچے تک آہنی جوشن چڑھا رکھے تھے۔ اس کے سر پر اُونچی کاٹھی کا خود اور اپنے سُرخ لباس پر اس نے زرہ پہن رکھی تھی۔ وہ پُوری طرح مسلح ہو کر میدان میں اُترا تھا۔ اسمٰعیل کے قریب آ کر اس نے اپنی تلوار کھینچی اور دائیں پہلو سے لٹکتی ہوئی اپنی ڈھال تھام لی۔ ذرا اور قریب آ کر اس نے اسمٰعیل سے کہا۔

"اے اجنبی! مَیں اس سے قبل تمہیں شیر سے مقابلہ کرتے دیکھ چکا ہوں۔ جب تُو کوہے کی سلاخوں کے اُوپر سے کُود کر میدان میں اُترا تھا، تیری ہمت تیری جرأت قابلِ ستائش ہے۔ کیا ایسا ممکن نہیں کہ یہ جنگ ہم ایک دوسرے کو نقصان پہنچائے بغیر کریں۔ بظاہر لوگ یہی سمجھیں کہ ہم اپنی پُوری خصومت اور عداوت سے لڑ رہے ہیں لیکن ایک دوسرے پر ضرب نہ آنے دیں اور مقابلے کو برابر رہنے دیں۔ اس طرح اس میدان میں جمع ہوئے لوگ بھی محظوظ ہو جائیں گے اور ہم دونوں میں سے کسی کو نقصان بھی نہ پہنچے گا۔ کیا تم میری اس پیش کش کو قبول کرتے ہو؟"

اسمٰعیل نے غور سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "پہلے اپنا نام کہو۔"

اس جوان نے کہا۔ "میرا نام کلاڈیوس ہے"۔ اسمٰعیل نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے کہا۔ "سنو کلاڈیوس! تمہاری یہ پیش کش اگر خلوص پر مبنی ہے تو مَیں اسے بخوشی قبول کرتا ہوں لیکن یاد رکھنا اگر تم نے اس معاہدے کی آڑ میں اپنے حق میں کوئی فائدہ اُٹھانے کی کوشش کی تو مَیں اس میدان میں تمہارے لیے خُون پکارتی موت بھی بن سکتا ہوں۔ مَیں چٹانوں اور کوہستانوں میں زندگی بسر کرنے والا ایک خانہ بدوش ہوں اور تم دیکھو گے میرا انتقام بھی ایسا ہی سنگین ہو گا۔"

کلاڈیوس نے مُسکراتے ہوئے کہا۔ "مَیں تم سے کوئی دھوکہ نہ کروں گا بے فکر رہو۔"

دونوں سنبھلے اور ایک دوسرے پر ہلکے پھلکے وار کرنے لگے تھے۔ باہر بیٹھے ہوئے لوگ زیادہ تر کلاڈیوس کے حق میں آوازیں بلند کر رہے تھے تاہم کچھ لوگ اسمٰعیل کی حوصلہ افزائی بھی کر رہے تھے۔ اسمٰعیل ابھی تک بے دلی اور سست رفتاری سے وار کر رہا تھا جب کہ کلاڈیوس کے حملوں میں لمحہ بہ لمحہ اور آہستہ آہستہ تیزی، جارحیت، حقیقت پسندی اور خطرے کی بُو بڑھتی جا رہی تھی۔

اچانک کلاڈیوس نے اپنا پینترا بدلا اور بڑی سُرعت کے ساتھ اس نے اسمٰعیل کی دائیں شانے پر اپنی ڈھال کی ایک بھرپور ضرب لگائی۔ پھر ایک، دو، تین لگاتار سات ضربیں اس نے اسمٰعیل کے شانے پر دے ماری تھیں۔ اسمٰعیل کا لباس شانے کے پاس سے پھٹ گیا۔ زرہ کی کئی کڑیاں شانے میں گھس گئیں اور خون بہہ نکلا تھا۔ اسمٰعیل لڑکھڑا کر پیچھے ہٹا اور کلاڈیوس کی طرف قہر آلود آنکھوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"اے کم ذات و بے اصل انسان! تُو نے تو عہد کیا تھا کہ اس مقابلے میں ایک دوسرے کو نقصان نہ پہنچائیں گے پھر تُو نے یہ حرکت کیوں کی؟"

کلاڈیوس نے مکروہ انداز میں کہا۔ "جنگ اور مقابلے میں ہر فریب، ہر دھوکہ اور عہد کی شکستگی بھی ایک داؤ اور حربہ ہے اور جائز و مناسب ہے۔"

غصّے کے عالم میں اسمٰعیل نے اپنی تلوار اور ڈھال پر اپنی گرفت مضبوط کرتے ہوئے کہا۔ "اے عبدالصنم! اے مردُود، مقہور و رُوسیاہ انسان! تو نے دھوکہ کیا ہے اور تجھے اس دھوکے کی سزا ضرور دوں گا۔ مَیں تیرے ساتھ عہد پر قائم تھا۔ پر سُن اب مَیں اس عہد کو توڑتا ہوں۔ اے بے ایمان! یاد رکھ اب میری ضربیں اپنی اصل صورت میں تیرے سامنے آئیں گی۔ اب دیکھ مَیں کیسے تیرے خیالوں کے عفریت اور تیرے وہموں کے سب کو شکستہ کرتا ہوں۔"

کلاڈیوس نے عیارانہ مسکراہٹ میں کہا۔ "اب تُو زخمی ہے، اب تجھے زیر کرتے ہوئے مَیں زیادہ وقت نہ لوں گا"۔ اسمٰعیل نے غصّے میں تلوار لہراتے ہوئے کہا۔ "اے

سیاہ بخت و بدطالع! اب تیرا ہر فعل کارِ طفلاں ہوگا۔ مَیں دکھاوے کی جنگ لڑنے کا عادی نہ تھا۔ اب دیکھ موت کے اس میدان میں تجھے کیسے لہولہو اور تیری جان کو لخت لخت کرتا ہوں"۔ اس کے ساتھ ہی اسمٰعیل نے آگے بڑھ کر کلاڈیوس پر حملہ کر دیا تھا۔ کلاڈیوس نے زخمی اسمٰعیل کو زیر کرنے کی انتہائی کوشش کی لیکن وہ ناکام رہا۔

اسمٰعیل اپنے مجذوبانہ انداز میں بے امان شعلہ اور سراب و دہمہ بن کر کلاڈیوس پر محیط ہوگیا تھا۔ کلاڈیوس اب بپھرے ہوئے اسمٰعیل کو اپنے سامنے سیاہ آندھی اور سرخ سیلاب کی صورت میں دیکھ رہا تھا۔ وہ کسی فتنہ گر دوراں اور کسی سحر فن کی طرح کلاڈیوس کو اپنے آگے آگے ہانکتا ہوا میدان میں چکّر دینے لگا تھا اور کلاڈیوس اسمٰعیل کے طوفانی حملوں میں اپنی قسمت کے بدترین نوشتے پڑھ رہا تھا۔

اچانک اسمٰعیل نے حملہ آور ہونے کا رُخ بدلا اور کلاڈیوس کو جکمہ دینے کی خاطر اس نے اپنی ڈھال اس کے چہرے پر پوری قوت سے مارنا چاہی۔ کلاڈیوس فوراً سنبھلا اور اپنی ڈھال اپنے چہرے کے سامنے کر لی۔ اس طرح وہ دھوکہ کھا گیا۔ ڈھال چہرے کے سامنے آنے پر وہ یہ نہ دیکھ سکا کہ اسی وقت اسمٰعیل نے اپنی تلوار بلند کر کے اس پر گرائی اور کلاڈیوس کا بایاں بازو کاٹ کر رکھ دیا۔ کلاڈیوس کے ہاتھ سے ڈھال گر گئی اور وہ اپنا کٹا ہوا بازو تھام کر رہ گیا۔

اسمٰعیل نے کسی نیرنگ ساز و ساحر کی طرح گرجتے ہوئے کہا "ربِ سمٰوات و زمین کی قسم! مَیں چاہتا تو تیری گردن بھی کاٹ سکتا تھا لیکن مَیں نے تیری جان نہیں لی، تیرا بازو کاٹ کر تجھے عیب دار کر دیا ہے تاکہ تو کسی اور کو اس میدان میں دھوکہ نہ دے سکے۔ مَیں عنقریب اس شہر کو چھوڑ کر چلا جاؤں گا لیکن میرا جانا تیرے لیے سودمند نہ ہوگا کہ ایک بازو کے ساتھ تم کسی کے ساتھ پھر اس میدان میں مقابلہ نہ کر سکو گے۔"

تین محافظ بھاگتے ہوئے میدان میں اُترے۔ دو کلاڈیوس کی مرہم پٹی کرنے کے لیے اسے سہارا دے کر باہر لے گئے اور تیسرے نے اسمٰعیل کا بازو پکڑتے ہوئے کہا "ایک عرصہ بعد کسی نے اس میدان میں کلاڈیوس کو شکست دی ہے۔ آؤ تمہیں ہمارے بادشاہ

ؤس نے پھر طلب کیا ہے۔"

اسمٰعیل اس محافظ کے ساتھ جب دوبارہ شاہی نشست گاہ کے سامنے ...رمانوس اٹھ کر کھڑا ہوگیا اور آگے بڑھ کر اسمٰعیل سے مصافحہ کرتے ہوئے اس نے ... کلاڈیوس کو شکست دے کر تم نے اپنے آپ کو قسطنطنیہ کے معززین میں شامل ...یا ہے۔ آج کے بعد تمہاری ہر آسائش اور آسودگی کا انتظام حکومت کی ذمہ داری ہو... رمانوس کے خاموش ہونے پر اسمٰعیل نے کہا "لیکن میں تو یہاں سے آج یا کل چلا ...ں گا پھر یہ آسائش و آسودگی کا انتظام کیسا؟"

ارمانوس کی بجائے اس بار اس کی بیوی اور قسطنطنیہ کی ملکہ یوڈوشیا* نے حیرت ...ستعجاب کی حالت میں پوچھا "تم قسطنطنیہ چھوڑ کر کہاں جاؤ گے؟" اسمٰعیل نے اپنے ...و کے زخم پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا "مَیں پہلے ہی کہہ چکا ہوں، مَیں ایک خانہ بدوش ...اور میرے قبیلے کا سردار جو میرا چچا بھی ہے آرمینیا اور کردستان کے علاقے میں بڑی ...ی سے میرا انتظار کر رہا ہوگا۔ مَیں اسی خانہ بدوش قبیلے میں پیدا ہوا اور اسی سے میرا ...بل وابستہ ہے۔"

ارمانوس نے فیصلہ کن انداز میں کہا "ہم قسطنطنیہ میں تمہیں ایسی عزت، ایسا ...ادیں گے جو کبھی تمہارے تصوّرات سے بھی نہ گزرے ہوں گے۔ اب تم قسطنطنیہ سے ...ا چاہو تو ہم تمہیں نہ جانے دیں گے۔ اگر تمہارے ماں باپ، بہن بھائی ہوں ...نہیں بھی یہیں بلا لو۔ قسطنطنیہ میں تمہارا اس کے علاوہ اور کوئی کام نہ ہوگا کہ تم ...لئے اس میدان میں قسطنطنیہ کے پہلوانوں اور تیغ زنوں سے مقابلہ کر کے یہاں کے ...تفریح کا سامان مہیا کرو۔ یہاں تمہاری حفاظت اور کفالت کا معقول انتظام ہوگا ...ا! یہ بات بھی یاد رکھنا۔ اگر تم نے کبھی یہاں سے بھاگنے کی کوشش کی تو ہمارے

---

* ...سطنطنیہ کے پہلے بادشاہ کی بیوی تھی۔ شوہر کی وفات پر اکیلی حکومت کرتی رہی پھر ارمانوس نے زبردستی بادشاہت پر قبضہ کر لیا اور ملکہ یوڈوشیا سے شادی کر لی۔

آدمیوں کے ہاتھوں ناحق مارے جاؤ گے اور دیکھو! چند روز تک عیدالفصح (ایسٹر) کا تہوار آنے والا ہے۔ اس روز موت کے اس میدان میں مقابلوں کا ایک خاص اہتمام ہوتا ہے۔ دُور دُور سے پہلوان اور تیغ زن ان مقابلوں میں حصّہ لینے آتے ہیں ان سب مقابلوں میں جو جیت کر اوّل نکلے گا اس کے ساتھ آخر میں تمہیں مقابلہ کرنا ہوگا اور یہ تو تم جانتے ہی ہو ان مقابلوں میں مقابلہ کرنے والے ایک دوسرے کو موت کے گھاٹ بھی اُتار سکتے ہیں۔ تم نے کہا تھا تم سرائے میں ٹھہرے ہوئے ہو۔ آج اور ابھی سے تمہارا قیام قسطنطنیہ کے شاہی مہمان خانے میں ہوگا۔ وہاں کچھ محافظ تعینات ہو گے جو نہ صرف یہاں مقابلوں کے دوران پیدا ہونے والے دشمنوں سے تمہاری حفاظت کریں گے بلکہ اس امر کا خیال بھی رکھیں گے کہ تم یہاں سے بھاگ کر نہ جاؤ۔"

اسمٰعیل نے چند لمحوں تک گردن جھکائے رکھی۔ اس کے زخمی شانے سے ابھی تک خون رِس رہا تھا پھر اس نے اپنا سر اُوپر اُٹھاتے ہوئے کہا۔ "مَیں یہاں رُکنے پر تیار ہوں لیکن مجھے اس بات کی اجازت دی جائے کہ مَیں اپنے ساتھیوں کو واپس بھیج دوں تاکہ وہ میرے خانہ بدوش قبیلے میں جاکر میرے یہاں قیام کی اطلاع میرے چچا کو دیں۔ وہ میرے متعلق فکرمند ہوگا۔ میری خیریت کی خبر پاکر وہ مطمئن اور پُرسکون ہو جائے گا۔"

ارمانوس نے مُسکراتے ہوئے کہا۔ "مَیں تمہارے اس فیصلے سے خوش ہوں تم اپنے ساتھیوں کو واپس بھیج سکتے ہو۔ اس کے علاوہ تم اپنے زخمی شانے کی مرہم پٹی کرالو۔" پھر ارمانوس نے چار دیوقامت محافظوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "یہ چاروں ہر وقت تمہاری حفاظت اور نگرانی پر مامور رہیں گے اس کے علاوہ یہ تمہاری ہر خدمت بھی بجا لائیں گے۔ اب تم جاؤ یہ چاروں تمہیں اپنے ساتھ شاہی مہمان خانے میں لے جائیں گے۔" اسمٰعیل نے پیچھے ہٹتے ہوئے کہا۔ "مجھے صرف چند ثانیوں کی مہلت دی جائے۔ سامنے میرا ساتھی کھڑا ہے مَیں اسے کہوں کہ وہ سب چلے جائیں اس کے بعد میں ان محافظوں کے ساتھ روانہ ہو جاؤں گا۔"

ارمانوس نے جب اثبات میں گردن ہلا دی تو اسمٰعیل تیز تیز قدم اُٹھاتا ہوا دائیں

طرف بڑھا اور یوسف کو اپنے قریب علیحدہ بُلا کر اس نے سرگوشی کرتے ہوئے کہا۔ "یوسف! یوسف! تم دونوں بھائی اس بوڑھے اور اس کی بیٹیوں کو لے کر ابھی یہاں سے روانہ ہو جاؤ۔ ارمانوس نے مجھے روک لیا ہے۔ وہ مجھے نہیں جانے دے رہا۔ وہ مجھے اپنے عوام کی تفریح کا سامان بنانا چاہتا ہے۔ تم چچا کو جاکر میری خیریت کی اطلاع کرنا اور سنو فکرمند نہ ہونا۔ مَیں موقع ملتے ہی یہاں سے بھاگ کر تم لوگوں سے آن ملوں گا۔ اب تم جاؤ مجھے بھی یہاں کے شاہی مہمان خانے بھیجا جا رہا ہے۔" یوسف پیچھے ہٹ کر تقریباً بھاگتا ہوا موت کے اس میدان سے باہر نکل گیا تھا۔

اسمٰعیل ارمانوس کی طرف واپس جانے کو جب مُڑا تو ایک طرف سے اطلسی قبا جیسی پُرکشش اور طلسمی خواب جیسی حسین صوفیہ تیز تیز قدم اُٹھاتی ہوئی اس کی طرف آئی۔ اس کے ہاتھ میں اسمٰعیل کا گُرز بھی تھا سادہ مرمر کا بُت اور مہتاب پیکر قریب آئی اور اپنی غنودہ سی پرفسوں پلکیں جھپکاتے ہوئے اس نے رسیلے نغموں کی سی آواز میں کہا۔ "سنو! سنو! خانہ بدوش! میری بات سنو!" اسمٰعیل رُک گیا اور مڑ کر صوفیہ کی طرف دیکھنے لگا۔ قریب آکر صوفیہ چند ثانیوں تک اسمٰعیل کے زخمی اور خون آلود شانے کو تشویش کی نگاہوں سے دیکھتی رہی پھر اس نے اپنے شہابی ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے پوچھا۔ "کیا اس بھرے میدان میں کوئی ایسا ہمدرد نہ تھا جو تمہارے زخم کی مرہم پٹی کر دیتا۔"

اسمٰعیل نے عجیب سی بے بسی میں کہا۔ "مَیں اس شہر میں اجنبی ہوں اور ایک اجنبی کو کون اہمیت دیتا ہے۔" صوفیہ نے بڑی چاہت اور ہمدردی میں کہا۔ "میرے ساتھ آؤ مَیں خود تمہاری مرہم پٹی کرتی ہوں۔" اسمٰعیل نے عجیب سے انداز میں اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "مَیں تو تمہارے باپ کا قاتل ہوں پھر تم مجھ سے اس قدر ہمدردی اور ترحم کا اظہار کیوں کر رہی ہو؟"

صوفیہ نے لذت کش نغمگی میں کہا۔ "موت کے اس میدان میں تم نے مرگ کا ایسا کھیل سر کیا ہے جس کی بنا پر ہر کوئی تم سے ہمدردی کا اظہار کرے گا اور پھر شاید یہ بات تمہارے لئے نئی ہو کہ مَیں مرنے والے اس تاجر کی بیٹی نہیں ہوں۔"

اسمٰعیل نے چونک کر پوچھا۔ تم اگر اس کی بیٹی نہیں ہو تو پھر کون ہو؟ صوفیہ نے ہلکے ہلکے مسکراتے ہوئے کہا۔ "اگر میں اس تاجر کی بیٹی ہوتی تو تمہیں کبھی معاف نہ کرتی۔ باپ کیسا ہی برا کیوں نہ ہو لیکن بیٹی اس کے قاتل کو معاف کر کے اس طرح ہمدردی کا اظہار نہیں کرتی جس طرح میں نے تمہیں معاف کر کے تم سے ہمدردی ظاہر کی ہے۔ میں کون ہوں یہ ایک راز ہے۔ اگر تم اس راز کو راز ہی رہنے کا عزم میرے ساتھ کرو تو میں تم سے اصل حالات کہہ دوں گی لیکن اگر تم نے میرے راز کو فاش کرنے کی کوشش کی تو میرے پاس بھی تمہارا ایک راز ہے میں اسے اگر کسی سے کہہ دوں تو قسطنطنیہ کے لوگ تمہیں ختم کرنے کے لیے تم پر ٹوٹ پڑیں گے۔

اسمٰعیل نے بوکھلائی ہوئی آواز میں کہا۔ "میرا کیسا راز ہے تمہارے پاس۔"

صوفیہ نے پھر پُرکیف تبسم میں کہا۔ "تم اس قدر بوکھلا کیوں رہے ہو قسم ہے مجھے اپنے صحرائی رسولؐ کی اگر اس وقت تمہارا راز میں نے تم سے کہہ دیا تو تم میری جان کے درپے ہو جاؤ گے۔ پر حوصلہ رکھو تمہارا راز میرا راز ہے اور وہ میرے سینے میں میری موت تک دفن رہے گا۔"

اسمٰعیل نے چونکتے ہوئے پوچھا۔ "یہ تم نے قسم کیسی کھائی ہے اور صحرائی رسولؐ سے تمہارا مطلب کیا ہے۔ کیا تم ——" اسمٰعیل کہتے کہتے رک گیا کیونکہ چار محافظ ان کی طرف آ رہے تھے۔ صوفیہ نے فوراً اسمٰعیل کا گوز اُسے تھماتے ہوئے کہا۔ "اسمٰعیل! اسمٰعیل! وہ چار محافظ ادھر آ رہے ہیں۔ تم اب جاؤ میں آج شام کے وقت تم سے ملنے شاہی مہمان خانے میں آؤں گی۔"

اس کے ساتھ ہی صوفیہ وہاں سے ہٹ گئی تھی۔ اسمٰعیل بیچارہ اُلجھن میں پڑ گیا تھا۔ وہ یہ نہ جان سکا تھا کہ صوفیہ کون ہے۔ صوفیہ نے اپنی گفتگو سے اسے حیرت اور پریشانی میں مبتلا کر دیا تھا۔ اتنی دیر تک وہ چار محافظ وہاں پہنچ گئے اور اسمٰعیل کو لے کر میدان سے باہر آئے۔ اسمٰعیل نے وہاں بندھا اپنا گھوڑا کھولا اور ان محافظوں کے ساتھ شاہی مہمان خانے کی طرف روانہ ہو گیا تھا۔

سورج سکوت آلود دھندلکوں کو نوید بقا دیتا ہوا اپنی تسکین و راحت، زینت و فرحت اور سعادت و بقا کی خاطر مغرب کی طرف غروب ہونے کو خوب جھک گیا تھا اسمٰعیل مہمان خانے کے ایک کمرے میں بیٹھا گہری سوچوں میں ڈوبا ہوا تھا اور کمرے سے ذرا فاصلے پر اس کی حفاظت اور نگرانی پر مامور چاروں محافظ چوکس اور مستعد بیٹھے ہوئے تھے۔ اتنے میں اسمٰعیل کو محافظوں کے ساتھ کسی کے اُلجھنے کی آوازیں سنائی دیں۔ اس نے جب باہر دیکھا تو وہاں صوفیہ اس کے محافظوں سے اُلجھ رہی تھی۔ اس نے اپنے آپ کو سفید چادر میں لپیٹ رکھا تھا۔ وہ اسمٰعیل کی طرف آنے کی کوشش کر رہی تھی اور محافظ اسے روک رہے تھے۔

اسمٰعیل اُٹھ کر باہر آیا اور ڈانٹنے کے انداز میں اس نے محافظوں سے کہا۔ "اسے مت روکو، اندر آنے دو۔ مجھے اس سے کوئی خطرہ نہیں ہے۔" محافظوں نے مزاحمت ترک کر دی اور صوفیہ تیز تیز قدم اُٹھاتی ہوئی آگے بڑھی۔ اسمٰعیل اسے لے کر اپنے کمرے میں آیا۔ اسمٰعیل نے اسے ایک نشست پر بٹھایا اور خود اس کے سامنے اپنی مسہری پر بیٹھتا ہوا وہ بڑی بے تابی سے بولا۔

"مقابلے کے میدان میں تم اپنے متعلق کہتے کہتے رک گئی تھیں۔ اب بتاؤ تم کون ہو اور یہاں قسطنطنیہ میں تمہارا قیام کس سلسلے میں ہے۔" صوفیہ نے اپنی وہی سرائیدہ زمزموں جیسی آواز میں کہا۔ "میں مسلمان ہوں اور میری حیثیت اس شہر میں ایک قیدی سے زیادہ نہیں ہے۔"

اسمٰعیل اسے شک و شبہ کی نگاہ سے دیکھنے لگا۔ صوفیہ نے سنجیدہ ہوتے ہوئے کہا۔ "میں جانتی ہوں، آپ مجھ پر بداعتمادی کا اظہار کریں گے لیکن پہلے میں جو کہنا چاہتی ہوں وہ سُنیں پھر میرے متعلق اپنی آخری رائے کا تعین کریں۔ لوگ جس تاجر کی مجھے بیٹی سمجھتے ہیں وہ مجھے کہیں سے اُٹھا لایا تھا۔ وہ تاجر کم اور بردہ فروش زیادہ تھا وہ مجھے ایسی کم عمری میں لایا کہ مجھے کچھ خبر نہیں، میرے باپ کون ہیں اور میرا تعلق مسلمانوں

کے کس شہر سے ہے۔ شروع میں میں بھی یہی سمجھتی رہی کہ تاجر میرا باپ تھا لیکن جب میں جوان ہوئی تو اس نے اپنی ساری جائداد میرے بجائے اپنے بھائی کے نام کرا دی جب میں نے احتجاج کیا تو اس نے صاف بتا دیا کہ اس نے مجھے رحم کھا کر پالا تھا اس نے یہ بھی بتایا کہ میں ایک مسلمان کی بیٹی ہوں جس کے مرنے پر میں اکیلی رہ گئی اور وہ مجھے اپنے گھر لے آیا۔ لیکن میرا دل نہیں مانتا۔ میرا اندازہ ہے تاجر مجھے کہیں سے اٹھا لایا تھا۔ چونکہ اس کے کوئی اولاد نہ تھی لہٰذا اس نے مجھے بیٹی بنا کر پال لیا۔ وہ مجھے بیچ ڈالتا میری خوب صورتی سے متاثر ہو کر اس نے مجھے بیٹی بنا لیا۔

اسمٰعیل نے غور سے صوفیہ کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ "تم نے یہ کیسے اندازہ لگا لیا کہ وہ تاجر تمہیں کہیں سے اٹھا کر لایا تھا؟"

"میں پہلے بھی کہہ چکی ہوں وہ تاجر کم اور بردہ فروش زیادہ تھا۔ میری زندگی میں وہ اَن گنت بار مسلمان لڑکیوں کو اٹھا کر لایا اور انہیں فروخت کر کے رقم وصول کرتا رہا۔ اس سے میں نے اندازہ لگایا وہ مجھے بھی کہیں سے اٹھا کر لایا تھا وہ اپنے بھتیجے مارسلیس سے میری شادی کرنا چاہتا تھا لیکن میں اسے ناپسند کرتی ہوں لہٰذا میں نے انکار کر دیا اس پر وہ تاجر مجھ پر سختی بھی کرنے لگا تھا۔ اب میں اس حویلی میں اکیلی ہوں اور مارسلیس کی طرف سے مجھے اپنی جان ہی نہیں عزت و عصمت کا بھی خطرہ ہے۔"

اسمٰعیل نے پھر کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ "تم نے جو مقابلے کے میدان میں یہ کہا تھا کہ تمہارے پاس میرا کوئی راز ہے وہ کیا ہے؟"

صوفیہ نے بے ساختہ و برجستہ مگر سرگوشی میں کہا۔ "وہ راز یہ ہے کہ آپ مسلمان ہیں"۔ اسمٰعیل نے چونکتے ہوئے پوچھا۔ "یہ اندازہ تم نے کیسے لگایا؟"

"جن لڑکیوں کی خاطر آپ نے تاجر کو قتل کیا تھا انہوں نے چند روز تک میرے ساتھ حویلی میں قیام کیا تھا۔ وہ میرے ساتھ خوب بے تکلف ہو گئی تھیں افسوس میں اُن کی کوئی مدد نہ کر سکی، وہ دونوں بہنیں مسلمان تھیں اور مسلمان لڑکیوں کی

رہائی کے لیے آنے والا ترک خانہ بدوش مسلمان ہی ہو سکتا ہے عیسائی نہیں"۔

اسمٰعیل غور سے صوفیہ کی طرف دیکھنے لگا تھا۔ صوفیہ نے خوش طبعی سے کہا۔ "آپ پھر مجھے بے اعتمادی سے گھورنے لگے؛ میں اگر آپ کی دشمن ہوتی تو موت کے اس میدان میں ارمانوس کے روبرو کہہ دیتی کہ آپ مسلمان ہیں۔ آپ کی حفاظت اور خوشی اب میرے ایمان کا ایک حصّہ ہے۔ اب جب کہ میں اپنے متعلق آپ سے سب کچھ کہہ چکی ہوں آپ بتائیے آپ کا اصل نام کیا ہے، آپ کون اور کہاں سے آئے ہیں؟"

اسمٰعیل نے مدھم آواز میں کہا۔ "میں واقعی مسلمان ہوں۔ میرا اصل نام اسمٰعیل ہی ہے اور میں ترک خانہ بدوش ہوں۔ میں جن دو لڑکیوں کے تعاقب میں آیا تھا انہیں میں رہا کرا چکا ہوں۔ اب میں ان مسلمان قیدیوں کی رہائی کا انتظام کروں گا جو ہزاروں کی تعداد میں قسطنطنیہ شہر میں بے بسی اور کسمپرسی کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ میں قسطنطنیہ میں داخل ہونے کے بعد دو بار انہیں دیکھ چکا ہوں۔ ان کی حالت قابلِ رحم ہے۔ ان کو غذا کم ملتی ہے اور ان پر مظالم زیادہ ہوتے ہیں"۔

صوفیہ اداس ہو گئی پھر اس نے پُرنم آنکھوں میں کہا۔ "میں ان مسلمان قیدیوں میں اکثر جاتی رہی ہوں۔ ان میں ایک بوڑھے بزرگ جو مسلمان ہیں اور ارمانوس کے ہاتھوں تباہ ہونے والے شہر کے قاضی ہیں۔ میں کئی بار ان سے ملنے گئی اور انہوں نے مجھے اپنے مذہب کے متعلق بہت کچھ بتا دیا ہے۔ حالانکہ اس سے قبل اپنے مذہب سے میں بالکل ناواقف تھی۔ اب میں نماز پڑھ سکتی ہوں اور اپنے مذہب کے بنیادی اصولوں سے بھی آگاہ ہوں"۔

صوفیہ چند ثانیوں تک خاموش رہی پھر اس نے غور سے اسمٰعیل کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ "آپ نے ابھی ابھی کہا تھا کہ آپ مسلمان قیدیوں کی رہائی کا انتظام کریں گے۔ اگر یہ ممکن نہیں ہے تو ان کی رہائی کیسے اور کس طرح عمل میں آئے گی؟"

اسمٰعیل نے سوچتے ہوئے کہا۔ "اس کے لیے میں الپ ارسلان کے پاس جاؤں گا"۔ ——— "یہ الپ ارسلان کون ہے؟"

"یہ ایک طاقت ور اور مذہب کا پابند مسلمان سلطان ہے۔ میرا دل کہتا ہے جب اسے خبر ہوگی کہ ارمانوس نے ہزاروں مسلمان مرد عورتوں کو قیدی بنا رکھا ہے تو وہ ارمانوس کو ان کی رہائی پر مجبور کر دے گا۔"

صوفیہ نے کچھ دیر خاموش رہ کر پوچھا "لیکن آپ کے باہر نکلنے پر تو پابندی ہے پھر آپ اس سلطان کے پاس کس طرح جا سکیں گے؟" ——— "میں کسی نہ کسی طرح یہاں سے بھاگ جاؤں گا۔" صوفیہ اُداس ہوگئی اور اس کی گردن یوں جھک گئی تھی گویا طلسم روز و شب میں وہ اپنے ہوش و دانش کھو بیٹھی ہو۔ اس کی حالت ایسی ہوگئی تھی جیسے بھوک، سردی اور بدحالی کا مارا ہوا کوئی مسافر۔

اسمٰعیل نے پہلی بار اس کا گوشت سے بھرا بھرا گداز اور گلابی بازو پکڑ کر ہلاتے ہوئے پوچھا "تم کہاں کھو گئی ہو؟ یاد رکھو! اب میرا اور تمہارا ایک رشتہ اور ناطہ ہے۔ میں اس شہر میں تمہیں دوسروں کے رحم و کرم پر تنہا چھوڑ کر نہ جاؤں گا۔"

صوفیہ کی آنکھیں ستاروں کی مانند چمک اٹھیں، اس نے اس طرح اپنا سر اوپر اٹھایا گویا اس کے سوکھے دل کی نمی لوٹ آئی ہو۔ پھر اس نے نقرئی گھنگھروں کی اچانک بلند ہونے والی صدا جیسی آواز میں پوچھا "کیا آپ مجھے اپنے ساتھ لے کر جائیں گے؟" ——— "ہاں میں تجھے یہاں سے نکال کر اپنے ساتھ لے جاؤں گا۔" صوفیہ کے ہونٹوں پر لذت فروش مسکراہٹ اور چہرے کی زیتونی رنگت پر صبح کی روشنی جیسی معجز اثری بکھر گئی تھی۔

اسمٰعیل نے اس بار صوفیہ کا نازک ہاتھ اپنے سخت اور کھردرے ہاتھ میں لیتے ہوئے کہا۔ "اگر تم برا نہ مانو تو ایک بات پوچھوں؟" صوفیہ نے اپنی بھاری اور دراز پلکیں اٹھاتے ہوئے پھول سے کومل اور شہد سے میٹھے لہجے میں کہا "آپ پوچھیں میں آپ کی کسی بات کا برا نہ مانوں گی۔" اسمٰعیل نے پیار بھرے لہجے میں کہا۔ "میں اس دنیا میں تنہا ہوں، تم بھی اکیلی ہو۔ ہم دونوں کو ایک دوسرے کے سہارے کی ضرورت ہے۔ یہاں سے لے جا کر میں تم سے شادی کر لوں گا۔"

صوفیہ کا سرخ مونگے سا بدن کپکپا اٹھا۔ اس کے چہرے پر کنیزانِ شبستان کی سی سرخی بکھر گئی تھی اور ——— اور پھر اس نے بنتِ حوا کی بھرپور سحر کاری میں کہا۔ "میں یہ کہہ کر فخر محسوس کروں گی کہ آپ میرے ہیں۔"

اسمٰعیل نے صوفیہ کا ہاتھ چھوڑتے ہوئے کہا "اب مجھے یہ سوچنا ہوگا کہ ہم دونوں کس طرح یہاں سے جان بچا کر بھاگ سکتے ہیں۔" اسمٰعیل اٹھا اور اپنے بستر سے ایک بھاری اونی چادر اٹھا کر صوفیہ کے اوپر پھیلاتے ہوئے کہا "یہ اچھی طرح اوڑھ لو۔ سردی زیادہ ہوگئی ہے۔"

صوفیہ نے اپنے آپ کو اس گرم چادر میں اچھی طرح ڈھانپتے ہوئے کہا "میرے ذہن میں یہاں سے بھاگ نکلنے کا ایک آسان اور قابلِ عمل طریقہ ہے۔" اسمٰعیل نے متوجہ ہوتے ہوئے کہا "تو پھر کہو، اب تک خاموش کیوں ہو؟"

صوفیہ نے کہنا شروع کیا "اس شہر کے شمال مشرق میں ایک وسیع جنگل ہے جہاں قسطنطنیہ کے رئیس اور نائٹ شکار کرنے جاتے ہیں۔ آپ بھی کسی روز اپنے محافظوں کو لے کر وہاں شکار کے لیے چلیں میں بھی آپ کے ساتھ ہوں گی۔ میں اپنے گھر سے اپنے زیورات، اپنی جمع شدہ پونجی اور کچھ اور اثاثہ بھی ساتھ لے لوں گی لیکن اس معاملے میں آپ کو اپنی روایتی شجاعت کا مظاہرہ کرنا ہوگا۔ آپ اس جنگل میں ان چاروں محافظوں کو قتل کر دیں اور پھر ہم وہاں سے اپنی منزل کی طرف بھاگ جائیں گے لیکن یہ اسی صورت میں ہو سکتا ہے اگر آپ چاروں محافظوں کو زیر کرنے میں کامیاب ہو جائیں۔ ان سے نمٹنے میں میں بھی آپ کی مدد کروں گی۔"

اسمٰعیل نے صوفیہ کے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا "تم فکر مند نہ ہو، یہ تو صرف چار محافظ ہیں۔ خدا کی قسم اگر یہ چھ ہوتے تب بھی میں ان سے ٹکرا جاتا۔ یہاں سے بھاگ نکلنے کا بندوبست ہو گیا۔ تمہاری تجویز نہایت معقول اور قابلِ عمل ہے اب تم یہ بتاؤ، تم واپس گھر جاؤ گی یا یہیں میرے پاس رہو گی؟"

صوفیہ نے چونکتے ہوئے کہا "میں اب واپس نہ جاؤں گی۔ جس روز یہاں

سے جانا ہوا میں آپ کے ساتھ جاکر وہاں سے اپنے زیورات اور نقدی لے لوں گی میں اب یہیں آپ کے پاس رہوں گی ۔ وہاں مارسلیس کے ہاتھوں میری جان اور عزت محفوظ نہ ہوگی "۔ اسمٰعیل کھڑا ہوتا ہوا بولا " تو پھر تم یہیں رہو گی "۔ پھر اس نے اشارے سے ایک محافظ کو بلایا اور وہ جب بھاگتا ہوا اسمٰعیل کے پاس آیا تو اسمٰعیل نے کہا " کیوں بھائی یہاں ہمیں کھانا نہ ملے گا ؟"

اس محافظ نے پلٹتے ہوئے کہا۔ " میں ابھی کھانا لاتا ہوں "۔ اسمٰعیل نے اسے پکارا " ٹھہرو ! رک جاؤ ' میری بات تو سنو ! " محافظ جب دوبارہ اسمٰعیل کے سامنے آکھڑا ہوا تو اسمٰعیل نے کہا " جو لڑکی مجھے ملنے آئی ہے اس کے لیے بھی کھانا لے کر آنا ۔ اب یہ یہیں میرے پاس ہی رہے گی ۔ اور میں عنقریب اس سے شادی کروں گا "۔

اس محافظ کے لبوں پر مسکراہٹ پھیل گئی تھی ۔ جب وہ پلٹنے لگا تو اسمٰعیل نے پھر کہا " اپنے کسی ساتھی کو بھیج کر کمرے کا آتش دان بھی گرم کر دو ۔ سردی بڑھ گئی ہے اور کمرہ کافی ٹھنڈا ہو گیا ہے "۔ وہ محافظ چلا گیا ، اسمٰعیل پھر کمرے میں آکر صوفیہ کے پاس بیٹھ گیا تھا ۔ اتنے میں ایک اور محافظ لکڑیوں کا گٹھا اٹھائے کمرے میں آیا اور آتش دان میں آگ روشن کرنے لگا ۔

اسمٰعیل نے اس محافظ کو مخاطب کر کے پوچھا " اے میرے دوست ! کب تک مجھے اس مہمان خانے میں محصور رہنا پڑے گا "۔ محافظ نے بے بسی کا اظہار کرتے ہوئے کہا " یہ تو ہمارا بادشاہ ارمانوس ہی بتا سکے گا "۔ اسمٰعیل نے اصل موضوع کی طرف آتے ہوئے پوچھا " کیا میں یہاں شکار بھی نہیں کر سکتا " ؟ آتش دان میں آگ روشن ہو گئی تھی لہٰذا اس محافظ نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا " آپ ہماری نگرانی میں شکار کر سکتے ہیں "۔ اسمٰعیل نے انجان بن کر پوچھا " کیا یہاں کوئی شکارگاہ ہے "۔

محافظ نے قریب آکر کہا " شہر سے شمال مغرب میں ایک بڑی اور وسیع شکارگاہ ہے "۔ اسمٰعیل نے فیصلہ کن انداز میں کہا " تو پھر اپنے ساتھیوں سے کہنا پرسوں صبح ہی صبح ہم شکار کے لیے اس شکارگاہ کی طرف جائیں گے "۔

محافظ نے باہر نکلتے ہوئے اثبات میں سر ہلا کر کہا " ضرور چلیں گے "۔

تھوڑی دیر بعد دوسرا محافظ کھانا لے آیا اور وہ دونوں آتش دان کے قریب بیٹھ کر کھانا کھا رہے تھے ۔

تیسرے روز سخت سردی کے باوجود اسمٰعیل اپنے چاروں محافظوں کے ساتھ شکار کے لیے شہر سے نکلا ۔ صوفیہ بھی اس کے ساتھ تھی ۔ اس نے تاجر کے گھر سے نہ صرف اپنے لیے گھوڑا حاصل کیا تھا بلکہ تاجر کی ساری نقدی ' اس کے زیورات اور کچھ اور اثاثہ بھی اس نے اپنے ساتھ لے لیا تھا ۔ اس کے علاوہ سردی سے بچنے کے لیے اس نے اپنے گھوڑے کی زین سے ایک بستر بھی باندھ رکھا تھا ۔ شہر سے باہر نکل کر شمال مغرب کے رخ پر انھوں نے اپنے گھوڑوں کو سرپٹ دوڑا دیا تھا ۔

جب وہ شہر سے بارہ چودہ میل دور اس جنگل کے قریب پہنچے تو اچانک اسمٰعیل نے اپنی ڈھال سنبھالی اور تلوار کھینچ کر اپنے محافظوں پر حملہ کر دیا ۔ دو لگاتار اور تیز وار کر کے اس نے دو محافظوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا ۔ دوسرے دونوں محافظ مستعد ہو گئے اور اپنے آپ کو مسلح کر کے وہ مقابلے کے لیے تیار ہو گئے تھے ۔ صوفیہ اپنے گھوڑے کو ایڑ لگا کر اسمٰعیل کے پیچھے لے آئی تھی ۔

دونوں محافظ قہر آلود نگاہوں سے اسمٰعیل کی طرف دیکھ رہے تھے ۔ پھر ان میں سے ایک نے غضب ناک ہو کر پوچھا " اے خانہ بدوش ! تو نے ہمارے دو ساتھیوں کو کیوں اور کس بنا پر قتل کر دیا ہے " ؟ اسمٰعیل نے اپنی خون آلود تلوار لہراتے ہوئے کہا ۔ تمہارے دو ساتھیوں کو ختم کرنے کے بعد اب میں تم پر نازل ہوں گا ۔

میں تمہاری حفاظت اور نگرانی قبول نہیں کرتا۔"

دونوں محافظ حملہ آور ہونے کو پر تول رہے تھے۔ اسمٰعیل بھی اپنے آپ کو پوری طرح تیار کر چکا تھا۔ دونوں محافظوں نے اپنے گھوڑوں کو ایڑ لگائی اور حملہ آور ہوئے۔ اسمٰعیل بھی اپنے گھوڑے کو ایڑ لگا کر ان دونوں کے درمیان آیا۔ ایک کا وار اس نے اپنی ڈھال اور دوسرا اپنی تلوار پر لیا۔ اس نے پاؤں کی ایک سخت ٹھوکر مار کر ان دونوں میں سے ایک کو اس کے گھوڑے سے نیچے گرا دیا۔ ساتھ ہی وہ خود بھی اپنے گھوڑے سے کود گیا اور جو محافظ گھوڑے سے نیچے گرا تھا اس کی گردن کاٹ دی۔

آخری محافظ ایسا خوفزدہ ہوا کہ اس نے اپنے گھوڑے کو موڑا اور اسے ایڑ لگا کر بھاگ کھڑا ہو۔ پلک جھپکتے میں اسمٰعیل نے اپنے لباس کے اندر سے خنجر نکالا اُسے لہرایا اور تاک کر مارا۔ تیز دھار اور چوڑے پھل کا خنجر بھاگنے والے محافظ کا دل چیرتا ہوا نکل گیا۔ اپنے گھوڑے پر تھوڑی دور تک وہ لڑکھڑایا پھر نیچے گر کر ٹھنڈا ہو گیا۔

اسمٰعیل بھاگ کر اس کی طرف گیا اور اپنا خنجر نکال کر اسے پونچھا اور میان میں ڈال کر اس نے دیکھا وہ محافظ بھی مر چکا تھا۔ اسمٰعیل نے صوفیہ کے قریب آ کر پوچھا۔

"کیا میں نے تمہاری خواہش کے مطابق عمل نہیں کیا؟"

صوفیہ کے سُرخ لبوں پر مسکراہٹ بکھر گئی اور اس کے گہرتاب دانت اس کے حُسن اور اس کی کشش میں اور اضافہ کرنے لگے تھے پھر اس نے اسمٰعیل کی طرف دیکھتے ہوئے اپنی پوری مٹھاس سے کہا "آپ ایک ایسے جوان ہیں جس پر شرق و غرب قربان کیا جا سکتا ہے۔ میں جانتی تھی محافظوں سے نمٹتے ہوئے آپ کو دشواری کا سامنا نہ کرنا پڑے گا۔"

اسمٰعیل نے اپنے گھوڑے پر سوار ہوتے ہوئے کہا "اب ہمیں یہاں سے بھاگ نکلنا چاہیے ورنہ ہمارے لیے خطرات پیدا ہو سکتے ہیں"۔ اس کے ساتھ ہی ان دونوں نے اپنے گھوڑوں کو ایڑ لگائی اور شمال مشرق کے رُخ وہ اُنہیں سرپٹ دوڑا رہے تھے۔

قسطنطنیہ کی حدود سے نکل کر اسمٰعیل اور صوفیہ بحرِ اسود کے کنارے کنارے مشرق کی طرف سفر کر رہے تھے۔ ان دونوں کی منزل سلطان الپ ارسلان[1] تھا جو ان دنوں میں صوبہ آذربائیجان میں خوئی شہر کے قریب خیمہ زن تھا۔ دونوں نے راستے میں بہت کم قیام کیا تھا صرف اپنے کھانے اور گھوڑوں کو آرام دینے کی خاطر دونوں تھوڑی دیر رکتے اور دوبارہ اپنے سفر پر روانہ ہو جاتے تھے۔ لاذ شہر کے پاس آ کر آذربائیجان کی طرف جانے کے لیے انہوں نے اپنا رُخ جنوب مشرق کی طرف کر لیا تھا۔

ایک روز شام سے تھوڑی دیر قبل جب کہ وہ دونوں دریائے ارس[2] کے ایک چوبی پُل کو پار کر رہے تھے شمال کی طرف سے چیختی چنگاڑتی آندھی اُٹھی۔ اسمٰعیل نے اپنے گھوڑے کو ایڑ لگاتے ہوئے فکرمندی سے کہا۔ "صوفیہ! صوفیہ! اپنے گھوڑے کو تیزی سے ہانکو شمال کی طرف دیکھو کیسی ہولناک آندھی اُٹھی ہے۔ اس کی آمد سے پہلے پہلے ہمیں دریا پار کر کے کسی مناسب جگہ اپنے آپ کو محفوظ کر لینا چاہیے ورنہ شمال کی طرف سے اُٹھنے والی یہ سُرخ آندھی ہمارے لیے خطرناک بھی ثابت ہو سکتی ہے۔ اگر یہ اپنے ساتھ برف باری کا طوفان بھی لے آئی تو ہمارے لیے کئی مسائل اُٹھ کھڑے ہوں گے۔"

صوفیہ نے اپنے گھوڑے کو ایڑ لگا کر اس کی رفتار تیز کر دی تھی۔ ہوا اب

---

[1] سلطان الپ ارسلان سلجوقی ترکوں کے بانی سلطان طغرل بیگ کا بھتیجا تھا۔ طغرل بیگ کے ہاں کوئی لڑکا نہ تھا لہٰذا الپ ارسلان کو اپنا جانشین مقرر کیا۔ الپ ارسلان اپنی یگانہ خصوصیتوں کے باعث سلطانوں کی صف میں ممتاز مقام رکھتے ہیں۔ شجاعت میں بے مثل۔ اعتقاد و عمل میں اسلامیت کا پیکر اور رعایا کا انتہائی ہمدرد تھا۔ سلطان الپ ارسلان ان چند مسلمان حکمرانوں میں سے ایک تھے جو سینکڑوں کے ساتھ ہزاروں پر غالب رہنے کا فن جانتے تھے۔

[2] یہ دریا آرمینیا کے کوہستانی سلسلے سے نکل کر مشرق کی طرف بہتا ہوا بحرِ خزر میں جا گرتا ہے۔

لمحہ بہ لمحہ سرکشی اختیار کرتی آندھی میں بدلتی جا رہی تھی۔ دریائے ارس کے اس پار جا کر وہ کوہستانی سلسلے میں گھس کر شمال کی طرف سے اُٹھنے والی آندھی سے بچنے کی خاطر کوئی پناہ گاہ تلاش کرنے لگے تھے۔

سورج گو ابھی غروب نہ ہوا تھا پھر بھی آندھی کے باعث فضاؤں میں ہول آفرین اندھیرا چھا گیا تھا۔ کچھ دیر تک وہ کوہستانوں کے اندر گھومتے رہے لیکن انہیں کوئی ایسی جگہ نہ ملی جہاں وہ گھس کر اپنے آپ کو محفوظ کر لیتے۔ ایک تنگ راستے میں سے گزرتے ہوئے اسمٰعیل نے دیکھا دونوں جانب بڑی بڑی سیاہ چٹانیں آگے کو بڑھی ہوئی تھیں دونوں چٹانیں کافی حد تک آپس میں ملی ہوئی تھیں اور راستے میں اُوپر ایک چھت سا بن گیا تھا۔ اس کے علاوہ ان چھت نما چٹانوں کا شمالی حصّہ قدرے بلند تھا اور وہاں رک کر وہ آندھی کی مار سے بھی بچ سکتے تھے۔

اپنے گھوڑے کو وہاں روکتے ہوئے اسمٰعیل نیچے اُترا اور صوفیہ سے کہا۔ "صوفیہ! صوفیہ! جلدی جلدی گھوڑے سے اُتر جاؤ۔ آندھی کی زوردار لہریں اب ان کوہستانوں میں داخل ہونے والی ہیں۔ ہمیں اپنا اور گھوڑوں کے بچاؤ کا بندوبست کر لینا چاہیئے۔"

صوفیہ نیچے اُتر گئی۔ اسمٰعیل نے دونوں گھوڑوں کو ان چٹانوں کے نیچے ایک پتھر سے باندھ دیا اور خود وہ دونوں بھی چٹانوں کی شمالی دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئے۔ تھوڑی ہی دیر بعد تیز آندھی کے زوردار جھونکے کوہستانوں سے ٹکرا کر خوفناک آوازیں پیدا کرنے لگے تھے۔ سورج اب غروب ہو گیا تھا اور گہرا سیاہ اندھیرا ہر سُو پھیل گیا تھا۔ آندھی ایسی تیز اور زوردار چلی تھی کہ کائنات کی ہر شے پر اعصاب کا فشار اور اختلاج قوا طاری ہو گیا تھا۔ کوہستانوں پر کھڑے املی، جنڈ اور سانگر کے درخت کچھ جڑ سے اکھڑ گئے تھے اور کچھ ویسے ٹوٹ کر گر پڑے تھے۔ کافی دیر تک کوہستانی سلسلے کے اندر گرد اور بجری کے چھوٹے چھوٹے ذرّے اُڑتے رہے اور کوہستانوں کے ننھے ننھے پودے اور جڑی بوٹیاں تیز آندھی میں سسکتی رہیں۔

جب بارش تھمی تو ہلکی ہلکی بوندا باندی شروع ہو گئی۔ اسمٰعیل فوراً اُٹھا اور صوفیہ سے کہا۔ "بوندا باندی شروع ہو گئی ہے۔ اگر بارش تیز ہو گئی یا برف گرنے لگی تو ہم یہاں زیادہ دیر تک نہ بیٹھ سکیں گے۔ ہمیں اپنے اُوپر دونوں پتھروں کے خلا کو ڈھانپنا چاہیئے۔ تاکہ بارش یا برف سے محفوظ رہ سکیں۔"

صوفیہ بھی کھڑی ہو گئی اور گھوڑے کی زین سے بندھا ہوا اپنا بستر کھولتے ہوئے کہا۔ "چمڑے کی جس چادر میں میرا بستر بندھا ہوا ہے اُسے ہم پتھروں پر پھیلا کر بارش سے محفوظ رہ سکتے ہیں۔" اسمٰعیل نے خود جلدی جلدی صوفیہ کا بستر کھولا۔ چمڑے کی چادر اس نے علیحدہ کی پھر چٹان کے اُوپر چڑھا پھر وہ جن دو آگے کی سمت اُبھری ہوئی چٹانوں کے بیٹھے ہوئے تھے ان کی درمیانی خلا پر چمڑے کی چادر پھیلا کر اس نے اُوپر چند پتھر رکھ دیئے تھے تاکہ تیز ہوا میں چادر اُڑنے نہ پائے۔ اب وہ نیچے بیٹھ کر بارش سے اپنے گھوڑوں سمیت محفوظ رہ سکتے تھے۔

اسمٰعیل دوبارہ نیچے آیا اور گھوڑوں کے خوراک کے تھیلے بھرے ہوئے توبرے کھولتے ہوئے صوفیہ سے کہا۔ "اچھا ہوا ہم نے لاز شہر سے توبرے خوراک سے بھرا لیے تھے۔" دونوں توبرے کھول کر اس نے گھوڑوں کو چڑھا دیئے پھر اپنے گھوڑے کی زین سے لٹکتا ہوا اپنا جنگی کلہاڑا کھولا اور صوفیہ سے کہا۔ "صوفیہ! صوفیہ! تم یہاں گھوڑوں کے پاس بیٹھو میں لکڑیاں کاٹ کر لاتا ہوں۔ بارش اگر تیز ہو گئی تو آگ کے بغیر یہاں بیٹھنا مشکل ہو جائے گا۔"

صوفیہ کھڑی ہوتی ہوئی بولی۔ "میں بھی آپ کے ساتھ چلتی ہوں۔ جو کام آپ اکیلے کریں گے وہ ہم دونوں مل کر جلدی کر لیں گے۔" اسمٰعیل خاموش رہا اور صوفیہ اس کے ساتھ ہو لی تھی۔

جب وہ دائیں جانب کے پہاڑ پر چڑھے تو انہوں نے دیکھا وہاں کئی املی اور سانگر کے خشک اور سرسبز درخت کچھ جڑ سے اُکھڑ کر اور کچھ ویسے ٹوٹ کر گرے تھے۔ اسمٰعیل ایسے ہی ایک گرے ہوئے درخت کو کاٹنے لگا اور صوفیہ کٹی ہوئی لکڑیاں اُٹھا اُٹھا کر اپنی جائے پناہ میں لے جانے لگی تھی۔ آٹھ دس پھیرے لگانے کے بعد صوفیہ تھکی تھکی اُوپر آئی اور ہانپتے ہوئے کہا۔ "اسمٰعیل! اسمٰعیل! بس کرو، بہت لکڑیاں ہو

گئی ہیں اُنہیں ہم صبح تک جلاتے رہیں تو بھی ختم نہ ہوں گی"۔

اسمٰعیل کلہاڑا چلاتے چلاتے رُک گیا اور مسکرا کر صوفیہ کی طرف دیکھتے ہوئے پیار سے کہا۔ "تم تھک گئی ہو۔ میں نے کہا تھا نا تم وہیں گھوڑوں کے پاس بیٹھی رہو"۔ صوفیہ آگے بڑھی اور اسمٰعیل کے ہاتھ سے کلہاڑا لیتے ہوئے کہا۔ "ہاں میں تھک ضرور گئی ہوں لیکن اسمٰعیل! آج اس اندھیری اور طوفانی رات میں زندگی کے لیے جد و جہد کرنے میں میں نے جو آپ کے ساتھ کام کیا ہے اس کا لطف اور سکون انوکھا ہے اور اپنی زندگی میں مجھے ایسا سکون کبھی نہ مِلا تھا حالانکہ اس تاجر نے بڑے پُرآسائش ماحول میں میری پرورش کی تھی"۔

اسمٰعیل نے مسکرا صوفیہ کی طرف دیکھا پھر کٹی ہوئی لکڑیاں اُٹھا کر وہ واپس چل دیا۔ صوفیہ اس کا کلہاڑا اُٹھائے اس کے ساتھ ہولی تھی۔

اپنی اس مصنوعی پناہ گاہ میں آ کر دونوں نے آگ روشن کی۔ گھوڑے خاموشی سے اپنے توبروں سے خوراک کھا رہے تھے۔ صوفیہ نے اپنا بستر کھول کر آگ کے الاؤ کے پاس بچھا دیا پھر اس نے اپنے گھوڑے کی خرجین سے کھانے کی چیزیں نکالیں اور اُنہیں بستر پر رکھتے ہوئے اس نے اسمٰعیل سے کہا۔ "آئیے، کھانا کھائیں"۔

اسمٰعیل خاموشی سے صوفیہ کے سامنے بستر پر بیٹھ گیا اور دونوں مِل کر کھانا کھانے لگے تھے۔ کھانے کے بعد اسمٰعیل نے مشکیزے سے پانی پیا اور جب وہ کلی کرنے چھت نما چٹانوں سے باہر نکلا تو اس نے چلّا کر کہا۔ "صوفیہ! صوفیہ! اِدھر دیکھو"۔ صوفیہ بھاگ کر اس کے پاس آئی اور پریشانی میں پوچھا۔ "کیا ہوا؟" اسمٰعیل نے باہر اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "دیکھو برفباری شروع ہو گئی ہے"۔

صوفیہ نے دیکھا واقعی برف باری ہونے لگی تھی اور زمین آہستہ آہستہ سفید ہوتی جا رہی تھی۔ دونوں پھر الاؤ کے پاس آ کر بیٹھ گئے۔ اسمٰعیل نے اپنے گھوڑے کی زین اُتارتے ہوئے کہا۔ "میں گھوڑوں کی زینیں ہی اُتار دوں۔ اب ہمارے لیے صبح تک سفر کرنا مشکل ہو گیا ہے۔ رات ہمیں اسی الاؤ اور ان ہی چٹانوں کے نیچے بسر کرنا ہو گی۔ تم بستر پر سو جاؤ ان کوہستانی ویرانوں کے اندر میں جاگ کر پہرہ دوں گا، ایسا نہ ہو ہم دونوں سو

اور کوئی جنگلی درندہ ہمیں گھوڑوں سمیت پھاڑ کھائے"۔

صوفیہ نے الاؤ میں اور لکڑیاں ڈالتے ہوئے کہا۔ "اگر ایسا ہے تو میں بھی نہیں ں گی، دونوں بیٹھ کر باتیں کرتے ہیں اس طرح یہ برفانی اور ویران رات آسانی کٹ جائے گی"۔ اسمٰعیل مان گیا، دونوں الاؤ کے پاس بستر پر بیٹھے اور ایک دوسرے اپنے ماضی کے حالات کہہ کر وہ رات بسر کرنے کی کوشش کرنے لگے تھے۔

رات کے پچھلے حصے میں برف باری رُک گئی تھی اور دامنِ آسمان پر ستاروں کے ان اپنی اپنی منزل کی طرف رواں ہو گئے تھے۔ فجر کی نماز کے بعد اسمٰعیل نے صوفیہ کے ساتھ سے کوچ کیا۔ چاروں طرف برف سے ڈھکی ہوئی زمین سفید بلور کی طرح چمک رہی تھی ج دُور مغرب میں کوہستان قفقاز کے پیچھے سے نمودار ہوا تھا۔ دھوپ تیز ہوتے ہی رات طوفان اور برف باری سے بھوکے اور خوفزدہ پرندے رزق کی تلاش میں نیلی فضاؤں اندر پرواز کرنے لگے تھے۔

دونوں اپنے گھوڑوں کو ایڑ لگا کر تیزی سے جنوب مشرق کی طرف بڑھنے لگے تھے۔ ے روز دوپہر سے ذرا پہلے انہوں نے خیوا شہر سے باہر خیموں کا ایک شہر دیکھا اور کے ہونٹوں پر اطمینان بخش مسکراہٹ بکھر گئی تھی۔ صوفیہ نے مسکرا کر پوچھا۔ "اسمٰعیل! ل! کیا یہ سلطان الپ ارسلان کے لشکر کا پڑاؤ ہے؟" اسمٰعیل نے بھی خوشی کا اظہار ے ہوئے کہا۔ "یقیناً یہ سلطان الپ ارسلان ہی کا لشکر ہے۔ اس کے علاوہ اس قدر ڑاؤ کس کا ہو سکتا ہے"۔

اتنے میں راستے کے بائیں طرف اسمٰعیل کی نگاہ ایک چرواہے پر پڑی جو گھاس رے وسیع میدان میں بھیڑ بکریوں، گھوڑوں اور اونٹوں کے ریوڑ کو چرا رہا تھا۔ نے اپنے گھوڑے کو بائیں طرف موڑتے ہوئے کہا۔ "صوفیہ! صوفیہ! آؤ اس چرواہے کرتے ہیں خیموں کا یہ شہر کس کا ہے"۔ صوفیہ نے بھی اپنے گھوڑے کو موڑ کر اسمٰعیل ے پیچھے لگا دیا تھا۔

دونوں چرواہے کے پاس آئے اور اسمٰعیل نے اپنے گھوڑے پر بیٹھے ہی بیٹھے اس

چرواہے سے پوچھا۔" اے میرے بھائی! کیا یہ خیموں کا شہر سلطان الپ ارسلان کے لشکر کا پڑاؤ ہے؟" چرواہے نے دونوں کو غور سے دیکھنے کے بعد کہا۔" تمہارا اندازہ درست ہے۔ یہ پڑاؤ سلطان الپ ارسلان ہی کا ہے۔ یہ ریوڑ جو میں چرا رہا ہوں یہ بھی لشکر ہی کا ہے تم دونوں کہاں سے آئے ہو اور کیوں سلطان کا پوچھ رہے ہو؟"

اسمٰعیل نے دوبارہ اپنے گھوڑے کو ایڑ لگاتے ہوئے کہا۔" ہم دونوں قسطنطنیہ سے سلطان کے پاس ایک فریاد لے کر آئے ہیں"۔ چند قدم آگے بڑھ کر اسمٰعیل پھر مڑا اور چرواہے سے پوچھا کہ تم مجھے سلطان کا حلیہ بتا سکتے ہو کہ اسے پہچاننے میں مجھے دقت نہ ہو" چرواہے نے ہاتھوں میں پکڑی ہوئی چھڑی زمین پر مارتے ہوئے کہا۔" قد خوب لمبا، بدن بھاری نہ پتلا، چہرہ سُرخ اور پُر از جلال، داڑھی آدھی سفید آدھی بھوری، سر پر سفید عمامہ، پاؤں میں سُرخ موزے"۔ اسمٰعیل اس چرواہے کے حلیہ بتانے کے انداز پر ہنس دیا اور گھوڑے کو موڑ کر وہ پھر آگے بڑھنے لگا تھا۔

دونوں خیموں کے شہر میں داخل ہوئے اور لشکریوں سے سلطان کے متعلق پوچھتے ہوئے آگے بڑھتے رہے۔ سلطان الپ ارسلان اس وقت اپنے خیمے سے باہر ایک بڑی چٹائی پر دھوپ میں اپنے بیٹے محمد شاہ، افواج کے سپہ سالار اتسز، لشکر کے قاضی ابو نصر محمد بن عبدالملک بخاری اور اپنے چھوٹے بیٹے تاج الدولہ[1] کے ساتھ بیٹھا باتیں کر رہا تھا کہ اسمٰعیل اور صوفیہ اُن کے قریب آ کر اپنے گھوڑوں سے اُترے۔

اپنے گھوڑے کی باگ پکڑے اسمٰعیل چند قدم آگے بڑھا۔ سلطان الپ ارسلان کو وہ چرواہے کے بتائے ہوئے حلیے سے پہچان گیا تھا لہٰذا اس نے سلطان کی طرف منہ کر کے سلام کیا۔ سلطان اور اس کے ساتھیوں نے پُرتپاک انداز میں سلام کا جواب دیا۔ قبل اس کے کہ اسمٰعیل کچھ کہتا سلطان نے خود ہی پوچھ لیا۔" اے اجنبی! تم کون ہو؟ کہاں سے آئے ہو؟ تمہارے ساتھ یہ لڑکی کون ہے اور تم دونوں کس غرض سے میرے پاس آئے ہو؟"

---

[1] اس کا اصل نام تتش تھا۔ تاج الدولہ اس کا لقب تھا۔

جواب میں اسمٰعیل کچھ کہنے والا تھا کہ سلطان نے پھر بول کر کہا۔" ٹھہرو! آگے بڑھ کر چٹائی پر بیٹھ جاؤ پھر کہو کیا کہنا ہے"۔ اسمٰعیل آگے بڑھا اور جوتے اُتار کر چٹائی پر بیٹھ گیا۔ سلطان نے اس بار صوفیہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ اے بیٹی! تو بھی اپنے گھوڑے کی باگ چھوڑ دے اور یہاں چٹائی پر آ کر بیٹھ جاؤ۔ تم دونوں مجھے دُور کے مسافر اور تھکے ماندے لگتے ہو"۔ صوفیہ نے بھی اپنے گھوڑے کی باگ چھوڑ دی اور آگے بڑھ کر اسمٰعیل کے پہلو میں چٹائی پر بیٹھ گئی تھی۔ سلطان نے اسمٰعیل کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔" اب کہو جو کہنا چاہتے ہو"۔

اسمٰعیل نے مستعد ہو کر بیٹھتے ہوئے کہا۔" سلطان محترم! میں قسطنطنیہ کے عیسائی بادشاہ ارمانوس کے خلاف نالش لے کر آپ کے پاس آیا ہوں۔ پچھلے چند ہفتوں کے دوران اس نے ایک لشکر کے ساتھ مسلمانوں کے شہروں اور بستیوں پر حملہ آور ہو کر انہیں تباہ و برباد کر کے آگ لگا دی۔ میں نے اپنی آنکھوں سے مسلمانوں کے شہر منبج کی حالت دیکھی ہے۔ ظالم ارمانوس نے شہر کو لُوٹا، مسلمان مرد عورتوں کو قیدی بنا لیا اور شہر کو گرا کر ملبے میں بدل دیا۔ میرے آقا! ایسی حالت تو لوط علیہ السلام کے شہر سدوم کی بھی فرشتوں نے نہیں کی تھی جیسی بدتر حالت ارمانوس نے منبج شہر کی کر دی ہے۔ اس نے میری قوم کا دامن تار تار کر کے اور خون آلود کیا ہے۔ اس نے مسلمانوں کے گھروں کا اجالا چھینا۔ سہاگنوں کے سہاگ کو رخنہ رخنہ اور ماؤں کے دل کو پارہ پارہ کر کے رکھ دیا ہے۔ میں ابھی سیدھا قسطنطنیہ سے آ رہا ہوں۔ وہاں میں نے مسلمان قیدیوں کو خستہ تن اور آہوں کے ساتھ دُعائیں مانگتے دیکھا اور سنا ہے۔ وہاں کے عیسائی دل کھول کر ان کی تحقیر و تضحیک کرتے ہیں اور انہیں قلق اضطراب میں دیکھ کر خوش ہوتے ہیں اور بھڑکیلے گانے گاتے ہیں۔

قسطنطنیہ میں مسلمان قیدی اپنے رب کے کرم لامتناہی کے بعد آپ کی تائید و حمایت کے آرزومند اور محتاج ہیں۔ وہ بے چارے اپنی دعاؤں میں جہاں اپنے رب اور رسولؐ کو پکارتے ہیں وہاں وہ آپ کا نام لے کر بھی فریاد و شکایت کرتے ہیں۔ ان قیدیوں میں محمود بن صالح بن مرداس کلابی اور ابن حسّان طلائی جیسے معزز سردار بھی شامل

ہیں۔ میں آپ سے التماس کرتا ہوں کہ آپ ارمانوس سے اپنے مسلمان بھائیوں کو نجات دلائیے۔"

ارمانوس کے مظالم اور مسلمانوں کی بے بسی کا سن کر غصے میں سلطان الپ ارسلان کا چہرہ بھٹی کی طرح دہک اٹھا تھا۔ وہ زخمی سانپ اور طوفانی لہروں کی طرح غیض و غضب کی حالت میں پیچ و تاب کھانے لگا تھا پھر اس نے غصیلی اور شوریلی آواز میں قریب بیٹھے اپنے سپہ سالار اتسز کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "ابھی اور اسی وقت دو سرکش و توانا جوانوں کو سفیر بنا کر ارمانوس کے پاس بھیجو جو اسے جا کر میرا پیغام دیں کہ وہ مسلمان قیدیوں کو رہا کر دے اور اگر اس نے انکار کیا تو اس قضیے کا فیصلہ کرنے کی خاطر ہماری تلواریں نیام سے باہر آتے ہوئے دیر نہ لگائیں گی۔"

اتسز اٹھ کر چلا گیا۔ الپ ارسلان نے اسمٰعیل کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "اے فرزندِ مہربان! اپنے حالات مجھے تفصیل سے کہو تا کہ میں تمہارا حسب نسب جان سکوں۔"

اسمٰعیل نے اپنی ذات کے علاوہ قسطنطنیہ میں داخل ہونے۔ تاجر کو قتل کر کے مسلمان لڑکیوں کی رہائی اور شیر کے ہاتھوں اپنے ساتھی کی جان بچانے کے علاوہ صوفیہ سے ملاقات کے سارے واقعات تفصیل کے ساتھ سلطان سے کہہ دیئے تھے۔
اسمٰعیل جب خاموش ہوا تو سلطان الپ ارسلان نے فخریہ انداز میں کہا۔ "اے فرزندِ کعبہ! میں تیرے اس جوان عزم کو سلام کرتا ہوں کہ تو نے قسطنطنیہ میں شیر سے اپنے ساتھی کی جان بچائی اور کھلے میدان میں ارمانوس کے سب سے بڑے تیغ زن کو عبرتناک شکست دی۔ قسم ہے مجھے اپنے رب کی بارگاہِ عفو و بخشش کی، ارمانوس کو اپنے گناہوں کا حساب دینے کے علاوہ مسلمان قیدیوں کو رہا کرنا ہو گا۔"

سلطان الپ ارسلان چند لمحوں تک خاموش رہا پھر غور سے اسمٰعیل کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ "کیا تم دونوں ایک دوسرے کو پسند کرتے ہو۔" اسمٰعیل نے جب اثبات میں گردن ہلا دی تو سلطان نے پھر پوچھا۔ "کیا تم دونوں نے شادی کر لی ہے۔"
اسمٰعیل نے نفی میں گردن ہلا دی۔ سلطان نے قاضی ابو نصر کی طرف دیکھتے

ہوئے کہا۔ "یہاں سے روانہ ہونے سے قبل اِن دونوں کا نکاح پڑھا دیں۔ اس شادی پر جو خرچ ہوا اسے ہم اپنے ذاتی حساب میں سے دیں گے۔"

صوفیہ کی نظریں شرم سے جھک گئی تھیں۔ اسمٰعیل نے سلطان کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا "میرے آقا! ارمانوس نے اگر مسلمان قیدیوں کو رہا کرنے سے انکار کر دیا تو پھر؟"
سلطان الپ ارسلان نے کسی توقف کے بغیر کہا۔ "تو پھر میں اس کے خلاف اس وقت تک جنگ کروں گا جب تک وہ اپنے گناہوں کی تلافی کرنے کے علاوہ مسلمان قیدیوں کو باعزت رہا نہیں کر دیتا۔" اسمٰعیل نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔ "میرے آقا! میں جانتا ہوں ارمانوس قیدیوں کو رہا کرنے کے علاوہ جنگ کو ترجیح دے گا اور اس جنگ میں حصّہ لینے کے بعد ہی میں شادی کروں گا۔ میں اس وقت تک آپ کے لشکر سے کوچ نہ کروں گا جب تک ارمانوس قیدی رہا نہیں کر دیتا یا اس کے ساتھ متوقع جنگ کسی انجام کو نہیں پہنچتی۔"

الپ ارسلان نے ہاتھ بڑھا کر اسمٰعیل کے شانے پر رکھتے ہوئے کہا۔ "خداوندِ جلیل تجھے اس سے بھی زیادہ توفیق دے کہ تو مذہب و ملّت کی خدمت کر سکے۔" اس کے ساتھ ہی سلطان نے اپنے بیٹے محمد شاہ کی طرف دیکھتے ہوئے اسمٰعیل اور صوفیہ کی رہائش و آسائش کا انتظام کرنے کو کہا۔ محمد شاہ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اسمٰعیل اور صوفیہ کو اس نے اپنے ساتھ لیا اور دائیں طرف خیموں کے اندر لے گیا۔

قسطنطنیہ کا شہنشاہ ارمانوس اپنے محل کے دارالحکمت میں بیٹھا تھا۔ اس کے پیچھے اس کی ملکہ یوڈوشیا۔ دائیں طرف اسقفِ اعظم اور سامنے دو لمبی قطاروں میں اس کے جرنیل اور عمائدین بیٹھے ہوئے تھے۔ ملکہ کے پیچھے قسطنطنیہ کے سسٹوس گرجا کی پجارنیں کھڑی بادشاہ اور ملکہ دونوں کو دعائے خیر دے رہی تھیں۔ ارمانوس نے اپنے دربان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "مسلمان سفیروں کو پیش کرو۔"
دربان باہر نکل گیا۔ تھوڑی ہی دیر بعد جب وہ لوٹا تو اس کے ساتھ دو

دراز قد اور خوب گٹھے ہوئے جسم کے جوان تھے۔ وہ اپنے لباس اور حلیے سے خوب پہچانے جا سکتے تھے۔ ان میں سے ایک عرب اور دوسرا ترک تھا۔ دونوں جنگی لباس میں تھے ان کے جسم پر عمدہ قسم کے ہتھیار چمک رہے تھے اور ان کے ہاتھوں میں لوہے کے لمبے نیزے تھے۔ جب وہ دونوں جوان شاہی تخت گاہ کے سامنے سنگِ ساق کی سیڑھیوں کے پاس آکر رُکے تو ارمانوس نے بھاری اور بارعب آواز میں پوچھا۔

"تم دونوں کون ہو؟ اور کہاں سے کس کے سفیر بن کر آئے ہو؟" ان دونوں نے پہلے بلند آواز میں حاضرین کو سلام کیا لیکن کسی نے کوئی جواب نہ دیا۔

ترک نے عرب کی طرف دیکھا۔ شاید یہ اس کا اشارہ تھا کہ ارمانوس کے سوالوں کا وہ جواب دے۔ عرب سنبھلا اور ارمانوس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "اے بادشاہ! ہم آذربائیجان کی طرف سے آئے ہیں اور ہم سلطان الپ ارسلان کے سفیر ہیں۔ ہم ——" ارمانوس نے درمیان میں بولتے ہوئے کہا۔ "کیا الپ ارسلان نے تمہیں یہ نہیں سکھایا کہ بادشاہوں کو کیسے تعظیم دی جاتی ہے۔ تم ہمارے اس محل میں یوں گردنیں اکڑائے داخل ہوئے ہو گویا یہ ہمارا دربار نہیں کوئی حمام گاہ ہو۔ یہاں داخل ہوتے وقت تم دونوں کی گردنیں جھک جانی چاہئیں تھیں۔"

عرب نے زخمی تیندوے کی طرح غصّے کی حالت میں ارمانوس کی طرف دیکھا پھر اس نے اپنا نیزہ زور سے فرش پر مارتے ہوئے کہا۔ "اے بادشاہ! ہم مسلمان ہیں اور ہمارا سر اپنے رب کے سوا کسی اور کے سامنے نہیں جھکتا۔ ہم نے اندر آکر بلند آواز میں تم سب کو سلام کہہ کر امن اور سلامتی کا پیغام دیا لیکن کسی نے کوئی جواب نہ دیا۔ اگر ہمیں الپ ارسلان نے سفارت کے آداب نہیں سکھائے تو کیا قسطنطنیہ کی تہذیب یہ کہتی ہے کہ کوئی امن اور سلامتی کا پیغام دے تو اس پر خاموشی اختیار کر لی جائے۔"

ارمانوس نے برہم ہو کر کہا۔ الپ ارسلان نے تمہیں کس غرض سے ہمارے پاس بھیجا ہے۔" عرب نے اس بار نرم اور شائستہ لہجے میں کہا۔ "اے بادشاہ! تمہارے پاس قسطنطنیہ میں جو مسلمان مرد اور عورتیں قیدی ہیں انہیں رہا کر دو۔ مسلمانوں کے

جو شہر اور بستیاں تم نے اپنے گزشتہ حملوں میں ویران اور تباہ کی ہیں ان کا ہرجانہ ادا کرو۔ یہی پیغام الپ ارسلان نے ہمیں دے کر بھیجا ہے۔"

ارمانوس نے فخر و گھمنڈ میں کہا۔ "کیا خوب کہ تم مسلمان اپنی زبانوں سے تسلیم کر رہے ہو کہ ہم نے تمہارے شہروں کو ویران اور تباہ کیا۔ تمہارے یہ الفاظ ہمارے لیے خوشی اور انبساط کا باعث ہیں کہ ہم نے مسلمانوں پر ایک کاری ضرب لگائی ہے الپ ارسلان سے کہنا وہ مسلمان ہمارے قیدی ہیں اور ہم اپنے قیدیوں سے جیسا چاہیں سلوک کریں۔ مسلمانوں کی کوئی طاقت انہیں ہماری قید اور گرفت سے آزاد نہیں کرا سکتی۔"

عرب سفیر نے اس بار برہم ہو کر کہا۔ "اے بادشاہ! یہ تیری بھول ہے۔ جان رکھو! ہمارے مسلمان بھائی اور بہنیں زیادہ عرصہ تک تمہاری قید میں نہ رہیں گے عنقریب تو دیکھے گا ہم ان کی رہائی اور آزادی کا ایسا معرکہ ماریں گے جو تیرے ذہن، تیرے حواس کی ادراک سے ماورا ہو گا۔"

عرب جب خاموش ہوا تو ترک نے اپنی بھاری مگر کھولتی ہوئی آواز میں کہا۔ "اے بادشاہ! بحر الکاہل سے بحیرہ آرال سے بھی آگے اور بحیرہ ہند سے بحیرہ اسود تک پھیلی ہوئی مسلم قوم کے قیدی زبردستی اپنی قید میں رکھنا اتنا آسان نہیں۔ اس سے پہلے بھی بہت سی قوموں نے ہماری سرزمینوں کے آسمان پر سیاہ بادلوں کی طرح چھا کر ہم پر تاریکی اور جہالت مسلط کرنے کی کوشش کی لیکن میری قوم نے اپنے دامن میں خالد و مثنیٰ، قتیبہ و قاسم اور طارق و موسیٰ کے علاوہ سینکڑوں ایسے سرفروشوں کو جنم دیا جنہوں نے اپنی قوم کے آسمان پر ستاروں کی مانند چمک کر تاریکی اور جہالت کو مٹا دیا۔

"اے بادشاہ! ہمارا مطمحِ نظر جہاں بانی، جہانداری اور ملکی ہوس نہیں لیکن لٹی ہوئی انسانیت پر انصاف کے بند دروازے کھولنے کی خاطر ہم سمندروں میں گھوڑے اتار دینے کا فن بھی جانتے ہیں۔ ہمارے مسلمان قیدیوں کو رہا کر دو ورنہ ہم اپنے رب کا قہر بن کر اس سرزمین پر نازل ہوں گے۔"

ترک جب خاموش ہُوا تو ارمانوس کا ایک جرنیل بے پناہ غصّے کی حالت میں اُٹھا اور دونوں سفیروں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "تمہاری گفتگو کا انداز ایسا ہے کہ تم دونوں کو قتل کیا جانا چاہیئے"۔ اس کے ساتھ ہی جب وہ اپنی تلوار بے نیام کر کے آگے بڑھا تو ارمانوس نے اسے ہاتھ کے اشارے سے منع کرتے ہوئے کہا۔ "رک جاؤ اگر یہ دونوں سفیر نہ ہوتے تو اب تک مَیں خود ان کے سَر قلم کر چکا ہوتا"۔

عرب نے مُڑ کر اس جرنیل کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "اپنے گھر میں کسی پر تلوار سونت لینا نہایت آسان ہے۔ اپنا نام کہو تا کہ اگر ہمارے تمہارے درمیان جنگ ہو تو مَیں تمہاری شجاعت اور جوانمردی دیکھ سکوں"۔ اس رومن جرنیل نے دوبارہ اپنی نشست پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ "میرا نام پیٹروس ہے اور مَیں اپنے لشکر کے ہراول دستوں کا سالار ہوں"۔

عرب جب خاموش ہُوا تو ارمانوس نے دونوں سفیروں کو مخاطب کر کے کہا۔ "جاؤ اپنے بادشاہ کے پاس واپس لوٹ جاؤ اور اسے کہو ہم مسلمان قیدی رہا کرنے سے انکار کرتے ہیں۔ ہم اپنے لشکر کے ساتھ کل ہی یہاں سے کوچ کریں گے اور ملاذکرد کے میدانوں میں خیمہ زن ہوں گے۔ جاؤ اپنے سلطان سے جا کر کہو اگر وہ بزدل نہیں ہے تو ملاذکرد کے میدانوں میں وہ ہم سے جنگ کرنے ضرور آئے گا۔ پھر مَیں دیکھوں گا مسلمان بادشاہوں میں کون ایسا ہے جو اپنے قیدیوں کی رہائی کا سامان کرے"۔

عرب نے بڑی استقامت اور عزیمت میں کہا "انشاءاللہ ملاذکرد کا میدان ہی تمہارے لیے حشر کا میدان ثابت ہوگا"۔ اس کے ساتھ ہی عرب اور ترک واپس مڑے اور ایک وقار کے ساتھ چلتے ہوئے وہ باہر نکل گئے تھے۔

چند روز کی تیاری کے بعد ارمانوس دو لاکھ کے ایک جرار لشکر کے ساتھ قسطنطنیہ سے نکلا۔ اس کے لشکر میں رومنوں کے علاوہ یونانی، فرینک اور وحشی اور خونخوار نارمن بھی شامل تھے۔ یہ ٹڈی دل لشکر رتھوں کو بھگاتا، ڈھول، باجے اور بینڈ بجاتا ہوا شمال مشرق کی طرف بڑھا اور ملاذکرد کے میدانوں میں جا کر خیمہ زن ہُوا۔ اس کے

لشکر کے ساتھ ارمانوس کے پاس لشکر کے لیے ایک سال کی خوراک کا انتظام، ہتھیاروں کے بھاری ذخیرے اور بھیڑ بکریوں، اُونٹوں، گھوڑوں اور خچروں کے بڑے بڑے ریوڑ تھے۔ یہاں چند روز قیام کرنے کے بعد ارمانوس نے اپنے جرنیل پیٹروس کی سرکردگی میں اپنے لشکر کے ہراول دستوں کو مشرق کی طرف روانہ کیا تا کہ وہ راستے میں ہی سلطان الپ ارسلان کو شکست دے اسے بھاگ جانے پر مجبور کر دے۔ پیٹروس بڑی تیزی سے اپنے لشکر کو لے کر مشرق کی طرف بڑھا تھا۔

سفیروں نے جب واپس آ کر الپ ارسلان کو ارمانوس کا فیصلہ سنایا تو سلطان نے اپنے خیمے میں مجلسِ شوریٰ طلب کی۔ اس مجلس میں نظام الملک طوسی، قاضی ابونصر بخاری، سپہ سالار اتسز، سلطان کے دونوں بیٹے اور لشکر کے کئی دیگر جرنیل شامل تھے۔ جب سب لوگ خیمے میں جمع ہو گئے تو سلطان نے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے پوچھا "قسطنطنیہ سے آنے والا وہ خانہ بدوش کہاں ہے جس کا نام اسمٰعیل ہے۔ مَیں نے اسے جنگی مشقیں کرتے دیکھا ہے۔ اس کے علاوہ پچھلے چند روز میں وہ میرے ساتھ شکار کرنے میں بھی شامل رہا ہے۔ وہ ایک عمدہ تیغ زن، بَلا کا مستعد و ہوشیار، شجاع اور بے خطا نشانہ باز ہے۔ اس کا اس مجلس میں شامل ہونا ضروری ہے۔ مَیں اسے اپنے لشکر میں ایک اہم ذمہ داری سونپنے کا فیصلہ کر چکا ہوں"۔

سلطان نے ایک جرنیل کی طرف اشارہ کر کے کہا "اسمٰعیل کو بلایا جائے"۔ وہ جرنیل اُٹھا اور خیمے سے باہر نکل گیا۔ سلطان نے زور سے پکارتے ہوئے باہر نکلنے والے اس جرنیل سے کہا "اسمٰعیل کے ساتھ ان دونوں جوانوں کو بھی بُلا کر لاؤ جو سفیر بن کر ارمانوس کے پاس گئے تھے"۔

خیمے سے اُٹھ کر جانے والا جرنیل تھوڑی دیر تک لوٹا۔ اس کے ساتھ اسمٰعیل کے علاوہ وہ عرب اور ترک جوان بھی تھے جو سفیر بن کر ارمانوس کے پاس گئے تھے۔ جب وہ خیمے میں داخل ہو کر بیٹھ گئے تو الپ ارسلان نے خیمے میں موجود سب عمائدین اور جرنیلوں کے سامنے ارمانوس کا جواب بیان کیا۔ خیمے میں موجود

ہرفرد نے یہی مشورہ دیا کہ ارمانوس کے ساتھ سختی سے نمٹنا چاہیئے۔

الپ ارسلان سب کے جواب پر غور کرتے رہے پھر انہوں نے نظام الملک کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "اے رفیقِ مہربان! تم میرے حرم اور لشکر کی دوسری عورتوں کو لے کر آج ہی ہمدان روانہ ہو جاؤ۔ ارمانوس کا مسلمان قیدیوں کی واپسی سے انکار کرنا اب میرے لیے زندگی موت کا مسئلہ بن گیا ہے۔ میں اب اس وقت تک سکون کا دم نہ لوں گا جب تک میں ارمانوس سے اپنے مسلمان بھائیوں کو چھڑا نہیں لیتا۔

اس کے علاوہ اسے مسلمان شہروں اور بستیوں کی تباہی کا معاوضہ بھی ادا کرنا ہوگا پھر الپ ارسلان نے اپنے سپہ سالار اتسز کو مخاطب کر کے کہا۔ "میرے عزیز! آج شام کو کوچ کرنے سے پہلے اپنے لشکر کو چار حصّوں میں تقسیم کرو۔ تین حصّے بڑے اور چوتھا حصّہ چھوٹا ہو۔ تین حصّوں میں سے ایک میرے پاس، دوسرا تمہاری کمانداری میں اور تیسرا حصّہ میرے فرزند محمد شاہ ورتاج الدولہ کے تحت ہوگا۔"

پھر سلطان نے اسمٰعیل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "چوتھا اور چھوٹا حصّہ اسمٰعیل کی سرکردگی میں اپنے فرائض انجام دے گا اور یہی حصّہ ہراول لشکر کا فرض ادا کریگا آج شام کے وقت یہاں سے کوچ ہوگا اور ——"

سلطان الپ ارسلان کہتے کہتے رُک گیا کیونکہ خیمے کے دروازے پر ایک سوار نمودار ہوا جسے دیکھتے ہی سلطان کے چہرے پر کئی سوالیہ کیفیتیں بکھر گئیں۔ وہ سوار اپنے گھوڑے سے اُترا اور جب اس نے دیکھا کہ خیمے میں مجلسِ شوریٰ کا اجلاس ہو رہا تھا تو وہ باہر ہی رُک گیا۔

وہ سلطان کا ایک جاسوس تھا جسے دشمن پر نگاہ رکھنے کے لیے بھیجا گیا تھا جب وہ باہر رُک گیا تو سلطان نے اُسے پکارتے ہوئے۔ "ایاز! ایاز! اندر آجاؤ۔" وہ جوان جس کا نام ایاز لے کر پکارا گیا تھا خیمے میں داخل ہوا۔ سلطان نے بیتابی کا اظہار کرتے ہوئے پوچھا۔ "کیا تم کوئی خبر لائے ہو؟"

اس جوان نے اور آگے بڑھتے ہوئے کہا۔ "میرے آقا! دشمن کا ہراول لشکر جس کا جرنیل ایک یونانی جرنیل پیٹروس ہے ہماری طرف روانہ ہو چکا ہے ارمانوس نے اسے اس غرض سے اِدھر روانہ کیا ہے کہ وہ میدان جنگ میں پہنچنے سے پہلے ہی ہمیں شکست دے دے۔"

سلطان الپ ارسلان غصے کی حالت میں فوراً کھڑا ہو گیا اور غضب آلود آواز میں کہا۔ "میں اس اجلاس کو ختم کرتا ہوں۔ ہمارا کوچ شام کے بجائے ابھی اور اسی وقت ہوگا۔"

سلطان نے ذرا رُک کر اسمٰعیل کی طرف دیکھا پھر نرم آواز میں پوچھا۔ "اسمٰعیل! تمہارے ساتھ جو لڑکی ہے اور جس سے تم شادی کرنے والے ہو وہ لشکر کی عورتوں کے ساتھ ہمدان روانہ کرنا چاہتے ہو یا اپنے ساتھ رکھو گے۔"

اسمٰعیل نے کھڑے ہوتے ہوئے پوچھا۔ "سلطان محترم! کیا لشکر میں اس کے علاوہ اور کوئی عورت نہ ہوگی۔" سلطان نے مسکرا کر کہا۔ "ہوں گی مگر صرف وہ عورتیں جو جنگ کے دوران مرہم پٹی کے علاوہ اپنے لشکریوں کو پانی پلانے کا فرض انجام دیتی ہیں۔" اسمٰعیل نے فیصلہ کُن انداز میں کہا۔ "تو پھر وہ بھی لشکر کی ان ہی عورتوں کے ساتھ رہے گی۔"

اسمٰعیل جب خاموش ہوا تو وہ دونوں جوان جو سفیر بن کر گئے تھے اور ان میں سے جو عرب تھا وہ کھڑا ہوا اور سلطان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "میرے آقا! مجھے ہراول میں شامل ہونے کی اجازت دیجیئے۔ ارمانوس کا جرنیل پیٹروس جو اس کے ہراول کا سالار بن کر ہماری طرف بڑھ رہا ہے۔ اس نے ارمانوس کے دربار میں ہماری گفتگو سے خفا ہو کر ہم پر تلوار سونتی تھی۔ میں اسے بتانا چاہتا ہوں اپنے گھر اور میدانِ جنگ میں تلوار سونتنا کس قدر مختلف ہے۔"

سلطان کے لبوں پر خفیف سی مسکراہٹ کھیل گئی تحسین آمیز نگاہوں سے اس نے عرب کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "تمہیں اس کی اجازت ہے۔ تم ہراول کے نائب سالار ہو گے۔" عرب کے چہرے پر پُرسکون مسکراہٹ بکھر گئی تھی۔

سلطان سب اراکین کے ساتھ اپنے خیمے سے باہر آیا اور کوچ کی تیاری شروع ہو

گئی تھی۔

اسمٰعیل اپنے خیمے میں داخل ہوا۔ صوفیہ خیمے کے دروازے پر کھڑی بڑی بے چینی سے اس کا انتظار کر رہی تھی۔ جب وہ اندر آیا تو اس نے بے تابی کا اظہار کرتے ہوئے پوچھا۔ "سلطان نے آپ کو کیوں طلب کیا تھا؟" اسمٰعیل نے خوش طبعی سے کہا۔ "تم گھبرائی ہوئی کیوں ہو۔ میں کوئی مجرم تو نہ تھا کہ سزا کے لیے طلب کیا گیا تھا اور پھر یہ قسطنطنیہ نہیں جہاں ہمیں اپنی جان تک کا خطرہ ہو۔ یہ ایک مسلمان سلطان کا لشکر ہے۔ جس میں ہر ایک کی جان محفوظ اور مامون ہے۔ سلطان نے مجھے اپنے خیمے میں بلا کر اپنے ہراول لشکر کا سالار مقرر کیا ہے۔"

صوفیہ نے آگے بڑھ کر پیار سے اسمٰعیل کے دونوں ہاتھ تھامتے ہوئے کہا۔ "یہ ہمارے لیے بہت بڑا اعزاز ہے۔ اللہ پاک آپ کو توفیق دے کہ آپ سلطان کی خواہشات پر پورے اتر سکیں پھر اسمٰعیل کے ہاتھ چھوڑ کر صوفیہ نے دعا کے انداز میں ہاتھ اٹھاتے ہوئے کہا۔ "اے شرق و غرب کے خالق! جس مقصد کے تحت سلطان اپنے لشکر کے ساتھ حرکت میں آنے والے ہیں تو انہیں اس مقصد میں فوز مند و کامیاب کر۔" صوفیہ جب خاموش ہوئی تو اسمٰعیل نے پوچھا۔

"صوفیہ! تم ہمدان جانا پسند کرو گی یا میرے ساتھ لشکر میں رہنا چاہو گی سلطان کا لشکر ابھی اور اسی وقت یہاں سے ملاذ کرد کے میدانوں کی طرف کوچ کر رہا ہے۔ جہاں ارمانوس اپنے دو لاکھ کے لشکر کے ساتھ خیمہ زن ہو چکا ہے۔"

صوفیہ نے پریشان ہو کر پوچھا۔ "آپ مجھے اپنے آپ سے علیحدہ کر کے ہمدان کیوں بھیجنا چاہتے ہیں۔ وہاں میں کس کے پاس رہوں گی۔ میری خواہش ہے کہ میں جنگ کے دوران آپ کے ساتھ لشکر میں رہوں۔"

"سلطان اپنے حرم اور لشکر کی دیگر عورتوں کو ہمدان روانہ کر رہے ہیں صرف چند عورتیں لشکر میں رہ جائیں گی جو مرہم پٹی اور جنگ کے دوران پانی پلانے کی خدمات انجام دیتی ہیں۔"

صوفیہ نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔ "میں بھی ان عورتوں کے ساتھ لشکر میں شامل رہوں گی۔ ہمدان جا کر آپ کا انتظار میرے لیے جنگ کی صعوبتیں اٹھانے سے زیادہ تکلیف دہ اور پریشان کن ہو گا۔ میں آپ کے ساتھ لشکر میں شامل رہوں گی۔ جنگ میں حصہ لینے کے بعد ہم دونوں وہیں سے دریائے دولگا کی طرف روانہ ہو جائیں گے جہاں آپ کا قبیلہ پڑاؤ کر کے آپ کا انتظار کر رہا ہو گا۔"

اسمٰعیل نے خوشی اور اطمینان کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ "مجھے تمہارے فیصلے سے اتفاق ہے۔ اب تم تیاری کرو۔ لشکر یہاں سے کوچ کرتے اب زیادہ دیر نہ لگائے گا۔"

دونوں وہاں سے ہٹے اور بڑی تیزی کے ساتھ اپنا سامان سمیٹنے لگے تھے۔

نظام الملک[1] طوسی سلطان کے حرم اور لشکر کی دیگر عورتوں کو لے کر ہمدان کی طرف روانہ ہو گیا تھا۔ اس کے ساتھ مسلح جوانوں کی ایک مختصر سی جماعت تھی۔ خود سلطان نے بھی وہاں سے کوچ کیا۔ اس وقت سلطان کے پاس کل پندرہ[2] ہزار سواروں پر مشتمل ایک مختصر سا لشکر تھا۔ جب کہ مقابلے میں ارمانوس کے پاس دو لاکھ کا لشکر تھا۔ سلطان نے تعداد کی اس قلت و فراوانی کی کوئی پرواہ نہ کی اور طوفانی انداز میں وہ ملاذ کرد کے

---

[1] ۲۱ ذیقعد ۴۰۸ھ کو جمعہ کے روز طوس میں پیدا ہوا۔ نہایت قابل، عالم اور مخلص انسان تھا۔ بغداد کا مدرسہ نظامیہ اسی نے قائم کیا تھا۔ سلطان الپ ارسلان کا وزیر سلطنت تھا۔ اس کے بیٹے کے دور میں بھی اسی عہدے پر رہا۔ ایک باطنی کے ہاتھوں مارا گیا اور اصفہان میں دفن ہوا۔

[2] سلطان کے پاس لاکھوں کا لشکر تھا لیکن اس وقت وہ چونکہ چند بغاوتوں کو فرو کرتے

ویرانوں کی طرف بڑھا جہاں ارمانوس پڑاؤ کر کے اس کا انتظار کر رہا تھا۔

سلطان کا لشکر چار حصّوں میں بٹ چکا تھا۔ سب سے آگے ہراول تھا جس کا سالار اسمٰعیل اور نائب سالار وہی عرب سفیر تھا۔ اس سے پیچھے قلب خود الپ ارسلان کے اپنے پاس تھا۔ دائیں بائیں میمنہ اور میسرہ تھے جن کی کمانداری بالترتیب لشکر کا سپہ سالار اتسز اور سلطان کے دونوں فرزند محمد شاہ اور تاج الدولہ کر رہے تھے۔

سلطان کے لشکر نے ابھی آدھی مسافت ہی طے کی تھی کہ ارمانوس کا ہراول لشکر جس کی سپہ سالاری اس کا جرنیل پیٹروس کر رہا تھا اس کے لشکر کی راہ روک کر کھڑا ہوا۔ ارمانوس کے ہراول کی تعداد سلطان الپ ارسلان کے کل لشکر سے بھی کہیں زیادہ تھی۔ سلطان نے ارمانوس کے ہراول سے نمٹنے میں تاخیر نہ کی، اس نے فوراً حملے کا حکم دے دیا۔ سامنے کی طرف اسمٰعیل ہراول کے ساتھ اور الپ ارسلان قلب کے ساتھ حملہ آور ہوئے۔ لشکر کا سپہ سالار اتسز اور سلطان کے دونوں فرزند اپنے اپنے لشکروں کو پھیلا کر دائیں بائیں سے پیٹروس کے لشکر پر ٹوٹ پڑے تھے۔

دونوں طرف سے گھمسان کی جنگ شروع ہو گئی تھی۔ پیٹروس کا لشکر دائیں بائیں پھیل کر زیادہ قوت اور جارحانہ انداز کا مظاہرہ کرنے لگا تھا اور سامنے کی طرف انہوں نے صرف دفاعی جنگ کر کے سلطان اور اسمٰعیل کو روکنے کی کوشش کی تھی۔ لہٰذا اس کے لشکر کا اندرونی حصّہ خلا کی مانند کھوکھلا ہو گیا۔ اسمٰعیل چونکہ ہراول کے ساتھ حملہ آور ہونے میں آگے آگے تھا لہٰذا اس نے پیٹروس کی اس خامی سے فوراً فائدہ اٹھایا اور اپنے ہراول کے ساتھ وہ دشمن کے اندر تک گھستا چلا گیا تھا۔ اگلے حصّے میں لڑنے والے پیٹروس کے لشکریوں نے اسمٰعیل کی پشت سے حملہ کر کے اسے آگے بڑھنے سے روکنا

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۴۲۷) نکلا تھا۔ اس لیے اس کے پاس یہی پندرہ ہزار کا لشکر تھا۔ دارالحکومت وہاں سے دور تھا لہٰذا اور لشکر منگوانے کے بجائے سلطان اسی مختصر سے لشکر کے ساتھ ارمانوس کے مقابل ہو گیا۔

پایا لیکن اس کی انہیں بھاری قیمت ادا کرنا پڑی۔

سلطان الپ ارسلان اپنے پورے غضب اور قہر کے ساتھ ان پر حملہ آور ہوا تھا اور ہزاروں رومنوں کو تہ تیغ کرتا ہوا ان کے اوپر سے گزر گیا۔ اس طرح پیٹروس کے لشکر کا آگے والا حصّہ ایک لحاظ سے مکمّل طور پر مفلوج اور ناکارہ ہو کر رہ گیا تھا۔

اسمٰعیل اپنے ہراول کے ساتھ دشمن کے اندر وہاں تک گھستا چلا گیا تھا۔ جہاں پیٹروس اپنے سپاہیوں کے حلقے میں کھڑا جنگ کا نظارہ کر رہا تھا۔ عرب سفیر جس کا نام عدی بن بدر تھا اس موقع پر اپنے گھوڑے کو دوڑاتا ہوا اور راستے میں آنے والے دشمنوں سے لڑتا ہوا اسمٰعیل کے پاس آیا اور اسے مخاطب کر کے کہا۔

"اے امیر! وہ سامنے دشمن کے لشکر کا سالار پیٹروس کھڑا ہے۔ اس نے اس وقت ہم پر تلوار سونتی تھی جب میں اور میرا ایک ساتھی سفیر بن کر قسطنطنیہ گئے تھے مجھے اس پر حملہ آور ہونے کا موقع دیجیے میں اسے جتانا چاہتا ہوں کہ جنگ کرنا اس کے بس کا فعل نہیں ہے۔ اگر میں نے اس پر قابو پا لیا تو اس کی ناک میں نکیل بھی ڈالوں گا۔ پچھلی رات بڑی محنت سے میں نے اس کے لیے ایک چھوٹی سی نکیل بنائی تھی۔ مجھے امید ہے میں اس پر قابو پا لوں گا۔"

اسمٰعیل نے پیار اور شفقت سے اس کڑیل عرب کے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ "میں تمہیں اس پر حملہ آور ہونے کا پورا موقع دوں گا تم بلا جھجک اس پر حملہ آور ہونا میں اپنے جوانوں کے ساتھ چاروں طرف سے تمہاری حفاظت کروں گا۔ میں اس جذبے کی قدر کرتا ہوں جس کا تم نے اظہار کیا ہے۔ اب آؤ آگے بڑھ کر پوری قوت سے دشمن پر حملہ آور ہوں۔"

اسمٰعیل اپنے لشکر کے ساتھ طوفانی انداز میں آگے بڑھا۔ عدی بن بدر اس کے ساتھ ساتھ تھا۔ اسمٰعیل نے اپنے جوانوں کو چاروں طرف پھیلا کر پیٹروس کی حفاظت کرنے والے رومنوں کو اپنے ساتھ جنگ میں الجھا لیا تھا۔ عدی بن بدر کو آگے بڑھنے کا موقع مل گیا اور وہ خنجر کی طرح دشمن کے اندر سے گزرتا ہوا پیٹروس کے سر پر جا پہنچا۔ پیٹروس اس عرب کو جس کے کپڑے خون آلود تھے اور جس کی تلوار سے لہو ٹپک رہا تھا اپنے سامنے دیکھ

کر سر سے پاؤں تک لرز گیا۔

اس عرب نے اپنی تلوار لہراتے ہوئے غصیلی آواز میں کہا "پیٹروس! مجھے پہچان میں سلطان الپ ارسلان کا وہی سفیر ہوں جس پر ارمانوس کے سامنے تُو نے تلوار سونتی تھی۔ میں نے تجھے کہا نہ تھا کہ جنگ ہوئی تو میں تیرا سامنا کروں گا۔ میں تجھ پر حملہ آور ہوتا ہوں اگر تُو بچ سکتا ہے تو کوشش کر دیکھ"۔ عرب فوراً پیٹروس پر حملہ آور ہو گیا پیٹروس نے دو ایک بار انتہائی کوشش کر کے اپنا آپ بچایا، پھر وہ عرب کے طوفانی اور جان لیوا حملوں کو دیکھتے ہوئے پیچھے ہٹ کر بھاگنے کی کوشش کرنے لگا۔

عرب نے اسے پکارتے ہوئے طنزاً کہا "ناہنجار و بدذات! بزدلوں کی طرح مقابلے سے منہ پھیر کر بھاگتا ہے۔ اب تُو مجھ پر تلوار سونتنا کیوں بھول رہا ہے۔ دیکھ میں تجھے فرار نہ ہونے دوں گا"۔ اس کے ساتھ ہی اس عرب نے گھوڑے کی زین سے لٹکتی ہوئی اپنی کمند کھول کر پھینکی۔ پیٹروس کا سر اس میں پھنس گیا اور عرب نے اسے کھینچ کر گھوڑے سے نیچے گرا دیا۔ خود بھی وہ نیچے اتر کر پیٹروس کی طرف بھاگا۔ پہلے اسے غیر مسلح کیا پھر اس کی ناک میں نکیل ڈال دی تھی۔ اس وقت تک جنگ اپنے اختتام کو پہنچ چکی تھی۔ پیٹروس کا تقریباً سارا لشکر اس جنگ میں کٹ چکا تھا اور جو زندہ بچے وہ اپنی تلواریں پھینک کر امان طلب کرنے لگے تھے۔

عرب پیٹروس کو نکیل ڈالنے کے بعد اسے اونٹ کی طرح ہانکتا ہوا اسمٰعیل کے پاس لایا اور اپنی چھاتی تانتے ہوئے کہا۔ "یا امیر! یہ دشمن کے لشکر کا سالار پیٹروس ہے۔ میں اسے آپ کے سامنے پیش کرتا ہوں۔ اس کی ناک میں حسبِ وعدہ میں نے نکیل ڈال دی ہے"۔ جنگ اب ختم ہو چکی تھی اور مسلمان سپاہی اپنے ہتھیار صاف کرنے لگے تھے۔ اس موقع پر اسمٰعیل اور اس عرب نے پیٹروس کو الپ ارسلان کے سامنے پیش کیا۔

سلطان کو چونکہ ارمانوس کے مسلمانوں پر مظالم کرنے کا سخت صدمہ تھا لہٰذا اس نے پیٹروس کی ناک اور کان کٹوا کر اسے چند سپاہیوں کی حفاظت میں نظام الملک طوسی کے پاس عبرت کے طور پر ہمدان روانہ کر دیا۔ اس جنگ سے سلطان کو دشمن کے ڈھیروں آلاتِ حرب، اناج اور مال و اسباب ملا اور یہ سب چیزیں بھی اس نے ہمدان بھیج دیں اور اس کے بعد سلطان وہاں سے پھر آگے کی طرف کوچ کر گیا تھا۔

ایک روز سہ پہر کے بعد سلطان الپ ارسلان ملاذکرد کے میدانوں میں پہنچا اور ارمانوس کے عین سامنے خیمہ زن ہوا۔ ارمانوس کے لشکر کی تعداد اس قدر زیادہ تھی کہ اگر کوئی گھوڑے پر سوار ہو کر دیکھے تو جہاں تک نگاہ کام کرتی تھی اس کے لشکر کے خیمے ہی خیمے دکھائی دیتے تھے۔ ملاذکرد میں پہنچتے ہی سلطان الپ ارسلان نے جنگ سے بچنے اور مصالحت کرنے کی کوشش کی۔

اس مقصد کے لیے اسی عرب اور ترک کو جو پہلے سفیر بن کر گئے تھے ضروری ہدایات دے کر ارمانوس کی طرف روانہ کیا گیا۔ اصل میں سلطان الپ ارسلان چاہتا تھا۔ کہ بندگانِ خدا کی جانیں ناحق جنگ میں تلف نہ ہوں اسی لیے اس نے صلح کے لیے اپنے سفیر بھیجنے میں پہل کی تھی۔

جب اس عرب اور ترک سفیر کو ارمانوس کے سامنے پیش کیا گیا تو اس نے نہایت حقارت اور نفرت کا اظہار کرتے ہوئے پوچھا "اب جب کہ ہم جنگ کی تیاریاں مکمل کر چکے ہیں تم ہمارے پاس کیا لینے آئے ہو؟"

ترک نے بڑی نرمی سے کہا۔ "اے بادشاہ! ہمارا سلطان نہیں چاہتا کہ اس جنگ میں ناحق مارے جائیں۔ لہٰذا اس قضیئے کو بات چیت سے طے کر لیا جائے"۔ ارمانوس نے فخریہ انداز میں مسکراتے ہوئے کہا۔ "میں جانتا تھا کہ میرے لشکر کی تعداد دیکھ کر تمہارا بادشاہ مجھ سے صلح کی درخواست کرنے پر مجبور ہو جائے گا"۔

اس بار عرب نے کہا "ہم جنگ میں تعداد کی کمی بیشی کو نگاہ میں نہیں رکھتے ہم کم تعداد رکھتے ہوئے بھی بڑے بڑے جرار لشکروں کو عبرت خیز شکست دی۔ اس کا تازہ ثبوت ہمارے ہاتھوں تمہارے ہراول لشکر کی مکمل تباہی ہے"۔ ارمانوس نے سوچ میں پڑتے ہوئے کہا۔ میرے ہراول کی تعداد صرف بیس ہزار تھی، تمہارا سامنا جب میرے اس دو

لاکھ لشکر سے ہُوا تو تم لوگ واپسی کی ساری راہیں بھُول جاؤ گے۔ اپنے بادشاہ سے جاکر کہہ دو اگر وہ صلح اور ہمارے عتاب سے بچنا چاہتا ہے تو صداقتِ عہد کی ضمانت کے طور پر اپنا شہر رَے ہمارے حوالے کردے جس جگہ آکر وہ خیمہ زن ہُوا ہے وہ جگہ فوراً چھوڑ کر چلا جائے اور آئندہ مسلمان قیدیوں کی واپسی کا مطالبہ نہ کرے۔ اگر اس نے یہ شرائط مان لیں تو ہم اس کی جان بخش دیں گے بصورتِ دیگر صلح کی بات چیت اس کے دارالحکومت پہنچ کر ہوگی۔ اب تم دونوں جاسکتے ہو۔ مجھے تم سے کوئی سروکار نہیں اپنے سلطان سے جاکر میری صلح کی شرائط کہو۔ عرب اور ترک نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا پھر آنکھوں ہی آنکھوں میں کوئی فیصلہ کرکے وہ باہر نکل گئے تھے۔

سفیروں نے واپس آکر جب سلطان سے ارمانوس کی شرائط بیان کیں، تو سلطان نے جنگ کی تیاری شروع کردی۔ رات کے وقت آرام کرنے کے بجائے وہ عبادت میں مصروف ہوگیا تھا۔ سلطان الپ ارسلان جب آدھی رات تک مصلّے پر بیٹھ کر عبادت کرتا رہا تو لشکر کے قاضی ابونصر اور سپہ سالار اتسز اس کے خیمے میں آئے اور مشورہ دیا کہ صبح جنگ کی ابتدا ہوگی لہٰذا آپ تھوڑی دیر آرام کرلیں"۔

سلطان نے اپنے پیچھے کھڑے قاضی ابونصر اور سپہ سالار کی طرف دیکھا پھر اس نے ایک شوق اور لذّت میں کہا "میرا کام آج کی رات ہی ہے کل کا کام میرے مولیٰ کا ہے"۔

قاضی ابونصر خیمے سے باہر نکلتے نکلتے رُک گئے اور دوبارہ سلطان کو مخاطب کرکے کہا "کل جمعہ کا دن ہے۔ آپ اس وقت دشمن پر حملہ آور ہوں جس وقت جمعہ کی نماز پڑھی جاتی ہے۔ کیونکہ اس وقت خطیب منبروں پر خطبہ پڑھتے ہیں اور مجاہدینِ اسلام کی فتح و نصرت کی دُعائیں مانگتے ہیں وہ گھڑی ہمارے لیے قبولیت اور اجابت دُعا کی ساعت ہوگی۔ خدا ہمارا حامی و ناصر اور مددگار و معین ہوگا۔ قاضی ابونصر اور سپہ سالار اتسز باہر نکل گئے۔ سلطان الپ ارسلان پھر عبادت میں مصروف ہوگیا تھا۔

دوسرے روز جب سحر کے مُنہ سے نقاب سرک رہا تھا سلطان الپ ارسلان

نے فجر کی نماز کے بعد بڑے خضوع و خشوع سے دُعا مانگی اور جنگی لباس پہن کر وہ باہر آیا۔ اس وقت تک اس کے گھوڑے پر زین کسی جاچکی تھی۔ سلطان نے اپنے ہاتھ سے اپنے گھوڑے کی دُم کو گرہ[1] لگائی۔ اس وقت تک سپہ سالار لشکر کو خیموں کے سامنے جمع کرچکا تھا۔

دوسری طرف ارمانوس کے لشکر میں بھی ہلچل شروع ہوگئی۔ سلطان بھی لشکر میں آیا۔ سپہ سالار اتسز کے قریب آکر سلطان نے اپنے جسم سے زرہ اتار دی اور سفید لباس پہن لیا پھر اس نے بلند آواز میں اپنے لشکر کو مخاطب کرکے کہا۔ "اگر مَیں میدانِ جنگ میں مارا جاؤں تو مجھے اسی جگہ دفن کردیا جائے جہاں میری لاش گرے"۔

اس کے بعد سلطان اپنے لشکر کو مخاطب کرکے ایسی پُرسوز اور دردناک تقریر کی کہ سلطان خود بھی رو اٹھا اور پورا لشکر دھاڑیں مار مار کر رونے لگا تھا۔ تقریر کے بعد سلطان نے اعلان کیا کہ "مَیں اس وقت بادشاہ نہیں ہوں۔ مَیں نے اپنے رب کی خوشنودی کے لیے جنگ کا فیصلہ کرلیا ہے لہٰذا جو شخص واپس جانا چاہے جاسکتا ہے اس سے کوئی باز پُرس نہ ہوگی"۔ اہلِ لشکر نے بیک زبان اپنے آخری دم تک سلطان کے ساتھ جنگ میں حصّہ لینے کا عہد کیا۔

اب دھوپ کافی چڑھ آئی تھی۔ سلطان الپ ارسلان اپنے لشکر کے سپہ سالار اتسز کے ساتھ مل کر اپنی صفیں درست کرنے لگا تھا۔ سورج اب کافی چڑھ آیا تھا۔ دوسری طرف ارمانوس کے لشکر میں ابھی ہلچل جاری تھی اور جنگ کے لیے صفیں درست نہ ہوئی تھیں۔ ارمانوس نے دوپہر کے قریب جاکر اپنے لشکر کو آراستہ کیا سلطان الپ ارسلان نے اپنے قریب کھڑے اتسز کو مخاطب کرکے کہا۔

"کسی نامور اور ماہر تیغ زن کو انفرادی جنگ کے لیے نکالو۔ مَیں چاہتا ہوں

---

[1] ترکوں میں گھوڑے کی دُم کو گرہ لگانے کا پُرانا رواج تھا جس کا مطلب یہ تھا کہ میدانِ جنگ میں یا تو فتح حاصل کرکے رہوں گا یا اپنی جان دے دوں گا۔

تھوڑا وقت اور گزر جائے تاکہ میں اس وقت دشمن پر حملہ آور ہوں جب مسجدوں میں جمعہ کی نماز کے بعد دعائیں مانگی جاتی ہیں۔ وہ وقت ہمارے لیے مبارک اور سعد ہوگا۔"

اتسز جب اپنے گھوڑے کو ایڑ لگا کر پیچھے ہٹنے لگا تو سلطان نے چونکتے ہوئے کہا۔ "ٹھہرو اتسز ٹھہرو! مجھے یاد آیا۔ اسمٰعیل کو بلاؤ۔ اس خانہ بدوش سے بڑھ کر انفرادی جنگ کا ماہر کوئی نہ ہوگا۔ وہ ان رومنوں کے طریقہ جنگ سے واقف ہے اور ان سے نمٹنا خوب جانتا ہے۔"

اتسز کے اشارے پر ایک سپاہی اسمٰعیل کو بلانے چلا گیا تھا۔ تھوڑی ہی دیر بعد اسمٰعیل اپنا گھوڑا دوڑاتا ہوا آیا اور الپ ارسلان کے سامنے رکتے ہوئے کہا۔

"سلطانِ محترم! آپ نے مجھے طلب کیا ہے۔" الپ ارسلان نے اپنے گھوڑے کو آگے بڑھا کر اسمٰعیل کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ "کیا تم انفرادی جنگ کی ابتدا کر سکتے ہو؟" اسمٰعیل نے اپنے سر کو تعظیماً جھکاتے ہوئے کہا۔ "سلطانِ محترم آپ نے صرف مجھے انفرادی جنگ کرنے کا حکم دیا ہوتا۔ خدا کی قسم ابھی تک میں میدان کے وسط میں کھڑا دشمن کو للکار رہا ہوتا۔ آپ کو مجھ سے میرا عندیہ لینے کی ضرورت نہ تھی۔

الپ ارسلان نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "تمہاری گفتگو قابلِ تحسین ہے۔ اب تم میدان میں اترو، مقابلے کو ذرا طول دینے کی کوشش کرنا۔ اگر ایک رومن کو زیر کر لو تو کسی اور کو مقابلے کے لیے للکارنا۔ اگر تم تھکاوٹ محسوس کرنے لگو، تو لوٹ آنا، تمہاری جگہ کسی اور کو میدان میں اتارا جائے گا۔ میں دشمن کے ساتھ اس وقت عام جنگ کی ابتدا کرنا چاہتا ہوں جب جمعہ کی نماز کا وقت ہو چکا ہو۔"

اسمٰعیل نے اپنے گھوڑے کو ایڑ لگاتے ہوئے کہا۔ "میں میدان میں اترتا ہوں۔ آپ بے فکر رہیے۔ سورج پہلے ہی عین سر پر آ چکا ہے۔ اب اس کے ڈھلنے میں تھوڑی ہی دیر ہے۔ اس وقت تک میں دشمن کو اپنے ساتھ مصروفِ پیکار رکھوں گا۔" اپنے گھوڑے کو بھگاتا ہوا اسمٰعیل میدان میں اتر گیا تھا۔ لشکر کے پیچھے خیموں کے قریب لشکر کی دوسری عورتوں میں صوفیہ کھڑی اسے تعجب اور شوق سے دیکھ رہی تھی۔

میدان کے وسط میں آ کر اسمٰعیل نے اپنے گھوڑے کو روکا اور دشمن کے لشکر کی طرف دیکھتے ہوئے اس نے اپنی تلوار اور ڈھال فضا میں بلند کرتے ہوئے مقابلے کے لیے پکارا۔ اس موقع پر اسمٰعیل نے اپنے چہرے پر اپنے خود کا نقاب ڈال لیا تھا۔ یہ اس نے اس احتیاط کے تحت کیا تھا کہ وہ قسطنطنیہ کے ہپوڈروم کے خونی میدان میں تیغ زن کلاڈیوس کو شکست دے چکا تھا لہٰذا قسطنطنیہ کے اکثر لوگ اسے پہچانتے تھے۔ اسے خدشہ تھا کہ کہیں میدان میں مقابلے کے لیے اترنے والا اس سے لڑے بغیر ہی خوفزدہ ہو کر واپس نہ چلا جائے۔

تھوڑی دیر بعد لوہے میں غرق ایک رومن اپنے گھوڑے کو دوڑاتا ہوا میدان میں اترا۔ اسمٰعیل کے سامنے آ کر اس رومن نے اپنی تلوار لہراتے ہوئے اسمٰعیل سے کہا۔ "اپنے چہرے سے اپنے خود کا نقاب ہٹاؤ تاکہ میں دیکھ سکوں میرے مقابلے پر آنے والا جوان کیسا ہے۔" اسمٰعیل کے چہرے پر سمندر کی لازوال مسکراہٹ بکھر گئی اور اپنے گھوڑے کو چند قدم آگے بڑھا کر اس نے کہا۔

"میرا چہرہ خود کے اندر ہی رہنے دو۔ اسی میں تمہاری بہتری اور بھلائی ہے۔ تم آگے بڑھ کر مجھ پر وار کرنے کی پہل کرو۔ میرے جوابی حملے سے تم میرا نام پتہ میرا شجرہ و ذات سب جان جاؤ گے۔ آگے بڑھ کر جنگ کی ابتدا کرو۔ میں تمہیں پہلے وار کرنے کا موقع دیتا ہوں۔"

رومن نے اپنے گھوڑے کو ایڑ لگائی اور اپنی تلوار لہراتا ہوا وہ اسمٰعیل پر حملہ آور ہوا تھا۔ اسمٰعیل نے بڑی آسانی کے ساتھ اپنی ڈھال پر اس کا حملہ روک دیا تھا پھر اس نے اپنے گھوڑے کو ایڑ لگائی اور اسے رومن کے اردگرد گول چکر میں دوڑانے لگا تھا۔ شاید وہ وقت گزارنے کی خاطر ایسا کرنے لگا تھا۔ تھوڑی دیر تک وہ اسی طرح اپنے گھوڑے کو دوڑاتا رہا اور رومن پریشانی کے عالم میں اپنے گھوڑے پر سوار اسے دیکھتا رہا۔ پھر اس نے اپنے گھوڑے کو ایسے

انداز میں رومن کی طرف موڑا گویا وہ کسی غیر فانی عمل کی ابتدا کر کے عتابِ جہنم کی طرح اس پر نازل ہوگا۔

قریب آکر اسمٰعیل نے حملہ آور ہوتے ہوئے چلّا کر کہا "سنبھل اے دشمنِ ایمان! مَیں تیرے روزِ بد کی ابتدا کرتا ہوں"۔ اسمٰعیل دستِ قضا اور تیغِ فساں بن کر حملہ آور ہُوا۔ اس رومن نے بچنے کی لاکھ کوشش کی پر اسمٰعیل اس کا شانہ زخمی کرتا ہوا آگے نکل گیا تھا اور دوبارہ وہ اپنے گھوڑے کو اس رومن کے گرد دوڑانے لگا تھا۔ زخمی ہونے کے بعد رومن اب اسمٰعیل سے خوفزدہ دکھائی دینے لگا تھا۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ چہرہ چھپا کر اس کے ساتھ جنگ کرنے والا کوئی معمولی تیغ زن نہیں ہے۔

وقت گذارنے کی خاطر تھوڑی دیر تک اسمٰعیل پھر اپنا گھوڑا دوڑاتا ہوا عجیب قسم کی وحشت ناک آوازیں نکالتا رہا۔ ان آوازوں نے رومن پر اور زیادہ وحشت طاری کر دی تھی۔ اس رومن کی طرف بڑھتے ہوئے اسمٰعیل نے پھر چلّا کر کہا "اے سیاہ رو انسان! مَیں تجھے شور و نوحہ کا شکار کر دوں گا"۔

اس بار اسمٰعیل اس رومن سوار کے سامنے جم کر لڑنے لگا تھا۔ وہ بار بار اپنے گھوڑے کی باگیں کھینچ کر اسے مہمیز لگاتا اور گھوڑا بار بار پینترے بدل کر اسے نئے انداز میں حملہ آور ہونے کے مواقع فراہم کرتا رہا تھا۔

اچانک اسمٰعیل نے رومن کے سر کا نشانہ لیتے ہوئے اپنی تلوار فضا میں بلند کی۔ رومن جب اپنے دفاع کے لیے اپنی ڈھال اپنے سر کے اُوپر لے گیا تو اسمٰعیل نے اپنے پوری قوت سے اپنی آہنی ڈھال رومن کے شانے پر دے ماری۔ رومن لڑکھڑا کر اپنے گھوڑے سے نیچے گر گیا۔ اس کا شانہ زخمی ہو گیا تھا اور وہ چند بار سسکنے کے بعد دوبارہ کھڑا ہو کر مقابلے کے لیے تیار ہو گیا تھا۔ اسمٰعیل بھی اپنے گھوڑے سے کود کر اس کے سامنے آکھڑا ہُوا تھا۔ مقابلے کو طول دینے کی خاطر اسمٰعیل نے اس رومن کے قریب جا کر اپنی تلوار لہراتے

ہوئے پوچھا "اے کفر آشنا! اے آلودہ معصیت! تُو کون ہے اور میرے ہاتھوں ذبح ہونے تو کیوں میدان میں اتر آیا ہے"۔ اس رومن نے کوئی جواب دینے کے بجائے اسمٰعیل پر حملہ کر دیا۔ نہایت پھرتی سے اسمٰعیل نے اس کی چمکتی بھاری تلوار کو اپنی ڈھال پر لیا اور جوابی حملہ کر دیا۔

رومن جو ابھی جارحانہ انداز اپنائے ہوئے تھا پوری طرح اسمٰعیل کے حملے کا دفاع نہ کر سکا تھا اور اسمٰعیل کی چمکتی تلوار اسے دو حصّوں میں بانٹتی چلی گئی تھی۔ رومن زین پر گر کر دم توڑ گیا تھا۔ اس کے بعد اسمٰعیل نے اپنی تلوار فضا میں بلند کر کے پھر مقابلے کے لیے للکارا۔ ایک اور رومن میدان میں اُترا۔

وقت گزارنے کی خاطر اسمٰعیل اسے بھی چکمے دے کر مقابلے کو طول دیتا رہا۔ آخر وہ بھی اس کی تلوار کا شکار ہو گیا اور اب سورج بھی ڈھل گیا تھا۔

اسمٰعیل جب واپس لشکر میں آیا اور اپنے ہراول کے سامنے اپنے گھوڑے کو روک پانی پینے کے لیے جب اس نے زین سے بندھی ہوئی چھاگل کھولنا چاہی تو ایک طرف سے حسین صوفیہ بھاگتی ہوئی آئی اس کے ہاتھ میں بھی ایک چھاگل تھی۔ اسمٰعیل کے قریب آکر اس بُتِ نوخیز نے مسکراتے ہوئے اپنی طلسمی آواز میں اسمٰعیل سے کہا۔

"مَیں آپ کو اس فتح پر مبارک دیتی ہوں۔ آپ کو پیاس لگی ہوگی مَیں آپ کے لیے انار کا رس لائی ہوں"۔

صوفیہ کی طرف دیکھتے ہوئے اسمٰعیل بھی مسکرا دیا تھا۔ پھر اس کے ہاتھوں سے اس نے انار کے رس کا مشکیزہ لیا اور دو ہی سانسوں میں سارا پی گیا۔ خالی مشکیزہ اس نے صوفیہ کو تھماتے ہوئے کہا "اب تم فوراً لشکر کے پیچھے چلی جاؤ۔ جنگ شروع ہونے والی ہے۔ دیکھو دشمن کے لشکر میں بینڈ اور باجے بج رہے ہیں"۔

اسی وقت سلطان کے لشکر میں بھی جنگ کے طبل اور نقارے بجنے لگے تھے۔

خالی مشکیزہ ہاتھ میں لیے صوفیہ کسی آہوئے حرم کی طرح بے فکری کے عالم میں بھاگتی ہوئی اپنے لشکر کے پیچھے چلی گئی تھی۔ دونوں لشکر اب جنگ کی ابتدا کرنے کے لیے آہستہ آہستہ آگے بڑھنے لگے تھے۔

قریب آکر دونوں لشکر ایک دوسرے پر ٹوٹ پڑے تھے۔ جنگ کی ابتدا کرتے ہوئے مسلمانوں نے ایک ساتھ یک زبان ہو کر تین بار اللہ اکبر کی صدائیں بلند کیں۔ اس کے بعد وہ عتاب جہنم بن کر رومنوں پر ٹوٹ پڑے تھے۔

سامنے کی طرف سے خود سلطان نے لشکر کے قلب اور اسمٰعیل کے ہراول کے ساتھ دشمن کو روکا تھا۔ سلطان الپ ارسلان کے دونوں بیٹے اور سپہ سالار اتسز دائیں بائیں پھیل کر اطراف سے ارمانوس کے لشکر پر ٹوٹ پڑے تھے۔ میدان میں ہر سو شور و نوحہ بلند ہونے لگا تھا۔

ارمانوس اپنے لشکر کی عددی فوقیت کو مدِ نظر رکھتے ہوئے پوری طرح مطمئن تھا۔ کہ اس کا دو لاکھ کا لشکر صرف پندرہ ہزار مسلمان سواروں کو چند ہی لمحوں میں روند کر میدان اپنے ہاتھ میں لے لے گا لیکن مسلمان جنگجو جب اپنے دامنوں میں قیامت لیے برق و بار کا طوفان بن کر کن فیکون کے معجزات کا ظہور کرنے لگے، تو ارمانوس کو اپنی ساری امیدیں دھند کی طرح بکھرتی نظر آنے لگی تھیں۔ خود سلطان الپ ارسلان تکبیریں بلند کرتا ہوا دشمن کے اندر گھس کر جنگ کر رہا تھا۔

اچانک ارمانوس کے میمنہ میں پسپائی کے آثار نمودار ہوئے۔ اس طرف سلطان کے دونوں فرزند جنگ کر رہے تھے۔ انہوں نے جب دیکھا کہ دشمن پیچھے ہٹ کر سنبھلنے کی کوشش کر رہا ہے تو انہوں نے اپنے حملوں میں اور تیزی پیدا کر دی تھی اس کا خاطر خواہ نتیجہ نکلا اور ارمانوس کا میمنہ بری طرح پسپا ہونے لگا۔

سلطان کے لشکر نے جب یہ دیکھا کہ ارمانوس کے لشکر کا ایک حصہ پسپا ہونے شروع

ہو گیا ہے تو وہ اپنی پوری قوت صرف کر کے وقت اور تقدیر کو اپنی دسترس میں لینے کی کوشش کرنے لگے تھے۔ تھوڑی دیر بعد ارمانوس کا لشکر میسرہ پر بھی پسپا ہونے لگا اور مسلمان اللہ اکبر اور لاالٰہ کے نعرے بلند کرتے ہوئے ہولناک رات کی طرح ارمانوس کے لشکر پر چھانے لگے تھے۔

اب چاروں طرف سے دشمن کا قتل عام شروع ہو گیا تھا۔ صرف پندرہ ہزار سوار الپ ارسلان کی سرکردگی میں دو لاکھ دشمنوں پر یوں حاوی ہوتے دکھائی دے رہے تھے گویا ان کے پیچھے پس پردہ کوئی سحر کام کر رہا ہو۔

عصر کے قریب ارمانوس مکمل شکست کا سامنا کر رہا تھا اور اس کے لشکری یوں میدان جنگ سے بھاگنے کی کوشش کرنے لگے تھے جس طرح بھوکا اونٹ اپنے پالان اور کجاوے سے اپنے ساربان کو گرا کر کھیتوں کی طرف بھاگ کھڑا ہوتا ہے لیکن اب ان کے لیے بھاگنا بھی مشکل تھا۔ الپ ارسلان کے میمنہ اور میسرہ پھیل کر دشمن کی پشت تک چلے گئے تھے اور ارمانوس کے لشکر کا چاروں طرف سے قتل عام شروع ہو گیا تھا۔

شام سے پہلے ہی ارمانوس کو فاش شکست ہوئی۔ اس کے لشکر کا بڑا حصہ میدان جنگ میں کٹ کر ڈھیر ہو گیا اور جو بچے ان میں سے اکثر قسطنطنیہ کی طرف بھاگ نکلنے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ ارمانوس ان پادریوں کے ہمراہ گرفتار ہوا جو جنگ میں اپنے سپاہیوں کو اکسانے کا کام انجام دیتے تھے۔

اس جنگ میں الپ ارسلان کو خوراک کے وسیع ذخائر کے علاوہ ہتھیاروں کے ڈھیر، ہزاروں جانوروں پر مشتمل ریوڑ اور نقدی کے ان گنت تھیلے ہاتھ لگے تھے۔

ارمانوس کو جب الپ ارسلان کے سامنے پیش کیا گیا تو الپ ارسلان اس کے ساتھ نہایت مہربانی سے پیش آیا اور اسے اپنے برابر بیٹھنے کو جگہ دی۔ پہلے الپ ارسلان نے ارمانوس کو اس کی جنگی غلطیوں سے آگاہ کیا پھر اس سے پوچھا "تم مجھ سے کیسے سلوک

کی توقع رکھتے ہو؟"

ارمانوس نے کہا۔ "اگر سلطان ظالم ہے تو مجھے موت کی سزا دے گا۔ اگر وہ فخر و غرور اور نمود و نام کا پیکر ہے تو مجھے ساتھ لیے لیے پھرتا رہے گا۔ اگر اس کی نظر اپنے مفاد پر ہے تو مجھ سے فدیہ لے کر آزاد کر دے گا۔"

سلطان نے پھر پوچھا۔ "اگر تم کامیاب ہو جاتے تو مجھ سے کیا سلوک کرتے؟"

ارمانوس نے کہا۔ "اگر میں کامیاب ہو جاتا تو سلطان کے جسم پر نازیانے برساتا۔"

سلطان کے چہرے پر خفگی کی کوئی علامت ظاہر نہ ہوئی بلکہ اس نے مسکراتے ہوئے فراخدلی سے کہا۔ "مسیحی قانون میں تو دشمن سے بھی عفو و محبت کی تاکید کی گئی ہے پھر تم کیسے بے دین ہو۔ پر تم فکر مند نہ ہو، میں تمہارے ساتھ تم جیسا ابلیسانہ سلوک نہ کروں گا۔ میں تاوان اور خراج کے عوض تمہاری جان بخشی کرتا ہوں۔"

اس خیمے میں الپ ارسلان اور ارمانوس کے درمیان ایک معاہدہ طے پایا جس کے تحت فیصلہ ہوا کہ ارمانوس مسلمان اسیروں کو رہا کرنے کے علاوہ دس لاکھ دینار سرخ تاوان ادا کرے گا اور تین لاکھ دینار سرخ الپ ارسلان کو سالانہ خراج ادا کرتا رہے گا۔

ارمانوس سے معاہدہ طے کرنے کے بعد سلطان نے اسمٰعیل، قاضی ابو نصر، صوفیا اور اپنے سپہ سالار اتسز کو اپنے خیمے میں طلب کیا۔ جب وہ چاروں سلطان کے خیمے میں آئے تو سلطان نے اسمٰعیل سے کہا۔

"اے مہربان خانہ بدوش! اس جنگ میں تمہاری کارکردگی کو میں نے پسند کیا ہے میں تمہیں مستقل طور پر اپنے ہراول لشکر کا سالار مقرر کرتا ہوں۔"

اسمٰعیل نے مؤدب ہو کر کہا۔ "میرے آقا! آپ کی راہنمائی میں دشمن کے خلاف جنگ کرنا میرے لیے ایک سعادت سے کم نہ ہوگا۔ میں اس عہدے کو صدق دل سے قبول کرتا ہوں لیکن سب سے پہلے مجھے اپنے قبیلے میں واپس جانا ہوگا۔ میرا چچا جو قبیلے کا سردار

بھی ہے دریائے وولگا کے کنارے کسی بلند چٹان پر کھڑا ہو کر ہر روز میری راہ دیکھتا ہوگا۔ وہ میرے متعلق پریشان اور فکر مند ہوگا۔"

الپ ارسلان نے پدرانہ شفقت میں کہا۔ "میں نے تمہارے ساتھ صوفیا کو اس لیے طلب کیا ہے کہ میری موجودگی میں تم دونوں کا آج نکاح ہو جائے اس کے بعد تم اپنے قبیلے کی طرف روانہ ہو جاؤ۔ وہاں چند روز قیام کے بعد تم سیدھے میرے پاس ہمدان چلے آنا۔ صوفیا کو بھی اپنے ساتھ لیتے آنا۔"

اسمٰعیل نے اطمینان کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ "مجھے منظور ہے۔"

سلطان کے کہنے پر ابو نصر نے اسمٰعیل اور صوفیا کا نکاح پڑھا دیا اور وہ دونوں میاں بیوی کی حیثیت سے ایک شب سلطان کے لشکر میں گزار کر اپنی منزل کی طرف روانہ ہو گئے تھے۔

سلطان نے آٹھ روز تک اس میدان میں قیام کیا۔ جب ارمانوس نے مسلمان قیدیوں کو رہا کر دیا اور تاوان کے علاوہ خراج کی رقم ادا کی تو سلطان نے ارمانوس کو اس کے پادریوں سمیت رہا کر دیا اور مسلمان اسیروں کو دوبارہ آباد کرنے کے بعد وہ ہمدان کی طرف روانہ ہو گیا تھا۔

اسمٰعیل اور صوفیا ملاذکرد کے میدانوں سے نکل کر دو روز تک شمال مشرق کے رخ پر سفر کرتے رہے پھر انہوں نے اپنا رخ شمال کی طرف بدلا۔

برف سے ڈھکے ہوئے کوہستان قفقار کو عبور کرنے کے بعد وہ بحیرہ خزر کے مغربی کنارے کے ساتھ ساتھ اوپر کی طرف بڑھتے رہے۔

ایک شب آرام کی خاطر انہوں نے اس بستی میں بسر کی جس کے قریب دریائے وولگا بحیرہ خزر میں گرتا ہے۔ دوسرے روز وہ دونوں میاں بیوی دریائے وولگا کے کنارے اپنے گھوڑوں کو سرپٹ دوڑاتے ہوئے اس طرف بڑھ رہے تھے۔

جہاں دریائے ڈان دریائے وولگا کی طرف ایک طویل خم کھاتا ہے اور جہاں ان کا خانہ بدوش قبیلہ ان کے انتظار میں خیمہ زن تھا۔

ختم شد

اسلم راہی ایم۔اے
معرفت ماسٹر عبدالحق ملک (مرحوم)
محلہ غریب پورہ
گجرات

★

تکمیل کتابت: ۴ محرم الحرام ۱۴۰۳ھ ۲۲ اکتوبر ۱۹۸۲ء جمعۃ المبارک